WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
حکایت
پاک چین دوستی کا سنہرا دور!
مئی 2015ء
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

نورِ مبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیشک خدا زبردست (اور) بدلہ لینے والا ہے (۴۷) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے) اور سب لوگ خدائے یگانہ و زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے (۴۸) اور اس دن تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں (۴۹) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی (۵۰) یہ اس لیے کہ خدا ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ بیشک خدا جلد حساب لینے والا ہے (۵۱)

سورہ ابراھیم

ماہنامہ حکایت لاہور

جلد 44 | مئی 2015ء | شمارہ 09

بانی
عنایت اللہ رحمہ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
منتظم: سعد شاہد

سرکولیشن منیجر
فضل رزاق
عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

کمپوزنگ
مجید
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مجلس مشاورت
ابدال بیلا — عظمت فاروق
میم الف — ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نغمہ علی — ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4547677

قیمت -/90 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے:
monthiyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اب یہ بوجھ حکمران طبقہ خود اٹھائے!

جمہوریت کے موجد یا بانی نے اسے عوام کی حکومت کہا تھا مگر ہمارے وطن میں آ کر جمہوریت نے عوام کو بدترین حکومت میں جکڑ لیا۔ "عوام کی اس حکومت" میں پہلے عوام سے ووٹ اور بعد میں ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں اور بدلے میں سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں جمہوریت ایک لیبل ہے، عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ اقتدار کا کھیل ہے۔ یہاں الیکشن ہوتے نہیں بلکہ لڑے جاتے ہیں اور اس جمہوری لڑائی میں شکست ہمیشہ عوام کی ہوتی ہے اور پھر جب تک جیتنے والی حکومت برسرِ اقتدار رہتی ہے وہ عوام کو مفتوح قوم سمجھ کر ان سے ٹیکسوں اور مہنگائی کی صورت تاوان وصول کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اقتدار کا عرصہ شیطان کی آنت بن جائے اور ان کا جنازہ کرسی پر ہی اٹھایا جائے۔

اس وقت پاکستان کی آبادی تین حصوں میں بٹ چکی ہے۔ اوّل میں جاگیردار، وڈیرے، بڑے زمیندار، افسر شاہی، سیاسی لیڈر اور سمگلر شامل ہیں۔ دوسرے طبقے میں رشوت خور سرکاری اہلکار، جعل ساز، غبن اور گھپلے کرنے والے اور ڈاکو شامل ہیں، تیسرا طبقہ عوام کا ہے جو اکثریت میں ہے۔

پہلے دونوں طبقے تیسرے طبقے کے خون پسینے پر زندہ ہیں اور کسی شاہی خاندان جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تیسرے طبقے کو اس طرح کھا رہے ہیں جس طرح گدھ مردار کھاتے ہیں۔ پہلا طبقہ اپنی عیش و عشرت کے اخراجات غیر ملکی قرضوں، بینکوں سے لئے قرضوں (جو بعد میں ہڑپ یا معاف کرا لئے جاتے ہیں) اور قومی خزانے سے پورے کرتا ہے اور ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے اور سرکاری مشینری کو رواں رکھنے کے لئے ٹیکسوں اور مہنگائی میں اضافہ کر کے تیسرے طبقے کی رگوں سے خون نچوڑ لیتا ہے۔

ٹیکس جتنے مرضی بڑھیں، ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں جتنی بھی بڑھیں، روپے کی قیمت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے، اس کا پہلے طبقے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی طبقہ تیسرے طبقے کے لئے بڑی بے دردی اور بے حسی سے ٹیکس نافذ کرتا ہے اور اسے ذرا بھی خوفِ خدا نہیں ہے۔

ٹیکسوں اور مہنگائی کے اثرات سے دوسرا طبقہ بھی محفوظ رہتا ہے۔ یہ رشوت خور، جعل ساز، گھپلے اور غبن کرنے والا طبقہ اپنی وارداتوں میں اضافہ کر دیتا ہے اور رشوت کا ریٹ چڑھا دیتا ہے...... لُٹ رہا ہے تو تیسرا طبقہ۔ ان دونوں طبقوں کی عیش موج اور اللوں تللوں کے اخراجات تیسرا طبقہ ادا کرتا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ تیسرے طبقے کی شہ رگ پر چھری رکھ کر اس سے جگا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔

خدارا عوام کی وہ خطا تو بتا دیں جس کی انہیں اتنی سخت سزا دی جا رہی ہے؟ کیوں ان کے بچوں سے اچھی غذا، اچھی تعلیم، علاج معالجہ، پیٹ بھر روٹی، تن ڈھانکنے کو لباس اور ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی گئی ہے؟

یہ مئی کا مہینہ ہے اور جون میں بجٹ اور رمضان اکٹھے آ رہے ہیں۔ رمضان برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہے مگر ہمارا تاجر اور پرچون فروش طبقہ، پھل فروش، سبزی فروش اسے عوام کے لئے مشکلات اور لوٹ کھسوٹ کا مہینہ بنا دیتے ہیں۔ انہیں ذرا بھی خدا کا خوف نہیں۔

دوسری طرف بجٹ جیسے اہم ترین اور انتہائی نازک معاملے کو کھیل تماشہ سمجھ کر عوام کے ساتھ ہندسوں کا مداری پن کیا جاتا ہے اور حکمرانوں اور ان کے حواریوں کی بداعمالیوں، لوٹ کھسوٹ، کرپشن اور عیش و عشرت کا سارا بوجھ عوام پر ڈال دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بجٹ کا بوجھ عوام پر نہیں پڑے گا۔

وزیراعظم نواز شریف اور وزیر خزانہ سے ہماری گزارش ہے کہ ملک کو اقتصادی بدحالی تک عوام نے نہیں پہنچایا اور نہ عوام نے غیر ملکی قرضے ہڑپ کیے ہیں، یہ تو ایک دوسرے کے بعد ملک پر راج کرنے والے حکمرانوں کی شہنشاہیت کے نتائج ہیں کہ ملک اربوں کھربوں کے قرضوں کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے اور تعمیر و ترقی اور خوشحالی کی بجائے ہم معاشی بدحالی کی کھائی میں جا گرے ہیں۔

محترم وزیراعظم صاحب! عوام کی کمر ٹوٹ چکی ہے، اب یہ بوجھ حکمران طبقہ خود اٹھائے جس میں وزراء اور سینیٹ و اسمبلیوں کے ممبران شامل ہیں۔ جاگیردار، وڈیرے، صنعت کار، دولت تو ساری اس ٹولے کے پاس ہے، ان سے بھی کچھ وصول کریں جو قرضوں کی رقمیں بیرونی ممالک کے بینکوں میں جمع کراتے رہے ہیں۔ کرپشن اور لوٹ کھسوٹ روکیں اور مظلوم عوام کی آہوں اور فریادوں سے بچیں!

صالحہ شاہد بنت عنایت اللہ

خصوصی فیچر

پاک چین تعلقات کا سنہرا دور

- پاک چین 50 سالہ دوستی کی تجدید۔
- امریکہ بھارت کو خطے کا تھانیدار بنانا چاہتا ہے۔
- اوباما کا دورہ بھارت اور چینی صدر کی پاکستان آمد۔
- گوادر خوشحالی کے راستے کھول دے گی؟
- اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

☆ افضال مظہر انجم

پاکستان عرصہ دراز سے امریکی بلاک کا حصہ رہا ہے۔ گزشتہ 70 سال سے امریکی بالادستی کے زیر اثر یا اپنی دفاعی، سائنسی اور ٹیکنالوجی کے حصول کی مجبوری نے ایسا کرنے پر مجبور کیے رکھا۔ امریکہ کے مقابل دوسری طاقت روس کا شروع سے ہی رجحان خطے کے دوسرے اہم ملک انڈیا کی طرف تھا۔ اس لیے پاکستان نے تیسری ابھرنے والی طاقت چین کے ساتھ شروع سے ہی گہرے روابط قائم رکھے۔ پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کے عرصہ 50 سال سے چین کے ساتھ دفاعی، معاشی اور تجارتی روابط قائم ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں مضبوطی آتی چلی گئی۔ امریکہ عرصہ دراز سے اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے اس نے چین کی

برتری کم کرنے کے لئے خطہ میں بھارت کو بھی ایک بڑی یا نئی سپر پاور کے طور پر کھڑا کرنے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا۔

اوباما کا بھارت اہم ترین دورہ

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد امریکن گریٹ گیم کا 13 سالہ پہلا فیز مکمل ہو چکا تھا۔ امریکی فوجوں کے جانے کے بعد اب متبادل کے طور پر بھارت کو خطے کی تھانیداری کے لئے اہم ذمہ داری سونپنے اصل میں چین کے مقابل کھڑا کرنے کی کوشش تو امریکہ عرصہ دراز سے جاری رکھے ہوئے تھا لیکن افغان جنگ کے اختتام پر کھل کر اس کا عملی مظاہرہ کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ اسی لئے چند ماہ پیشتر امریکی صدر نے بھارت کا تاریخی دورہ کیا کیونکہ اس دورہ کے دوران بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کے ساتھ دفاعی، تجارتی، سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی کے تاریخی پیکج کا اعلان کیا گیا۔ ساتھ ہی اسرائیل نے بھی بھارت سے 13 ارب ڈالر کے اسلحہ کی خریداری کا معاہدہ کیا۔ بھارت کو اسلحہ کی فراوانی کا صاف مطلب ہے کہ اسے چین کے مقابل کھڑا کرنے کا اہتمام تو کیا جا رہا ہے ساتھ ہی پاکستان جیسے چھوٹے ملک کے مقابل اسلحہ کا پیکج انتہائی خطرناک تھا جسے ازل سے ہی انڈیا اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا رہا ہے۔ جواباً چین کے صدر کا بھی انہی دنوں اہم اور تاریخی تجارتی سرمایہ کاری کے معاہدوں کے لئے پاکستان کا دورہ شیڈول پر تھا لیکن دارالحکومت میں سیاسی پارٹیوں کے دھرنوں کی وجہ سے اس دورہ کا وقت تبدیل کر دیا گیا اور اپریل میں چین کے صدر شی جن پنگ نے پاکستان کا تاریخی دورہ کیا۔ اس موقع پر چین اور پاکستان کے درمیان 45 ارب ڈالر کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کے معاہدے ہوئے اور دنیا کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا کیونکہ صرف چین ملک امریکہ سمیت کسی بھی ملک کی کسی دوسرے ملک میں اتنی ریکارڈ مالیت کی سرمایہ کاری پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی ہے۔ اس موقع پر دونوں حکومتوں کے مختلف محکموں اور بعض نجی کاروباری اداروں کے درمیان سرمایہ کاری کے 51 معاہدوں اور مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کئے گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ اتنی زبردست سرمایہ کاری چین کے لئے اقتصادی ووٹ کی تیاری کی وجہ سے پاکستان کے لئے امریکی چنگل سے نکلنے کے لئے بہترین موقع ہوگا کیونکہ امریکہ یورپ کی بجائے چین سے معاشی تعلق کی وجہ سے امریکی اثر و رسوخ پاکستان پر کم ہو جائے گا اور چین کے اپنی ہی کی گئی سرمایہ کاری کے تحفظ کی خاطر پاکستان کی پشت پر کھڑا ہونے سے اس پر منڈلاتے خطرات بھی کم ہو جائیں گے۔ پاکستان کی 68 سالہ تاریخ میں یہ موقع پہلی مرتبہ آ رہے ہیں۔

مستقبل کی اہم ترین بندرگاہ

عرصہ دراز پہلے پاکستان نے چین کی مدد سے گوادر کی بندرگاہ کے ذریعے چین کے علاوہ روسی ریاستوں تاجکستان، ازبکستان، کرغیزستان کو بھی اپنا مال غیر ملکی منڈیوں تک ترسیل کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا تھا کیونکہ ان تمام ممالک کو یہ روٹ سستا ترین اور وقت کے کم ضیاع کی وجہ سے سوٹ کرتا تھا لیکن ملک میں پیدا ہونے والے حالات دوسرے منظروں میں خطرات کی وجہ سے گوادر کو بندرگاہ کے طور پر استعمال کرنے اور چین جیسے دوست ملک کی مدد سے بھاری سرمایہ کاری کے ذریعے فنی اور تکنیکی تعاون کا منصوبہ لٹکتا رہا۔ پہلے 1998ء میں نواز شریف دور میں ایٹمی دھماکہ کے بعد امریکی اثر و رسوخ کی وجہ سے منصوبہ پر کام شروع نہ کیا جا سکا۔ اس کے بعد نائن الیون کے مسلسل 13 سال بعد تک دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم اور امریکہ کی افغانستان میں

موجودگی نے اس اہم منصوبہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑا کرنا شروع کیں۔ پاکستان عرصہ دراز سے اس کوشش میں تھا کہ ایسا موقعہ میسر آئے کہ گوادر کے پراجیکٹ کو دوبارہ زندگی عطا کی جائے۔ جونہی امریکی فوج کا افغانستان سے انخلا ہوا اور امریکہ نے چین کے مقابلہ میں بھارت کو کھڑا کرنے کی کوشش کرنے کے لئے امریکی صدر کے دورہ بھارت کے دوران فوجی، معاشی اور تجارتی پیکیج کا اعلان کیا۔ چین اور پاکستان کے لئے بھی یہ ناگزیر ہو چکا تھا کہ وہ نہ صرف باہمی تجارت اور معاشی تعاون کو وسیع تر کرنے کے علاوہ بیرونی دنیا سے بھی تجارت رابطوں کو وسعت دیں۔

گوادر بندرگاہ کے اہم منصوبہ جات

گوادر کی بندرگاہ فروری 2013ء میں چائنا اوور سیز ہولڈنگ کمپنی کے حوالے کی جا چکی ہے۔ کاشغر سے گوادر تک کے روٹ کی لمبائی 3000 کلو میٹر ہے جس میں ہائی وے کی تعمیر، ریلوے لنک کے علاوہ آئل اور گیس پائپ لائن کی تنصیب بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں ان منصوبوں کی تکمیل کی جائے گی:

☆ گوادر میں انڈسٹریل پارک کا قیام
☆ گوادر میں انٹرنیشنل ائرپورٹ کی تعمیر
☆ 11400 میگاواٹ کے بجلی پلانٹس کی 2017-18ء تک تکمیل۔
☆ مشرق وسطیٰ کی آئل مارکیٹ میں پہنچ سے چین کا 12000 کلو میٹر کا فاصلہ کم ہوگا۔

یہ روٹ چین کے مغربی صوبہ سنکیانگ سے شروع ہو کر گوادر تک پہنچے گا۔

چینی حکومت اور کمپنیوں سرمایہ کاری

چینی حکومت اور چینی کمپنیوں سے معاہدوں کی صورت میں پاکستان میں جو اہم پراجیکٹ مکمل کئے جائیں گے ان کی تفصیل اس طرح سے ہے:

☆ 1000 میگاواٹ سولر پاور پارک
☆ 830 میگاواٹ کروٹ آزاد جموں کشمیر ہائیڈرو پاور
☆ ٹھٹھہ (سندھ) میں پن بجلی کے تین منصوبے جن میں دو 50، 50 میگاواٹ اور ایک 100 میگاواٹ
☆ حویلیاں سے تھاکوٹ تک قراقرم ہائی وے کے سیکنڈ فیز کی تکمیل کے لئے چینی حکومت کا رعایتی نرخوں پر قرضہ، مزید براں کراچی سے لاہور موٹروے (ملتان سے سکھر) کی تکمیل گوادر پورٹ مشرقی ساحل ایکسپریس وے پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے امداد قرضہ
پاک چائنا جائنٹ بائیو ٹیکنالوجی لیبارٹری کا قیام
☆ پاک چائنا جائنٹ میرین ریسرچ سینٹر
☆ گوادر نواب شاہ ایل این جی ٹرمینل اینڈ پائپ لائن پراجیکٹ
☆ پورٹ قاسم 2x600 میگاواٹ کول پاور پلانٹ

کاشغر تا گوادر راہداری

ماضی میں چین کو پاکستان نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے لئے ائر کوریڈور فراہم کیا اور اب پاکستان اکنامک کاریڈور کے ذریعے چین کو گوادر تک رسائی دے رہا ہے جس سے چین کو اپنا مال یورپ، مشرق وسطیٰ پہنچانے کے لئے سمندر تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔ اس روٹ کے ذریعے نہ صرف چین کا پہلے روٹ کی نسبت فاصلہ کم ہو کر رہ جائے گا اور اسے ٹرانسپورٹیشن کے سلسلے میں نہ صرف اربوں ڈالر کی بچت ہوگی بلکہ اس کا وقت بھی بہت کم صرف ہوگا۔ چین کے ساتھ ہر معاہدے میں سٹینڈرڈ سرمایہ کاری کا تناسب کیا ہوگا اس کی

تفصیلات سامنے نہیں آئیں لیکن پچھلی مرتبہ جب چینی صدر پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے میڈیا سے گفتگو کے دوران یہ واضح کیا تھا کہ پاکستان کے ساتھ اگلے معاہدوں میں بھی 40 اور 60 کا تناسب کارفرما رہے گا۔ امید ہے دونوں ممالک نے معاہدے اس تناسب کو پیش نظر رکھ کر کیے ہوں گے۔

چین اور پاکستان نے آئندہ تین برسوں میں تجارتی حجم 15 ارب ڈالر سے 20 ارب ڈالر بڑھانے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ 15 ارب ڈالر کے اس تجارتی حجم میں چین نے تو د ارب ڈالر کی اشیاء پاکستان کو برآمد کیں کیونکہ برآمدات کے لیے پاکستان بہت بڑی مارکیٹ ہے لیکن جواب میں پاکستان نے صرف چند کروڑ ڈالر کی اشیاء چین کو برآمد کیں۔ ہمارے پاس ایسی کیا اشیاء ہیں جو چین جیسے اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حامل ملک کو برآمد کی جا سکیں؟ چین تو سستی اشیاء گوادر کے ذریعے برآمد کر سکے گا خواہ وہ اس کے ملک میں تیار ہوں یا پاکستان کے علاقے میں ان پلانٹ کی تنصیب کیے جائے لیکن اس میں سے پاکستان کو کیا فوائد حاصل ہوں گے؟ کیا ہماری انڈسٹری بھی اس قابل ہو سکے گی کہ سستی اشیاء کی تیاری کے ذریعے بیرون ممالک اپنی مارکیٹ بنا سکے؟ اس کا انحصار حکومت کی معاشی پالیسیوں پر ہوگا اور جب تک اس ملک کے کسان اور صنعت کاروں کو سستے پٹرول اور سستی بجلی کی صورت میں ریلیف نہیں دیا جاتا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ پاکستان میں ایسے قدرتی مقامات موجود ہونے کی وجہ سے پانی یا ہائیڈل کے ذریعے سستی ترین (1.5 روپے فی یونٹ) بجلی آسانی سے اور لامحدود حد تک پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئلے یا دیگر ذرائع سے بجلی پیدا کرنے میں ڈالے مہنگے پراجیکٹ سے ملکی انڈسٹری میں بہتری نہیں آ سکے گی۔ جن صوبوں سے روٹ کو مہیا کیا جائے گا وہاں کے وزراء اعلیٰ نے اس پر تحفظات ظاہر کیے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ان بیانات کے پس پردہ سیاسی مفادات کارفرما ہوں لیکن ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں سرمایہ کاری اور اتنے اہم روٹ کی تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد ہر صورت پاکستانی عوام کو روزگار کے وسیع مواقع میسر آئیں گے خواہ اُن کا تعلق پنجاب، سندھ، بلوچستان، خیبر پختونخوا یا گلگت بلتستان کے صوبہ جات سے ہو۔ ملک میں جدید ٹیکنالوجی کی آمد سے ملکی انڈسٹری بھی جدید خطوط پر استوار ہو گی لیکن اس کا تمام تر دارومدار آنے والی حکومتوں پر ہوگا کہ وہ اس روٹ کے قیام اور اربوں ڈالر کی ہونے والی سرمایہ کاری کے ثمرات اپنے ملک کے عوام اور معیشت کو کس طرح سے سمیٹنے کا موقع دیتی ہیں۔

پاکستان کی حالت زار پر نظر دوڑائی جائے تو ملک پر اندرونی و بیرونی 11350 ارب روپے کے قرضے چڑھے ہوئے ہیں۔ صرف پڑھے لکھے 40 لاکھ ڈگریوں والے افراد روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ 7 کروڑ 20 لاکھ افراد غربت سے بھی نچلی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں یعنی اس ملک کی اکثریتی آبادی مزدور، کسان، دیہاڑی دار و ملازم بمشکل اپنی روٹی پوری کر رہا ہے۔ بجلی، گیس اور دیگر ضروریات کی کمیابی تو عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اس ملک کے مسائل اسی ملک کے عالموں، سیاست دانوں، ماہرین کو ہی حل کرنے ہیں۔ جو اقوام کسی دوسرے پر انحصار کرتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور ہمیشہ مسائل اور مصائب تلے دبی رہتی ہیں۔ ملک میں سڑکوں کی تعمیر، تیز رفتار ٹرانسپورٹ کی سہولیات اپنی جگہ جب تک قوم کے ہر فرد کو بنیادی ضروریات تعلیم، علاج معالجہ اور روزگار کی فراہمی ممکن نہیں ہوتی ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

○✱○

فتویٰ مارکیٹ

یہاں آپ کو اپنی پسند کا فتویٰ سستے داموں مل سکتا ہے

☆ سعید

پاکستان میں ایک ایسی فتویٰ مارکیٹ بھی موجود ہے جہاں سے کسی بھی شخص کو اپنی پسند کا فتویٰ باآسانی مل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس مارکیٹ سے آپ اپنے مخالف کے قتل کا فتویٰ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ غیر شرعی اقدامات کو پابند شریعت بنانے کے ماہر کاریگر اس مارکیٹ میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ فتویٰ مارکیٹ کا سب سے زیادہ نقصان علماء حق اور اسلام کو ہو رہا ہے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ قائداعظم اور ان کے رفقاء کی تقاریر اور تحاریر بھی اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت جو نعرہ زبان زد عام ہوا وہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ" تھا۔ یہ نعرہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ صرف قائداعظم اور ان کے رفقاء ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی "اسلامی ریاست" چاہتے تھے۔ اس اسلامی ریاست کے لیے ہی لوگوں نے اپنی جائیدادیں چھوڑ کر ہجرت کی۔ اس عظیم مقصد کے لیے جان و مال ہی نہیں بلکہ عزت و آبرو بھی قربان کر دی گئی۔ یہ پس منظر واضح کرتا ہے کہ قیام پاکستان کا اصل مقصد اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آئین سازی کے مراحل اور خاص طور پر 1971ء کے آئین کی اسلامی دفعات بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان میں اسلام کو اولیت حاصل ہے اگر ہم اس ساری صورت حال کا جائزہ لیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پاکستان، اسلام اور علماء حق کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ علماء حق نے نہ صرف قیام پاکستان کی تائید کی بلکہ عملی طور پر بھی اس مقصد کے لیے متحرک نظر آئے۔

دوسری جانب زمینی حقائق پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ بدقسمتی سے پاکستان نہ تو اسلام کا قلعہ بن سکا اور نہ ہی یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکا ہے۔ آج ہم لسانیت اور قومیت کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کی بنیاد پر بھی تقسیم ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں مذہب کے نام پر بم دھماکے، قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ طویل عرصہ سے جاری ہے۔ فرقہ واریت کی بنیاد پر ہزاروں افراد مارے جا چکے ہیں۔ مساجد، امام بارگاہیں، مزارات بھی ان حملوں سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ ساری

چیزیں تباہی، عدم تحفظ اور لاقانونیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ پاکستان اور اسلام کی بدنامی کا باعث بھی بن رہی ہیں۔ اس سلسلے پر علماء کرام اور حکومت دونوں ہی کو ل کر قابو پانا تھا لیکن فی الوقت دونوں ہی اس حوالے سے ناکامی کا شکار نظر آتے ہیں۔

پاکستان میں ہونے والے مذہبی فسادات کی وجوہات کا جائزہ لیں تو ان میں سب سے اہم وجہ ''غیر ذمہ دارانہ فتویٰ'' ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں نیم مذہبی سکہ بند فتویٰ بازوں کی پوری مارکیٹ موجود ہے۔ ایسے افراد ذاتی مفادات کے لیے فتویٰ جاری کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ صورت حال اس حد تک جا چکی ہے کہ اب بعض ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی ایسے ''علماء کرام'' کی خدمات حاصل کرنے لگی ہیں جو ایسے بیانات جاری کر دیتے ہیں جن سے ان کمپنیوں کو مالی فائدہ ہو۔ دیگر الفاظ میں اب بعض کاروباری ادارے خالصتاً مالی مفادات کے لیے علماء کرام کو پبلک ریلیشنز کے لیے استعمال کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض چلتے ابھی بھی اسلامی بنکاری کے حوالے سے علماء کرام کے بیانات پر تحفظات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح انشورنس کمپنیوں کے نمائندگان کے پاس بھی اپنے حق میں فتاویٰ موجود ہوتے ہیں۔ صورت حال یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سود اور اقساط کے کاروبار سے منسلک افراد کے ہاتھوں میں بھی اپنے کاروبار کے حق میں فتاویٰ نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو کاروباری منظرنامے پر آسیب کی طرح چھاتی جا رہی ہے۔ پاکستان کا عام شہری مذہب کے حوالے سے خاصا جذباتی ہے۔ اس کے جذباتی پن کو اب مفادات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں پرائز بانڈز کے حق میں بھی فتویٰ نظر آتا ہے اور اس کو حرام قرار دینے کا فتویٰ بھی موجود ہے۔ یہ صورت حال دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔

پاکستان میں پائی جانے والی ''فتویٰ مارکیٹ'' کا کاروبار اس سطح تک جا پہنچا ہے کہ بنک لوٹنے کو جائز قرار دینے والے فتویٰ بھی اس مارکیٹ میں موجود ہیں۔ صحافیوں کے قتل کے لیے بھی طالبان کے پاس فتویٰ موجود ہے۔ یہ فتویٰ طالبان کے ترجمان احسان اللہ احسان کے سوال پر جاری کیا گیا تھا۔ اسی طرح فتویٰ مارکیٹ میں خودکش حملوں کے ساتھ ساتھ مزارات، امام بارگاہوں اور مساجد پر حملوں کے حق میں بھی فتاویٰ دستیاب ہیں۔ پشاور سانحہ کے حوالے سے بچوں کے قتل پر بھی فتویٰ اس مارکیٹ میں نظر آیا تھا۔ ہمارے ہاں اصل کاروبار کے ساتھ ساتھ دونمبر اور جعلی کاروبار بھی چلتے ہیں۔ ''میڈ ان پاکستان'' کا لیبل اتار کر ''میڈ ان جاپان'' کا لیبل لگا کر چیزوں کی قیمت بڑھائی جاتی ہے۔ یہ کام فتویٰ مارکیٹ میں بھی عروج پر ہے۔ اسی طرح یہاں جائنہ کا مال بھی بہت زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ یہی صورت حال فتویٰ مارکیٹ کی بھی ہے۔ علماء حق کے ساتھ ساتھ نیم مذہبی افراد کے جاری کردہ فتاویٰ تو اس مارکیٹ میں بے خوف ہو کر بیچے جاتے ہیں۔

اب تو حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ جعلی ڈگریوں کی طرح جعلی فتاویٰ بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ جامعہ کراچی کے ایک استاد ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ ڈاکٹر شکیل بلوچ ایسے ہی فتویٰ کی بنیاد پر شہید ہو چکے ہیں۔ انہیں واجب القتل قرار دینے کا فتویٰ مفتی رفیع عثمانی صاحب کے ادارے جامعہ دارالعلوم سے جاری کیا گیا تھا۔ لیٹر ہیڈ پر جاری اس فتویٰ پر دستخط اور مہر سمیت تمام ضروری لوازمات موجود تھے۔ ڈاکٹر شکیل اوج بھی اس فتویٰ سے واقف تھے اور پھر اسی کی بنیاد پر انہیں قتل کر دیا گیا۔ ان کی شہادت کے بعد یہ فتویٰ سوشل میڈیا پر زیادہ تیزی سے پھیلا تو معلوم ہوا کہ ایسا فتویٰ تو سرے سے جاری ہی نہیں کیا گیا۔ مفتی رفیع عثمانی صاحب کی

جانب سے اس کی واضح تردید جاری کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی خوف میں ڈوبا یہ سوال بھی پھن پھیلائے کھڑا ہو گیا کہ ایسے جعلی فتاویٰ کا علم کیسے ہوگا؟ خدا جانے فتویٰ مارکیٹ نے ایسے کتنے جعلی فتاویٰ جاری کر دیے ہوں۔ ہمارے ہاں "کال تو پلی نیم" ایک شخصیت کو واجب القتل قرار دینے کے لاتعداد فتاویٰ موجود ہیں۔ دوسری جانب اس شخصیت کے پاس بھی ایسے درجنوں فتاویٰ موجود ہیں جو ان کے حق میں ہیں۔ حال ہی میں یہ خبر بھی آئی کہ سکھر میں ساس اور بہو کے اختلافات کے باعث مولوی کلیم نامی شخص نے برادری کو بلا کر دونوں کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا۔

فتویٰ مارکیٹ میں ہر فرقہ کا پلازہ موجود ہے لہٰذا یہاں آپ کو کہیں نہ کہیں سے اپنی پسند کا فتویٰ مل سکتا ہے۔ فرقہ واریت کی بنیاد پر تو یہاں ایک ہی دن میں ایسا فتویٰ بھی جاری ہو جاتا ہے جس پر ایک ہی فرقہ کے سو، ڈیڑھ سو علماء کرام کے دستخط ہوتے ہیں۔ ایسے فتویٰ کے بارے میں عموماً اخبارات میں خبر بھی شائع ہوتی ہے کیونکہ یہ سیاسی بنیادوں پر بھی جاری ہوتے ہیں۔

فتویٰ مارکیٹ اب انتہائی خطرناک مارکیٹ بن چکی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف علماء حق بدنام ہو رہے ہیں بلکہ فرقہ واریت کو بھی ہوا مل رہی ہے۔ دوسری جانب چند افراد کی وجہ سے اسلام کا تشخص بھی خراب ہو رہا ہے۔ ہمارا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ عام شہری کو یہ معلوم ہی نہیں کہ "فتویٰ" کون جاری کر سکتا ہے۔ پاکستان کا عام شہری تو "مولوی توکا" کی تقریر کو بھی فتویٰ سمجھ لیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور جید علماء کرام مل کر ایسا لائحہ عمل طے کریں جس سے لوگوں کو فتویٰ کی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو سکے کہ فتویٰ کون جاری کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فتویٰ، بیان، تقریر اور عام تحریر میں فرق کو بھی اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے سیمینارز اور مباحثے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ میڈیا کمیشن بھی اس آگہی مہم میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے تمام اسلامی فرقوں کی بڑی جامعات اور جید علماء کرام پر مشتمل ایک "گرینڈ علماء بورڈ" بنایا جائے اور صرف یہی بورڈ فتویٰ جاری کرنے کا اہل ہو۔ اس علماء بورڈ میں ہر مسلک کی برابر نمائندگی ہو تاکہ یہاں سے جاری ہونے والا فتویٰ فرقہ وارانہ فتویٰ کی بجائے اجتہاد پر مبنی "اسلامی فتویٰ" ہو۔ ایسے فتویٰ سے کسی بھی فرقہ کی توہین یا دل آزاری نہ ہو البتہ یہ واضح کر دیا جائے کہ کس ملک کے اکابرین کا اس بارے میں کیا موقف رہا ہے یا کون سا فرقہ اس مسئلہ پر کیا رائے رکھتا ہے البتہ اس پر متحدہ علماء بورڈ کے سبھی مسالک کے دستخط ضروری ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ فتویٰ ایس ایم ایس یا فون کال کی بجائے دستخط شدہ ہی جاری کیا جائے۔ اس سلسلے میں باقاعدہ بورڈ بنا کر تجاویز طلب کی جا سکتی ہیں اور ایک مکمل لائحہ عمل اور طریقہ کار ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنایا جائے اور مذہبی قتل و غارت اور فراڈ کا خاتمہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے فتویٰ مارکیٹ سے ناجائز تجاوزات کو ہٹانا اور قبضہ مافیا کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ علماء حق کے ذریعے عام شہریوں کو اسلام کی اصل روح سے متعارف کرایا جا سکے۔

تحقیقاتی صحافی سید بدر سعید کی یہ تحریر "فیملی میگزین" "نوائے وقت گروپ" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ادارے کے شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

غدار

ہم ایسے عاقبت نااندیش بکرے ہیں کہ جو قصائی کی منڈیر پر چڑھ کر ذبح ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

ابدال بیلا

ایک روسی فوجی افسر پر روس کی کے جے بی کو شک تھا کہ وہ امریکی ایجنٹ ہے۔ کے جے بی نے اس کے فون ٹیپ کرنا شروع کر دیے۔ ملاقاتیوں کی چھان پھٹک کر لی۔ مگر کوئی سرا نہ ملا۔ ایک بھی ثبوت نہ ملا کہ کبھی کسی امریکی نے اس سے رابطہ کیا ہو یا اس فوجی افسر کی طرف سے امریکہ کی طرف کوئی کلاسیفائیڈ اطلاع گئی ہو۔ ناچار اس فوجی افسر کو ترقی دے دی گئی۔

کے جے بی کی شک کی رگ پھڑکتی رہتی۔

مگر اس افسر کی طرف سے کے جے بی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ترقی کرتا کرتا وہ فوجی افسر جنرل بن گیا۔ روسی سوویت یونین کا چیف آف سٹاف بن گیا۔ یہ وہ چیف آف سٹاف تھا جس کے بعد روسی سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ روسی سوویت یونین کا وہ چیف آف سٹاف اپنی مدت ملازمت پوری کر گیا۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ جنرل اچانک امریکہ چلا گیا۔

اور ایک دن امریکی ٹیلی وژن پر نمودار ہو گیا۔ اس نے بڑے فخر سے تسلیم کر لیا کہ وہ کامیاب امریکی ایجنٹ تھا اور اپنی کمال مکاری سے اس نے دشمن ملک کی فوج کی سربراہی حاصل کی اور اس نے آنکھیں نچا کے منہ میں سگار کا ایک کش لیا اور گردن اکڑا کے بولا کہ اس نے امریکہ کے لئے اپنے سارے ہدف سولہ آنے پورے

کیئے۔

روس میں کھلبلی مچ گئی۔

روس کی کے جی بی سر پکڑ کر بیٹھ گئی، پریشان۔ خدا جانے وہ جنرل ادھر کیا کیا نقصان کر گیا؟ آخر اس غدار جنرل کی قربت میں رہے ایک جونیئر افسر کو ذمہ داری دی گئی کہ امریکہ جائے کسی طرح غدار جنرل سے ملے۔ پتہ چلائے کہ وہ غدار روس کا کتنا نقصان کر گیا۔ وہ جونیئر امریکہ میں اپنے پرانے غدار باس سے جا ملا۔ سلام دعا کے بعد جونیئر نے صرف ایک سوال کیا۔ جناب آپ نے اپنے امریکی اہداف کیسے پورے کیے؟ ہم نے تو سال ہا سال آپ کے فون ٹیپ کیے۔ ملاقاتیوں کی چھان پھٹک کی، ہمارے ہاتھ کوئی سرا نہ آیا۔

اس غدار فوجی جنرل نے امریکی سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''برخودار! کچھ عقل کے ناخن لو۔ میں کوئی دیہاڑی دار جاسوس تھوڑی تھا کہ جو ٹکے ٹکے کی خبریں پکڑ کے پہنچاتا۔

مجھے امریکہ نے بھرتی کرتے سے صرف دو ٹاسک دیئے تھے۔

کہا تھا انہیں پورا کرنا ہے اور درمیان میں کوئی رابطہ نہیں کرنا۔'' نہ کسی رابطے کی توقع کرنا ہے''۔

میں دل جمعی سے وہ دونوں ٹاسک پورے کرتا رہا۔

جونیئر کہنے لگا کہ سر! آپ نے جو کرنا تھا وہ کر چکے۔ اب تو بتا دیں وہ دو ٹاسک کیا تھے؟

غدار جرنیل نے منہ میں لئے سگار کو اپنی انگلیوں میں گھمایا اور بولا۔ برخودار سنو۔

پہلا ٹاسک مجھے یہ ملا تھا کہ نالائق اور عیاش کو ترقی دو اور غلط آدمی کو غلط جگہ پر تعینات کرو۔ میں نے یہ کام کیا۔

دوسرا کام قدرتی تھا۔

مگر پہلے کام کی تکمیل کے بعد وہ آسان ہو گیا تھا۔

وہ کام تھا روسی افواج کا امیج روسی عوام میں تباہ کر دو۔

اس میں سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ میں روسی فوج کو روسی عوام سے لڑا دوں۔ میں نے لڑا دیا۔ لڑایا بھی ان سے جو تمہاری قوم میں سب سے لڑاکے تھے، بہادر تھے، ان سے تاکہ وہ روسی فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

ہر قوم اپنی فوج کو اپنا محافظ سمجھتی ہے۔

جب کوئی قوم اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں خود مرنے لگے تو قوم اپنی فوج کے بارے میں رائے بدل لیتی ہے۔

روسی قوم نے بھی رائے بدل لی۔

پھر میرے ہاتھوں ترقی پانے والے نالائق اور عیاش لوگوں نے اپنی نالائقی اور عیاشیوں سے رہی سہی فوج کی عزت بھی برباد کر دی۔

میں نے ایک اور وار کیا۔

اپنے ایڈوائزر ایسے رکھے جو میرا مشن آگے بڑھائیں۔

خود وہ ہر ٹی وی سکرین پر جا بیٹھے ہوں مگر فوج کی مجموعی ساکھ کو برباد کر دیں۔

انہوں نے میرے حکم سے اور اپنی کم عقلی سے رہی سہی کسر نکال دی۔ جنہیں میڈیا ایڈوائزر بنایا، انہوں نے میڈیا میں فوج کا صرف جرنیلی چہرہ دکھایا۔ ریڈ کارپٹ، زرق برق دفاتر، چمچماتی کاریں، کلف لگی وردیاں، اکڑی گردنیں، روندتے ہوئے پالش ہوئے لمبے جوتے، انگلیوں میں قوت کے نشے میں تھرتھراتی سوٹیاں اور مدہوش ہونٹوں سے سلگتے سگار کے دھوئیں کے مرغولے۔

غلط جگہ پہ تعینات غلط افسروں نے سونے پہ سہاگا کر دیا۔

تمہارا ملک جو ابھی سو سال تک بکھا اور توانا رہ

سکتا تھا، میرے تعینات کیے غلط لوگوں کے غلط فیصلوں
کے ہاتھوں دعاؤں کی زد میں آ گیا۔

ہر بڑا فیصلہ چھوٹے چھوٹے فیصلوں کا مرہون
منت ہوتا ہے۔

میں نے خود کچھ نہیں کیا۔ صرف تمہارے عدل کے
نظام کی جڑ میں بارود لگا دیا۔ تمہارے عدالتی فیصلوں میں
بے منصف عیار منصفوں کی اینٹیں جوڑ دیں۔ تمہارے
نظام عدل کی پوری دیوار گرا دی۔ باقی کا سارا فساد اسی
بگڑے ہوئے ایوان عدل نے پورا کر دیا۔

تمہارا ملک کیوں نہ گرتا۔

گر گیا۔

اب تم لوگ بچ نہیں سکتے جب تک عدل نہ بچاؤ۔
اس لئے کہ کسی بھی بگاڑ کی صورت میں تم لوگوں کو جن
اداروں سے اصلاح کی توقع ہو سکتی تھی، وہ ادارے میں
نے زمین بوس کر دیئے۔ انصاف کا حصول ناممکن بنا دیا۔

فوج سے اصلاح احوال کا خواب تک تمہارے
لوگوں کی آنکھوں سے چھین لیا۔

رہ گئی تمہاری سیاسی پارٹیاں تو ان پارٹیوں کی کھال
ادھیڑ دی۔ تمہاری جس بڑی پارٹی سے خطرہ تھا کہ وہ
پورے ملک کی زنجیر بن کے ملک کو جوڑ کے رکھ سکتی تھی،
اسی پارٹی کے لیڈر کو اس کی پارٹی کے اپنے بندے سے
قتل کے مروا دیا جو اس پارٹی کا وارث بن سکے۔ شب خون
مارے۔ ہمارا دیا ہوا روڈ میپ پورا کرے۔ ہمارے ٹائم
فریم میں رہ کے ہمارا فیصلہ سنائے۔ جب ہم چاہیں فساد تو
وہ فساد کروا دے۔ جب ہم چاہیں انصاف کی بیخ کنی تو وہ
منصفوں کو دیوار میں چن دے اور چپ رہے گے۔

رہ گئی تمہارے ملک کی چھوٹی چھوٹی علاقائی اور
لسانی پارٹیاں۔

وہ ہمارے حق میں ہیں۔ ان کا ایجنڈا تمہارے
ملک کے کلیجے پہ لگائی ہوئی، کاٹنے جانے والی ہماری ان

سفید رنگ

اچھے لوگ سفید رنگ جیسے ہوتے ہیں۔ سفید رنگ میں کوئی بھی رنگ ملا دو، ایک نیا رنگ بن جائے گا مگر دنیا کے سارے رنگ ملا کر بھی سفید رنگ نہیں بنایا جا سکتا۔ (نسیم سکینہ صدف)

لکیروں کے عین مطابق ہے، جو ہم نے طے کی ہیں۔

جو ہمارے روڈ میپ میں ہیں۔

جس کا نقشہ ہم نے چھپایا ہوا ہے۔

صرف ٹائم فریم ہم نے طے کرنا ہیں۔

روڈ میپ ان منافق پارٹیوں کے پاس ہے۔

اگر عدلیہ نہ بچی تو تم ٹوٹنے سے بچ نہیں سکتے۔

میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔

کہنے کو کتنا چھوٹا اور بے ضرر سا کام ہے، نالائق اور عیاش لوگوں کی ترقی اور غلط جگہ پر غلط آدمی کی تعیناتی، انصاف کی دکان بند اور تمہاری افواج کی تمہارے لوگوں کی نظر میں بے توقیری۔

اس امریکی ایجنٹ روسی جنرل کے پاس تو ان کا ایک جونیئر افسر یہ پتہ کرنے پہنچ گیا تھا کہ پتہ تو چلے اس امریکی ایجنٹ روسی جنرل نے روس کو کتنا نقصان پہنچایا۔ حیرت ہے ہمارے ملک پہ مسلط رہے، سینہ امریکی ایجنٹ کے پاس ہمارا کوئی افسر نہیں پہنچا کہ پتہ تو چلے فوج کی بے توقیری، اداروں کی بربادی اور انصاف کی زندہ درگوری کے بعد ملک کو باندھ کے رکھنے والی زنجیر نما بڑی سیاسی پارٹی کی لیڈر کو منظر سے ہٹانے کے بعد اس کی پوری پارٹی کو اخلاقی اور سیاسی میدان میں دیوالیہ کر دیا گیا۔ دو تہائی اکثریت والی پارٹی کے لیڈر کو قید اور جلا وطن کیا گیا۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

مگر کیوں؟

وہ امریکی ایجنٹ اور کیا کیا خوفناک بیج بو چکا ہے۔ ہم سب اندھیرے میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ خواہ مخواہ ایک دوسرے کا منہ نوچ رہے ہیں۔ جس نے ہمارے ملک کا چہرہ بگاڑا، وہ اپنا سالم چہرہ لئے دشمن ملکوں کی یاترا کرتا پھر رہا ہے۔ اپنی کی ہوئی غداری کی فیس وصول کرتا پھر رہا ہے۔ امریکہ کئی سال پہلے سے ہماری قسمت کا روڈ میپ بنائے، ہمارے جغرافیے کا نیا نقشہ بنائے بیٹھا اپنے کام میں جتا رہا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے کرتا دھرتا کھلے عام چل رہے ہیں۔ ہماری قومی حمیت کی گردن پہ چھری سر عام چل رہی ہے۔ وہی وعدے بھی کرواتا ہے۔ وہی وعدوں سے مکرواتا ہے۔ وہ کٹھ پتلی کی جگہ نئی کٹھ پتلی بٹھاتا ہے۔ جمہوریت کی دعویدار پارٹی سے جمہوری قدروں کی پامالی کرواتا ہے۔ ہماری خوشحالی اور امن کی رکھوالی سڑکوں کو ہماری تباہ حال معیشت کے کنٹینروں سے بند کرواتا ہے۔ وہ پہلے دودھ کو ابال دلواتا ہے پھر اسی اُبلے دودھ سے پورا چولہا بند کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ وہ ایک ہی ٹریک پہ دو گاڑیاں چلواتا ہے۔ ٹکراؤ کے دھماکے ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں اور ہمیں ابھی تک سمجھ نہیں آئی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے جا رہا ہے؟ اور ہماری سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ ہم نے ابھی یہ طے نہیں کیا کہ یہ سب کرا کون رہا تھا۔ ہم اتنے احمق ہیں کہ ہمیں یہ احساس ہی نہیں کہ جو سات سمندر پار کر کے، لاکھوں کی فوج کا اژدہ ہماری مغربی سرحد پہ اکٹھا کیئے ہوئے ہے۔ اس کا ہمارے سینے پہ چھری چلانے کے علاوہ اور کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے ہم ایسے عاقبت نااندیش نکلے ہیں کہ جو قصائی کی منڈیر پر چڑھ کر ذبح ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ دو زانو ہوئے بیٹھے ہیں۔

✱◆✱

غیر ملکی لابیاں

سیاسی راہنماؤں کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر دو تین سال بعد انتخابات کراتے رہیں۔ اس طرح اُن کی ناجائز دولت بھی گردش میں رہے گی۔ ان کے جیالے بھی معروف رہیں اور ملک میں امن و امان بھی بحال ہو جائے گا۔

☆ سکواڈرن لیڈر (ر) سید ریاض احسن

پاکستان اس لحاظ سے بہت بدنام ہے کہ یہاں کئی غیر ملکی لابیاں کام کر رہی ہیں اور ان کو دوسرے ممالک سے امداد بھی ملتی رہتی ہے۔ بعض جذباتی قسم کے مفکر اور تجزیہ نگار اسے ملکی سالمیت اور حب الوطنی کے خلاف قرار دیتے ہیں اور کئی دانشور تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ ایک عربی مقولہ "حب الوطن من الایمان" کو حدیث قرار دے کر ایسے لوگوں کو دائرۂ اسلام سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ کوئی پسندیدہ نظریہ نہیں۔ ایک انسان ہونے کے ناطے آپ جہاں بھی رہتے ہیں اور بنیادی ضروریات زندگی حاصل کرتے ہیں اس مقام اور ملک کی بھلائی اور حفاظت آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ کئی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ذاتی، خاندانی یا اعتقادی وجوہات کی بناء پر اپنے پیدائشی وطن سے نقل مکانی کی اور پھر کسی دوسرے ملک کے شہری بن کر نسل در نسل وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

برصغیر کے اکثر خوشحال، بااثر اور اہم خاندان تو بیرون ملک سے ہی وارد ہوئے ہیں یہاں آ کر وہ اصلی باشندوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کی یہ صدیوں سے روایت رہی ہے کہ وہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو اپنے دین کی طرف راغب کرتے اور وہاں اپنی تہذیب و تمدن کو پھیلاتے ہیں۔ اپنی اعلیٰ روایات، بلند کردار اور حسن سلوک کی بناء پر ماحول پہ چھا جاتے ہیں۔ یہ نعرہ لگاتے ہوئے اسی ملک کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں کہ

ہر ملک، ملک ما است کہ ملک خدائے ما است

برصغیر کے بے شمار مسلمانوں نے پاکستان کو اپنا ملک قرار دیا اور کئی مشکلات کو عبور کر کے اور ان گنت قربانیاں دے کر بذریعہ ہجرت یہاں پہنچ گئے اور اسی کو اپنا مستقل وطن قرار دیا حالانکہ یہ اُن کا مادرِ وطن نہیں تھا کیونکہ انہیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت ہوگا جو ان کی دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہوگا لیکن مسلمانوں کا روحانی اور جذباتی تعلق بہرحال مشرق وسطیٰ کے ساتھ وابستہ رہا۔ جہاں ان کی ہدایت کا سرچشمہ اور دین کا منبع تھا۔ عرب ممالک نے بھی

برصغیر کے مسلمانوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان سے حکومتی اور نجی ہر طرح پر بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا ہے۔ پاکستان کے مختلف ادارے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اپنا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں اور اُن سے برملا مالی امداد بھی وصول کرتے رہتے ہیں۔ ایسی امداد کو کبھی بھی کسی نے ملکی مفاد کے خلاف اور ملک دشمنی سے تعبیر نہیں کیا۔ مشرقِ وسطیٰ میں کسی قسم کے بحران کی صورت میں نجی شعبوں نے بھرپور تعاون کا اظہار کیا ہے اور یہ یقینی طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

حکومتی سطح پر پاکستان نے اس سلسلہ میں کئی دفعہ گریز کی پالیسی اختیار کی ہے۔ ابتدا ہی سے حکومت نے ایک قادیانی کو وزیر خارجہ اور ایک ہندو کو وزیر قانون بنا کر اپنے اسلامی تشخص کو بہت مجروح کیا اور عرصہ دراز تک مسلم ممالک اسے ایک مرزائی مملکت گردانتے رہے۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہاں اسلامی ذہن اور تعلیم کے حامل لوگ کبھی بھی برسر اقتدار نہیں رہے اور ہمارے کئی لیڈر مسلم ممالک کو زیرو پلس زیرو ہی قرار دیتے رہے۔ وہ اپنی وفاداری برطانیہ اور امریکہ پر ہی نچھاور کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں نئی نسل کا رجحان امریکہ اور یورپ کی طرف ہو گیا۔ وہاں کی تعلیم و تربیت کو ہی وہ اعلیٰ گردانتے رہے اور وہاں ملازمت کاروبار اور وہاں کی شہریت اکثر خواتین و حضرات کے لئے باعث فخر ہے لیکن یہ ہے اصل حقیقت کہ مغربی ممالک میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ تعلیم نہیں بلکہ ہنر ہوتا ہے جس کے ذریعے لوگ اچھی سہولتیں حاصل کر لیتے ہیں اور اسی میں وہ مگن اور خوش ہیں۔ انہی بنیادی سہولتوں کے بل بوتے پر وہ پاکستان اور اسلامی ممالک کو کوستے رہتے ہیں۔

اکثر پاکستانی اور دوسرے مسلم ممالک کے باشندے اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ مغربی ممالک کی چاکری کرنے کی بجائے اگر وہ اپنے وسائل کے سہارے محنت کریں تو اپنے ممالک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے بے شمار ادارے اور افراد بیرونی ممالک سے امداد حاصل کر کے امداد دینے والوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن یہ ایک فطری عمل ہے۔ انسانیت کے ناطے ایک دوسرے کی مدد کرنا اور تعاون حاصل کرنا ایک اچھا عمل ہے۔ یہ جو قوموں نے جغرافیائی لکیریں ڈالی ہوئی ہیں یہ مستقل نہیں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ برصغیر کے کئی مخلص اور اہل علم مسلمانوں نے بیرونی حملہ آوروں کو حملہ کرنے کی دعوت دی اور اُن کے تعاون سے مقامی ظالم حکمرانوں سے نجات حاصل کی۔ پاکستان میں بھی کئی حکمران بیرونی طاقتوں کے تعاون سے برسر اقتدار آئے اور ان کی خوشنودی تک قائم رہے کیونکہ دنیا کا نظام باہمی تعاون سے ہی قائم رہتا ہے ورنہ فتنہ و فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مختلف ممالک ایک دوسرے کی خفیہ طور پر امداد کرتے ہیں اس لئے پوری دنیا میں حقیقی امن و امان مفقود ہے۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اسلام کو صرف بطور نعرہ استعمال کیا گیا اس لئے مخلص مسلمان لیڈروں کو غلط فہمی ہو گئی کہ یہاں اسلامی نظام حکومت رائج ہو گا لیکن سیاسی لیڈر اسلامی تعلیم سے بے بہرہ اور مغربی خیالات کے حامل تھے اس لئے.....

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے

اب صورتِ حال یہ ہے کہ سیاسی لیڈر مغربی ممالک سے مال بٹورتے ہیں اور مذہبی لیڈر مسلم ممالک سے مالی امداد حاصل کرتے ہیں کیونکہ ہر دو مال مفت کھانے کے عادی ہو گئے اس لئے ملک وملت کی بھلائی کے لئے محنت کرنے کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان بین الاقوامی کھلونا بنا ہوا ہے۔ ہر

کوئی اس کی افرادی قوت سے استفادہ بھی کرتا ہے اور دھمکیاں بھی دیتا ہے۔ ہم ہر کسی سے مال بھی کھاتے ہیں اور گالیاں بھی کھاتے ہیں۔ اپنے ملک و ملت کو خواہ مخواہ تماشا بنایا ہوا ہے اور بلا جواز بڑھک بازی کے ذریعے ہر چھوٹے بڑے ملک کو چیلنج بھی کرتے رہتے ہیں۔

اس وقت جبکہ ہم اپنی زندگی کی سنچری مکمل کرنے کے قریب پہنچ رہے ہیں ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہم زوال پذیر مغربی ممالک کے اقتصادی غلام بن کر رہنا چاہتے ہیں یا قدرتی وسائل سے مالا مال مسلم دنیا کے راہنما کا کردار ادا کرنے کے خواہاں ہیں۔ ہمارے اکثر سیاسی راہنما تو مغربی ممالک کی غلامی میں شاداں و فرحاں ہیں کیونکہ انہوں نے قبل از آزادی کا وطیرہ اپنایا ہوا ہے اور ان کو اسی قسم کی مراعات وافر مقدار میں میسر ہیں۔ مسلم دنیا کے راہنما کا کردار ادا کرنے کے لئے مختلف قومی ادارے جنہیں ہمارے دانشور غیر ملکی لابیاں قرار دیتے ہیں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ مذہبی راہنماؤں کے مسلم ممالک کے رہنماؤں سے اچھے تعلقات ہیں اور پاکستان کے ماڈرن لیڈر بھی اسلام کے نعرے لگاتے ہیں اور عمرے، زیارتوں وغیرہ سے بھی مستفید ہوتے رہتے ہیں اس لئے مسلم دنیا میں پاکستان کی بہت قدر و منزلت ہے۔ اس بلند مقام کا زیادہ تر انحصار اُن مذہبی راہنماؤں اور ان اداروں پر ہے جن کو ہمارے نام نہاد دانشور غیر ملکی لابیاں قرار دیتے ہیں۔ پاکستان کے جدید لیڈر تو اسلامی نظام حکومت اور اسلامی علوم سے مکمل طور پر نا آشنا ہیں۔ بعض اہم لیڈر تو سورہ اخلاص کی تلاوت کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسے راہنماؤں سے توقع کرنا کہ وہ اپنے ملک میں کوئی جرگہ وغیرہ بنا کر ملکی حالات سدھاریں گے اور مسلم دنیا کو متحد کرنے کے لئے کوئی کردار ادا کریں گے۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

نوے کی دہائی میں ہمارے وزیراعظم عرب ممالک میں صلح کرانے کے لئے شٹل ڈپلومیسی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور اُن کے اپنے آرمی چیف ان کے خلاف بیان بازی میں مشغول تھے۔ آج کل ہمارے سپہ سالار سیاسی حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کر کے اندرونی و بیرونی مسائل کو حل کرنے کی موثر تگ و دو کر رہے ہیں۔ جن کو غیر ملکی لابیاں کہا جاتا ہے وہ بھی مسلم دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں مثبت اقدامات کرنے کی خواہش کا برملا اظہار کر رہے ہیں لیکن سیاسی حکومت گومگو کی حالت میں پریشان ہے۔ یہ سب سیاسی لیڈروں کو خوش کرنے کے چکر میں مبہم قسم کے بیانات دینے اور قرار دادیں پاس کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں جو ملک و ملت کے لئے مفید نہیں ہے۔ ایک وزیر علی کو معتبر بنا کر مسلم ممالک میں بھیجنا کارگر ثابت نہیں ہوگا۔ آرمی چیف کی سربراہی میں مذہبی راہنماؤں کے مندوبین اس سلسلہ میں مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سیاسی راہنماؤں کو ملکی مسائل از قسم توانائی بحران، بے روزگاری اور مہنگائی وغیرہ کو حل کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں تو وہ مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں اور پوری مسلم دنیا کو سدھارنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ یمن میں جنگ بندی اور سعودیہ میں پاکستانی فوج کی موجودگی سب کو مذاکرات پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ہمارے جنرل صاحب مذاکرات کے بھی ماہر ہیں وہ مسلم دنیا کے مسائل کا بہتر حل نکال لیں گے۔ سیاسی راہنماؤں کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر دو تین سال بعد انتخابات کراتے رہیں۔ اس طرح اُن کی ناجائز دولت بھی گردش میں رہے گی۔ ان کے جیالے بھی مصروف رہیں اور ملک میں امن و امان بھی بحال ہو جائے گا۔

☆☆

''ہم اپنے ادھورے پن میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی ہماری طرح مکمل ہونے کی طلب میں زندگی گزار رہا ہے''۔

☆ رمی شاہد

گھر کی تلاش میں جگہ جگہ بھٹکنا میری قسمت کی ٹھوکروں نے میری تقدیر میں لکھ رکھا تھا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں، کوئی ایک ٹھکانا تو تھا ہی نہیں۔ اپنے آبائی گاؤں سے کیا دور ہوا میں تو بھٹک ہی گیا۔

شہر میں پڑھائی مکمل کر کے جب گاؤں لوٹا تو شہر کی رونقیں لہو میں گردش کرتی محسوس ہوئیں، گاؤں میں دل نہ لگا اور میں شہر لوٹ آیا۔ والدین تو حیات نہیں تھے، ایک بہن تھی جو دیہی گاؤں میں بیاہی گئی تھی اور خوش حال زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک بڑا بھائی تھا جو والدین کی اکلوتی نشانی، یہ گھر اور اس سے ملحقہ کھیت بڑی عزت سے سنبھالے ہوئے تھے، ان کی رچ بس گاؤں کی مٹی میں بسی تھی۔ میرے خمیر میں شہر کی ملاوٹ آن بیٹھی تھی، سو مجھے سکون نہ تھا۔

سکون ذات سے دور ہو جائے تو انسان بھٹکتا رہتا ہے، ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے۔ نوکری کی تلاش آخر رنگ لائی اور مجھے ایک مناسب سی کمپنی میں عزت کی نوکری مل گئی۔ اب مسئلہ رہائش کا تھا، پہلے تو چار پانچ لڑکے مل کر ایک کمرے میں رہ رہے تھے مگر اب یہ ممکن نہ تھا کیونکہ ملازمت کی جگہ وہاں سے بہت دور پڑتی تھی۔

آخر نصیب نے بر آوری کی اور دفتر کے کچھ قریب ایک متوسط سے علاقے میں دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر مل گیا۔ کرایہ بھی مناسب ہی تھا اور مجھ پر کون سی ذمہ داریاں تھیں جو میں فکرمند رہتا۔ گاؤں جانا بہت ہی کم رہتا تھا کہ شہر کی مصروف زندگی نے میری ذاتی زندگی تک جڑیں گاڑ رکھی تھیں۔ یہ علاقہ اور خاص طور پہ وہ محلہ جہاں میری رہائش تھی، مجھے پرسکون اور اچھا لگا۔ میں شروع سے ہی اپنی ذات سے مانوس انسان تھا، اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر دوسروں کی ذاتی زندگی میں دخل دینا میرا وطیرہ نہ تھا اور نہ میں دوسروں کو اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لیں۔

اہلِ محلہ سے شناسائی کا عمل سست روی سے جاری تھا، یوں جیسے ٹرین اپنا سٹیشن چھوڑنے سے پہلے جیل وجحت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ میری طبیعت کی سستی یہاں بھی آڑے آ گئی۔ سامنے والے گھر میں دو بوڑھے میاں بیوی اپنے دو عدد شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے، وہ گزشتہ بیس سال سے یہاں رہ رہے تھے۔ میرے دائیں ہاتھ کے مکان میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا رہتا تھا جو ابھی کچھ ہی ماہ پہلے رہائش کے لئے آیا تھا اور بائیں جانب والے مکان میں میری مالک مکان اپنی دو عدد بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ ایک سلجھی ہوئی سلیقہ مند خاتون تھیں۔ بیوہ تھیں اور ایک بیٹی کی شادی کر چکی تھیں، دوسری بیٹی کی شادی ایک ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

یہ چند قیمتی معلومات مجھے اپنے سامنے رہائش اختیار کئے ہوئے بوڑھے میاں بیوی کے چھوٹے بیٹے اختر مراد نے بتائی تھیں جس سے آتے جاتے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی اور اب یہ ملاقات شناسائی میں بدل چکی تھی۔ باقی گھروں سے اپنی آشنائی میں ابھی کافی وقت درکار تھا سو جلدی مجھے بھی نہیں تھی۔ میری تجسس سے دوری کی عادت نے یہاں بھی میری مدد کی۔

ایک دن دفتر جانے کے لئے جیسے ہی نکلا تو جلدی میں ہونے کی وجہ سے دروازے کو جلدی جلدی لاک کیا اور گلی کا موڑ مڑتے ہوئے کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سامنے دیکھا تو ایک خاتون زرق برق لباس میں ملبوس میک اپ کی تہوں میں خود کو چھپائے اپنے گرد دوپٹے کو اچھی طرح سے پھیلائے ہوئے تھیں مگر ان کا یہ پھیلاؤ بھی ان کی حالت کو چھپانے سے قاصر تھا، وہ "امید" سے تھیں۔ مجھے شرمندگی نے آن گھیرا اگر وہ ٹکرا کر گر جاتیں تو...... میں نے پشیمان لہجے میں ان سے معذرت کی اور انہیں گھر چھوڑنے کی درخواست کی (حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا) مگر انہوں نے نرمی سے میری درخواست رد کر دی اور معذرت بھی قبول کر لی جس کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ پتہ نہیں کون ہے؟ کبھی پہلے دیکھا نہیں۔ میرے ذہن میں ابھرتے سوالوں کو کسب کی خواہش نے زیادہ لفٹ نہ کرائی اور میں بس میں سوار ہو گیا، دفتر پہنچ کر اس کی دنیا کا ہو گیا۔

محلے میں رہتے تین ہفتے بیت چکے تھے۔ سب ملنسار تھے اور دوسروں کی زندگیوں میں زیادہ دخل بھی نہیں دیتے تھے۔ اسی رویے نے یہاں میرے قدم جمانے میں میری بہت مدد کی۔ آہستہ آہستہ تقریباً سبھی سے دعا سلام کے مراحل طے ہو گئے تھے مگر وہ خاتون کون تھیں اس کا کچھ پتہ نہ چلا اور اپنی طبع کے پیش نظر میں نے بھی دوسروں سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

رات پیٹ میں ہونے والی جلن نے مجھے گھر سے باہر جانے پر اکسایا۔ آج دفتر میں پارٹی تھی اور باہر کے کھانے! ایک تواتر سے کھاتے رہنے کی وجہ سے آج میری یہ حالت ہوئی تھی۔ حالانکہ حمیدہ آنٹی (میری کرائے دار) نے مجھے اگلے مہینے سے کھانا بنا کر بھیجنے کی درخواست بھی کی تھی جو میں نے دل و جان سے بظاہر کچھ جیل وجحت کے بعد قبول کر لی تھی۔ کچھ ٹھنڈا لینے کی غرض سے میں قریبی دکان پر گیا اور کچھ دیر باہر کی تازہ ہوا میں ٹہلتا رہا۔ واپسی پر ایک دکان کے پاس مجھے وہی خاتون دوبارہ دکھائی دیں، لباس کا شوخ انداز اور میک اپ کا وطیرہ وہی تھا، حالت بھی ویسی ہی تھی۔ مجھے ہمدردی محسوس ہوئی وہ سامان اٹھائے آہستگی سے رواں دواں تھیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ اس حالت اور حلیے میں ان کو رات کے اس پہر ایسی کیا مجبوری باہر کھینچ لائی تھی، کیا گھر میں کوئی مرد نہیں تھا؟

اپنی فطرت اور طبیعت کے برعکس آج پہلی بار مجھے تجسس کی حدوں سے چھوا تھا اور میں حیران رہ گیا کہ یہ

میں بھی کسی کی ذاتیات کے بارے میں سوچ سکتا ہوں لیکن انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی فطرت میں چھپی تجسس اور طلب کی عادت کو چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ کبھی نہ کبھی کسی بھی صورت میں ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ تقریباً ایک ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ یہاں سب سے ہی واقفیت ہو چکی تھی مگر خاتون کا کچھ بھی اتہ پتہ نہ تھا نہ کبھی کسی نے بات کی اور نہ ہی میں نے کسی سے پوچھا۔

حمیدہ آنٹی کی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا اور انہوں نے بڑے خلوص اور عزت سے مجھے آنے کا کہا مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ان جھمیلوں سے دور ہی رہا کرتا تھا۔ اگلے دن صبح آنٹی نے دفتر جاتے ہوئے مجھے دوبارہ یاد دہانی کرائی کہ مجھے رات کو ضرور آنا ہے اور رات کو اختر مراد نے مجھے پُرزور طریقے سے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ چونکہ حمیدہ آنٹی کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا سو بھی محلے دار بڑھ چڑھ کر ان کی مدد میں پیش پیش تھے سو مجھے بھی مروتاً انہیں جا کر پوچھنا پڑا کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ انہوں نے شفقت سے انکار کر دیا اور شادی میں آنے کا اصرار کیا۔

رات کو اختر مراد کے ہمراہ میں شادی میں جا پہنچا تقریباً سبھی مرد حضرات سے سلام دعا تھی۔ بہرحال تقریب اچھی رہی۔ حیرانگی کی بات تھی کہ وہ خاتون بھی وہیں موجود تھیں۔ ان کی حالت اور حالات وہی تھے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ باتوں باتوں میں مراد سے ان خاتون کا ذکر چھڑ گیا۔ میری فکر مندی اور حیرت دیکھ کر مراد قہقہہ مار کر ہنسا، بولا۔

''یار! تجھے تو چند ہفتوں کا ہی عرصہ ہوا ہے اسے یوں دیکھتے۔ ہمیں تو عادت ہو چکی ہے''۔

''عادت ہو چکی ہے، مطلب یہ عورت پاگل ہے کیا؟''

''نہیں یار پاگل نہیں ہے''۔

کمزور خاندان اور غریب

انسان ایسے بدقسمت ہوتے ہیں کہ یہ لوگ اونٹ پر بھی بیٹھے ہوں تو انہیں کتا کاٹ لیتا ہے اور ان کی جھونپڑی کو برف باری میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔ ہم مانیں یا نہ مانیں، ہم ڈھلوانوں پر بیٹھے ہوئے کمزور لوگ ہیں۔ آج دس ہزار میل دور بجلی گرتی ہے تو پوری دنیا ہماری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ جب تک ہم مضبوط نہیں ہوں گے، بھیک مانگنا بند نہیں کریں گے، اس وقت تک دنیا ہمیں چارفٹ کے گز سے ماپتی رہے گی۔

(دستگیر شہزاد)

''پھر؟''

''خواجہ سرا ہے بے چارہ''۔ میرے کانوں میں جیسے کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔ مراد بولتا رہا۔

''حمیدہ آنٹی نے بتایا تھا کہ بے چاری کو شادی اور اولاد کی بہت خواہش تھی 'بے چارہ'...... 'بے چاری' کہتی ہے کہ اولاد سے عورت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ تکمیل کی خواہش نے اس کی یہ حالت کر دی ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد اسی حلیے میں نظر آتی ہے اور اس کا برتاؤ اور اطوار بھی بدل جاتے ہیں۔

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہا تھا۔ تکمیل کی خواہش، ذات کی تکمیل، مرد کی فضیلت، عورت کا مرتبہ، ماں کا رتبہ، ماں بننے کی خواہش، تکمیل کی خواہش، تکمیل کی طلب۔

''ہم اپنے اپنے ادھورے پن میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی ہماری طرح مکمل ہونے کی طلب میں زندگی گزار رہا ہے''۔

***

روایات اور موضوع احادیث

ہم نے ماہ مارچ میں اعلان کیا تھا کہ بحث کے اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جائے گا مگر محترم شہزاد احمد کے خیال میں یہ جانبداری ہے اور ان کا جوابی مضمون ضرور شائع ہونا چاہیے۔ ادارہ کی یہ واضح پالیسی ہے کہ تمام کہانیاں اور مضامین غیر جانبداری اور نیک نیتی سے شائع کیے جاتے ہیں اور ادارہ کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی کسی کی دل آزاری مقصود ہے۔

☆ شہزاد احمد

مجاہد ادیب صاحب نے نومبر 2014ء میں اپنے مضمون میں دو باتوں کا ذکر کیا تھا: (1) روایات کا ضعیف ہونا اور (2) روایات کا موضوع ہونا۔ ان میں سے ضعیف روایات کے بارے میں موصوف کے ریمارکس تھے۔ "ضعیف کا مطلب کمزور، ضعیف حدیث کمزور بات۔ ایسی حدیث معتبر نہیں ہوتی"۔ جب میں نے شمارہ جنوری 2015ء میں ثابت کیا کہ "فضائل میں باجماع محدثین ضعیف حدیث لائق اعتبار ہوتی ہے"۔ تو الحمدللہ مجاہد صاحب نے شمارہ مارچ 2015ء میں اس بات کا اعتراف کر لیا کہ "یہ درست ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کی اجازت دی گئی ہے"۔ لیکن ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ ضعیف حدیث پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

جناب! میں نے اپنے مضمون میں یہ کہاں دعویٰ کیا تھا کہ ضعیف حدیث پر عقیدہ کی بنیاد رکھو جو یہ تیغ لگانے کی ضرورت پیش آئی؟

(یہ تیغ آپ کے لیے نہیں ان لوگوں کے لیے لگائی جو اس کا علم نہیں رکھتے اور اسی بات پر عقیدے کی بنیاد بھی رکھ سکتے ہیں — ادارہ)

رہ گئی موضوع روایات تو جب تک باتفاق محدثین کسی روایت کا موضوع ہونا ثابت نہ ہو ہم کسی روایت کو موضوع نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر ایک حدیث دو یا تین طریق سے مروی ہو اور وہ ایک یا دو طریق سے موضوع ہو اور باقی طریق سے صحیح تو ایسی روایت کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ ٹھیک ہے کہ یہ بعض طریق سے موضوع ہے مگر فلاں طریق سے ایسا کوئی راوی نہیں جو متہم بالکذب اور متروک ہو لہٰذا ایسی روایت کو موضوع علی الاطلاق ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے ابن جوزی جیسے کڑے نقاد کی بیان کردہ بعض موضوع روایات کو موضوع ماننے سے

انکار کیا ہے جسے شمارہ مارچ 2015ء کے ص 105 پر موصوف بھی تسلیم کر چکے لیکن حسب عادت اس اعتراف کے متصل ہی موصوف نے قلابازی کھائی اور ایک خود ساختہ من گھڑت قاعدہ لکھ مارا۔

لکھتے ہیں۔ ''اس کے باوجود کسی ضعیف اور کمزور روایت کا موضوع قرار دیا جانا جب کہ اس کے موضوع ہونے کا قوی امکان موجود ہو اتنا بڑا معاملہ نہیں جتنا کہ کسی موضوع روایت کو درست قرار دے کر نبی معصوم کی طرف منسوب کر کے اس پر عقیدہ وعمل کی بنیاد رکھ لینا''۔

مجاہد صاحب! پہلی بات کہ یہ قاعدہ کس محدث کا ہے؟ دوسری بات امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ جیسی ہستی آپ کے اس قاعدہ سے کیوں بے خبر رہے کہ علامہ ابن جوزی جیسے محدث کی تنقید کو خاطر میں نہ لائے اور قوی امکان تو ایک طرف حسن روایات کو صراحتاً موضوع قرار دیا تھا اُن کو بھی موضوع نہ مانا۔ کیا امام صاحب معیار ثبوت سے باخبر نہ تھے؟

تیسری بات کہ اگر روایت کو موضوع قرار دینا اتنا آسان ہوتا تو محدثین بے شمار اقسام حدیث کیوں بیان کرتے۔ سیدھا سیدھا کہہ دیتے کہ جو حدیث صحیح کی شرائط پر پوری نہ اترے وہ موضوع ہے لیکن حدیث کی وہ اصطلاحات جن کو آپ نے اپنے انداز میں نقل کیا ہے اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ کسی حدیث کو رد کرنے کے لئے بیسیوں مرتبہ سوچنا پڑے گا اور حسب مراتب اُن سے استفادہ کیا جائے گا۔ لہٰذا مجاہد صاحب! ایک طرف آپ اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں، دوسری طرف آپ اجماع محدثین کے خلاف بات کرتے ہیں یہ دوغلی پالیسی آپ کو زیب نہیں دیتی۔

تو جس طرح مراتب حدیث کو پرکھنے کے لئے ہم اصطلاح محدثین کے محتاج ہیں اسی طرح کسی روایت کے موضوع ہونے میں بھی محدثین کے فیصلوں کے محتاج ہیں۔ شمارہ مارچ 2015ء کا مضمون موصوف کا دیکھیں کیا مجال ہے کہ کسی اکابر محدث کے حوالے سے کسی ایک روایت خصوصاً بخاری ومسلم شریف کی روایت کا موضوع ہونا بیان کیا ہو۔ شمارہ نومبر 2014ء میں حدیث قرطاس کو بغیر کسی حوالے کے منکر کہہ دیا اور شمارہ مارچ 2015ء میں بغیر کسی حوالے کے مرسل کہہ دیا اور اس سے پہلے اس روایت کو جھوٹی کہہ دیا۔

جھوٹے شخص کی یہی خامی ہوتی ہے وہ اپنا کہا بھی بھول جاتا ہے اور جو نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحیح ترین روایت کو جھوٹا قرار دے کسی اکابر محدث کے حوالے سے اس کا موضوع ہونا بیان نہ کرے۔ اس کی بدبختی کا کیا کہنا۔

مجاہد صاحب! آپ کے علم میں اضافہ کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ منکر اور مرسل بھی موضوع ہرگز نہیں ہوتی۔ ثبوت حاضر ہے۔ امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

''منکر ضعیف کی قسم ہے اور یہ فضائل میں قابل استدلال ہے''۔ (التعقبات علی الموضوعات) اور اللآلی المصنوعہ میں فرمایا۔ ''یہ مرسل اُس حدیث ابن عباس کی مؤید ہو کر اسے قسم مقبول میں داخل کرے گی''۔ یعنی مرسل خود تو معتبر ہے ہی بلکہ اپنے سے کمزور روایت کو بھی تقویت دیتی ہے۔ لہٰذا اگر تھوڑی دیر کے لئے آپ کی اس غلط بات کو بھی مان لیں تو بھی اس حدیث کے حجت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور (اگر یہ روایت من گھڑت یا جھوٹی ہوتی تو آپ اس کا کسی اکابر محدث سے موضوع ہونا ثابت کرتے لیکن چونکہ ایسا ممکن نہیں تھا اس لئے تمام محدثین و اکابرین امت، آئمہ مجتہدین کے مقابلے میں آپ نے امام زہری جیسی ہستی کی کردار کشی کرنے کی سعی لاحاصل فرمائی اور وہ بھی ایسے شخص کی پیروی میں جو خود منکر حدیث غلام احمد پرویز کا دستِ

راست تھا۔ میری مراد آپ کے تمنا عمادی صاحب اور ان کے معتقد حبیب الرحمٰن کاندھلوی ہیں۔ لہٰذا ان کا مختصر تعارف پیش کر دوں تاکہ قارئین کو اصل معاملہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

تمنا عمادی حقیقت میں منکر حدیث ہے اس کی ایک کتاب ''انتظار مہدی و مسیح'' کے ص 165 پر بخاری شریف کے بارے میں لکھا کہ ''نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بخاری کی دو حدیثوں کو میں ہمیشہ سے موضوع و مکذوب یعنی گھڑی ہوئی اور جھوٹی سمجھتا رہا ہوں''۔

حالانکہ یہ ہم اہلسنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور امام مہدی ضرور تشریف لائیں گے۔ پوری امت میں اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ مسلمان کا بچہ بچہ اس بات کو جانتا اور مانتا ہے۔

پھر تمنا عمادی منکر حدیث نے امام اوزاعی جیسے جلیل القدر محدث اور امام زہری جیسے ذی شان محدث سے تو اپنی خصوصی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ بعض جگہوں پر انکار حدیث کے لئے صراحتاً لکھ مارا کہ یہ موطا امام مالک اور بخاری و مسلم میں نہیں ہے یعنی ان تین کتابوں میں موجود نہ ہونے والی حدیث قابل رد ہے۔ یہ کہہ کر ابوداؤد کی حدیث کا رد کیا لیکن جب تمنا عمادی منکر حدیث کی سمجھ میں بخاری و مسلم کی حدیثیں بھی نہ آئیں تو اسماء الرجال کا نام لے کر انہیں بھی رد کر دیا۔

اسی کتاب کے ص 66 پر امام مہدی کی تشریف آوری کا انکار کرنے میں اتنے غصے میں آئے کہ صحاح ستہ کی مشہور کتاب ابوداؤد کی حدیث سے جہاں ضمناً ہی امام مہدی کی خلافت کا بیان تھا وہاں امام ابوداؤد اور ان کے اساتذہ پر گرجتا برسنا شروع کر دیا۔

پوری کتاب انکار حدیث کے اسی انداز میں بھری پڑی ہے۔

یہی حال تمنا عمادی منکر حدیث کے معتقد حبیب الرحمٰن کاندھلوی مصنف ''مذہبی داستانیں'' کا ہے۔ جس کے تیسرے حصے میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں جو حدیث نظر آئی اس کا رد کیا۔ اس کے راویوں پر جرح وقدح کی، جس طرح ہو سکا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان کا انکار کیا۔ حتیٰ کہ ''میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے'' کا بھی انکار کیا۔

محترم قارئین! کسی عمارت کو گرانا ہو تو اس کی بنیاد کو کمزور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب منکرین حدیث نے دیکھا کہ 1400 سال سے امت قرآن و حدیث پر عمل کرتی آ رہی ہے تو قرآن کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ ایک نقطے کی بھی کمی بیشی نہ ہے، نہ ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی۔ لہٰذا ان کو پارہ پارہ کرنے کے لئے حدیث پاک پر طبع آزمائی ہو سکتی ہے اور احادیث مبارکہ کی بیسیوں کتب میں بخاری و مسلم کا بہت مقام ہے اور بخاری شریف کی 1/3 تقریباً روایات امام زہری جیسی ذیشان ہستی سے مروی ہیں۔ لہٰذا منکر حدیث تمنا عمادی نے امام زہری کو سب سے پہلے تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح امام طبری جیسی ہستی کی ''تفسیر طبری'' تمام تفاسیر کا ماخذ ہے تو تفاسیر اکابرین امت کو مشکوک بنانے کے لئے امام طبری جیسی ہستی کو شیعہ قرار دے دیا۔ حالانکہ اہلسنت والجماعت کے طبری کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ محمد بن جریر بن یزید طبری اور شیعوں کے محمد بن جریر بن رستم طبری ہیں اور شیعہ حضرات خود بھی معترف ہیں کہ ان کے محمد بن جریر بن رستم طبری الگ شخصیت ہیں۔

منکر حدیث تمنا عمادی نے امام طبری اور امام زہری کی کردار کشی کی اور کہہ دیا کہ طبری دو کی بجائے ایک ہے تاکہ عمارت دین کو گرانے میں آسانی ہو اور اس میں وہ کامیاب بھی جزوی طور پر رہے کہ مجاہد ادیب جیسا بندہ

بھی اُن کے دام میں آ گیا اور تمنا عمادی اور حبیب الرحمن کی جانشینی کا حق ادا کرنے لگا۔ وگرنہ جس اسماء الرجال کی کتاب سے امام زہری کی شان ظاہر ہو رہی تھی اسے کیوں چھپاتے۔

تہذیب التہذیب میں علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ میں نے ایوب کو کہتے سنا میں نے زہری سے زیادہ جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ تو ان سے صخر بن جویریہ نے کہا کہ حسن کو بھی نہیں تو انہوں نے جواب دیا میں نے زہری سے زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا۔

اب مجاہد صاحب کے نزدیک متفق علیہ روایت اگر من گھڑت ہے اور اس کو ماننا جہنمی ہونے کے مترادف ہے تو سینکڑوں سال کے صحابہ و تابعین و محدثین و صلحاء کرام کو معاذ اللہ جہنمی قرار دینے سے زیادہ بہتر یہ نہیں کہ مجاہد صاحب اپنے آپ کو اپنے گرو گھنٹال منکر حدیث تمنا عمادی اور حبیب الرحمن کا ندھلوی سمیت سدھار لیں۔

یقیناً آپ کو حدیث قرطاس کے متفق علیہ ہونے کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ افسوس کہ آپ کی عمارت بھی آپ کی بنیاد کی طرح انتہائی پھسپھسی ہی نکلی۔

نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نفی سایہ والی روایت میں ہم نے لغت اور اکابرین امت کے جو حوالے دیئے تھے انہیں مجاہد صاحب نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور اس امر کو متنازعہ قرار دے کر جان چھڑائی ہے۔ ذرا دو چار اکابرین کے نام تو ذکر کیے ہوتے جو حضور پُر نور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ کے قائل ہیں یا ساری شریعت کو اپنی سمجھ کے مطابق کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ حدیث معراج میں میں نے اپنا واضح موقف پیش کیا تھا کہ "نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جسمانی معراج کے علاوہ کثیر تعداد میں روحانی معراج بھی ہوئی ہیں اور مذکورہ روایت روحانی معراج پر دلالت کرتی ہے"۔

جس کے جواب میں "مذہبی داستان" کے حوالے

سے لکھتے ہیں کہ یہ روحانی معراج والی روایت کے راویوں کو امام ذہبی، بخاری، نسائی، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین ضعیف قرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! اگر امام بخاری اور علی بن المدینی امام زہری سے روایت لیں تو من گھڑت اور اپنی مطلب براری کے لئے انہی کا حوالہ؟
پھر ساتھ ہی لکھ دیا کہ روحانی معراج کا کوئی بھی منکر نہیں۔ بندہ خدا جب روحانی معراج کا کوئی منکر نہیں تو راوی کو ضعیف قرار دینے کا کیا فائدہ ہوا لیکن اتنا تو ہوا کہ جسمانی معراج کے ساتھ ساتھ روحانی معراج کے آپ قائل ہو گئے اور یہی ہمارا دعویٰ تھا جو آپ نے الٹا سیدھا ہو کر مان لیا۔

اپنے مضمون میں مجاہد صاحب نے احادیث مبارکہ میں دجل و تلبیس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ و تفسیر میں بھی خیانت کی ہے کیونکہ مجاہد صاحب کو پتہ تھا کہ امت کی اکثریت اور اکابرین امت کو ماننے سے یہ ہنڈیا چولہے پر نہیں چڑھے گی لہٰذا آیت کی غلط تاویل کر کے اقلیت کا حق پر ہونا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور حسب عادت کسی تفسیر معتبر کا حوالہ نقل نہیں کیا۔ موصوف کا کیا ہوا ترجمہ درج ذیل ہے۔
"اگر تم اکثریت کے پیچھے چلو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے"۔ (انعام:117)

درست ترجمہ یہ ہے اور (اے مخاطب) اگر تو کہا مانے اکثر لوگوں (کفار) کا جو زمین میں ہیں تو تجھے بہکا دیں گے۔ کیونکہ آیت میں من فی الارض کے الفاظ ہیں جن کا مطلب ہے جو زمین میں ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ شریف میں چند مسلمانوں کے مقابلے میں پوری دنیا کفر میں ہی ڈوبی ہوئی تھی بلکہ آج بھی مسلمان کفر کے مقابلے میں قلیل ہی ہیں۔ لہٰذا آیت میں تقابل تو کفر سے تھا اور ہمارے نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو یہ فرمایا تھا کہ "میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی"۔ یا "بڑے گروہ کی پیروی کرو جو ان سے جدا ہوا جدا ہی جہنم میں جائے گا"۔ یا "میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے"۔ (مشکوٰۃ)

تو ان سب روایتوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کا نام لیں گے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلائیں گے خواہ وہ اسلام کی آڑ میں ختم نبوت کے منکر ہوں یا حدیث نبی کے منکر ہوں تفسیر مظہری، تفسیر جلالین، تفسیر روح البیان سب نے اس آیت میں کفار کی کثرت ہی مراد لی ہے ورنہ مدینہ شریف میں صحابہ کرام زیادہ تھے اور منافقین کم۔ تو کیا مجاہد صاحب منافقین کو معاذ اللہ حق پر مانیں گے یا روافض کو یا قادیانیوں یا پرویزیوں کو جو قلیل ہیں۔ تو اگر آپ کہیں "نہیں" تو پھر آپ کی وہ منطق کہاں گئی جس کا آپ نے دعویٰ کیا تھا اور اگر کہیں "ہاں" تو آپ کو ان کا ساتھ مبارک ہو اور ہمیں بزرگان دین کا ساتھ مبارک۔

میری تمام قارئین سے التجا ہے کہ اپنے ہر مسئلے میں اکابرین علماء، محدثین، فقہائے کرام، اولیاء کرام اور مفسرین کی پیروی کریں۔ جس مسئلے میں تردد ہو تو امت کی اکثریت اور اکابرین امت کے عمل کو مشعل راہ بنایئے کیونکہ ہمارا دین ہمیں کڑی در کڑی کے ساتھ پہنچا ہے کسی ایک کڑی پر عدم اعتماد ہمارا تعلق نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توڑ دے گا۔

اسی لئے بدمذہب ہمیشہ ان کڑیوں پر ہی وار کرتا ہے اور قرآن پاک نے بھی ہمیں اسی کی ترغیب دی ہے کہ "چلا اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا انعام ہوا"۔ اللہ پاک ہمارا خاتمہ حضور پرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ پاک سے ایمان بالعافیت فرمائے۔ آمین!

●●●

تاریخی ناول

قسط: 9

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلانی بیگم

رفیق ڈوگر

شاہجہان آباد کے گلیوں اور بازاروں میں افغان فوجی اپنے کچھ ساتھیوں کو ہانکتے ہوئے گلی گلی لئے پھرتے تھے۔ ان کے کان کٹے ہوئے تھے، نتھنوں میں سے لوہے کے تیر گزار کر ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے قلعہ میں نزول کے ساتھ ہی اہل شاہجہان آباد کو امن اور حفاظت دینے کا اعلان کروا دیا تھا۔

"افغان فوج کے سپاہی اور سردار کسی کو تنگ اور ہراساں نہیں کریں گے، کسی کے گھر اور مکان میں داخل نہیں ہوں گے، کسی مکان کو آگ نہیں لگائیں گے، کسی کو قید اور گرفتار نہیں کریں گے، کسی عورت یا لڑکی سے اس کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں کریں گے، جو کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا یا ان احکامات کی خلاف ورزی کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی"۔

بادشاہ کے ذاتی محافظ دستہ کے کماندار نے شہر کے دروازوں میں اپنے سپاہی متعین کر دیئے تھے تاکہ افغان فوجیوں کی نگرانی کریں۔ اہل شاہجہان آباد بادشاہ معظم کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے افغان مجرموں کا تماشا کر رہے تھے۔ سپاہی ان مجرموں کو لے کر جدھر سے گزرتے تھے لوگ خوشی سے ان کا استقبال کرتے۔ احمد شاہ ابدالی کے جلوس کے ورود کے وقت جو شہر ویران دکھائی دیتا اس میں زندگی استوار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ملک سجاول کان کٹے سپاہیوں کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے رکے اور سر جھکا کے آگے چل دیئے۔

ملک قاسم ان کا دکھ جان نہیں سکا تھا پھر بھی اس نے سر جھکا دیا۔

وہ قلعہ معلیٰ جا رہے تھے، شہنشاہ ہند عالمگیر ثانی نے اپنے معزز مہمان کے اعزاز میں دربار شہنشاہی منعقد کرنے کا اہتمام فرمایا تھا۔

سورج تیسری منزل میں داخل ہوا تو شاہجہان آباد کے امراء کی سواریاں اور پالکیاں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ افغان سردار اور فوجی بانکی سواروں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران ہونے لگے۔ انہیں دیکھ کر احساس نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے شہر کے باسی ہیں جس پر ایک بیرونی فوج کا قبضہ ہے یا وہ کسی ایسے شہنشاہ کے درباری ہیں جس کی شہنشاہیت اس کے اپنے محل میں بھی مکمل طور پر نافذ نہیں۔ یہی وہ امراء اور درباری ہیں جن کی دانش سلطنت ہندوستان کا تحفظ کرے گی۔ افغان فوجیوں نے اپنے بادشاہ کے دربار اور درباریوں میں کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا، ان کے ذہنوں میں شاہجہان آباد کی دولت اور امارت کے قصے تازہ ہو گئے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب فہم کے اور بھی قریب آ گئے۔

قلعہ معلیٰ کے دیوان عام میں شاہی نشست گاہ کے سامنے امراء اور درباری اپنے اپنے مقام اور مرتبہ کے مطابق زرق برق لباس پہنے بیٹھے تھے اور سنہری وردیاں پہنے خدام قطار در قطار کھڑے تھے۔ نقیب نے شہنشاہ ہند اور بادشاہ کابل و قندھار کی آمد کا اعلان کیا تو سب نگاہیں پیوست فرش ہو گئیں۔ دونوں شاہ اپنی اپنی نشست خاص پر تشریف فرما ہو چکے تو انہوں نے سر اٹھائے اور چوبدار کے اشارے پر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

شہنشاہ ہند کی اجازت سے دربار کی کارروائی شروع ہوئی اور شہنشاہ اور اہل ہند کی طرف سے افغان بادشاہ کے قلعہ معلیٰ میں ورود مسعود پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ان کی آمد کو اہل ہندوستان خاص طور پر مسلمانان ہند کی خوش بختی قرار دیا گیا اور ایک بار پھر باہمی برادرانہ تعلقات کے استحکام کے لئے تعاون اور مشاورت کو لازم قرار دیا گیا۔

افغان بادشاہ خاموش بیٹھے ان پُر تکلف الفاظ و القابات کے مفہوم اور معانی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کے نقیب خاص نے اس مرصع اور

پُرشکوہ خطبہ استقبالیہ کا بڑے سادہ الفاظ میں جواب دیا اور شہنشاہ ہندوستان کی مہمان نوازی کو سراہتے ہوئے بادشاہ کابل وقندھار کی طرف سے مسلمانانِ ہند کے وجود اور مفاد کے تحفظ میں ہر مدد کا یقین دلایا۔ شاہجہاں آباد کی طرف سے طے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس نے شاہجہان آباد کے علماء اور امراء کے ان خطوط کا بھی حوالہ دیا جو انہوں نے افغان بادشاہ کو لکھے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے خان خاناں انتظام الدولہ کو ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کا خلعت پیش کیا گیا اور عبدالاحد خاں کو خالصہ دیوان مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا صرف خاص کی پیش کاری بابو جعفر خاں کے سپرد کی گئی۔

دونوں بادشاہوں میں تحائف کے تبادلہ کے بعد دربار عام تکمیل کو پہنچ گیا۔

✽✽✽

نجیب الدولہ اور ظفر خاں نے شاہجہان آباد میں نظم مستحکم کر دیا تو متھرا کی طرف بھاگ گئے ہندو ساہوکار بھی واپس آنا شروع ہو گئے۔ آمد و رفت کی سہولت کے لئے احمد شاہ ابدالی کے حکم سے دریائے جمنا پر پل ڈال دیا گیا تو زندگی اپنے معمولات پر رواں ہونا شروع ہو گئی۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی اطلاع پر بھرت پور کے جاٹ راجہ سورج مل نے عماد الملک کو مشورہ دیا تھا کہ جاٹ راجپوت اور مغل فوجیں مل کر افغان بادشاہ کا مقابلہ کریں۔ عماد اللہ کشمیری نے اسے مرہٹوں سے مدد طلب کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر عماد الملک کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے۔ سورج مل جاٹ مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو اپنے لئے خطرہ سمجھتا اور عماد الملک کو مرہٹوں کی طرف مائل دیکھ کر واپس چلا گیا تھا لیکن جب احمد شاہ ابدالی شاہجہان آباد میں داخل ہو گیا اور اس نے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں شروع کر دیں تو جاٹ اور مرہٹے متحد ہو گئے اور سورج مل کی فوجوں نے افغان دستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ شاہ عالمگیر ثانی نے دارالحکومت کے دروازوں پر جاٹوں کی دستک سے خوفزدہ ہو کر احمد شاہ ابدالی سے سورج مل کے خلاف فوج کشی کی درخواست کی تو نئی مہم کی تیاری کی وجہ سے شاہجہان آباد میں افغان فوجوں کا قیام طویل ہو گیا۔ ابدالی کا فوجی خرچ بڑھ گیا، شہنشاہ عالمگیر کے پاس افغان فوجوں کے اخراجات ادا کرنے کے لئے خزانہ میں رقم نہیں تھی۔ ابدالی کو دو کروڑ روپیہ ادا کرنے کے لئے بھی اس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ عبدالاحد خان کے ذریعے اس نے احمد شاہ ابدالی کو پیغام بھجوایا کہ عماد الملک اپنے دور وزارت میں جو سرکاری روپیہ اپنے گھر لے گیا تھا وہ اس سے واپس دلایا جائے تاکہ اخراجات پورے کئے جا سکیں۔ عبدالاحد خاں نے جہان خان کے ذریعے احمد شاہ ابدالی کو یہ بھی بتایا کہ وزیراعظم انتظام الدولہ کے والد نواب قمر الدین بھی اپنے دور میں بہت سا سرکاری روپیہ اور سونا چاندی اپنے گھر لے گئے تھے اور یہ کروڑوں روپیہ اور سونا چاندی انتظام الدولہ کی حویلی میں چھپایا گیا ہے۔ ابدالی خان خاناں انتظام الدولہ کو حکم دیں کہ وہ یہ روپیہ اور سونا چاندی بھی شاہی خزانہ میں جمع کرا دیں تاکہ افغان فوجوں کے اخراجات اور دو کروڑ تاوان ادا کئے جا سکیں۔

شاہجہان آباد کے امراء نے بھی اپنے خطوط میں لکھا تھا کہ وزیراعظم سلطنت کی آمدنی سلطنت کے استحکام پر خرچ کرنے کی بجائے اپنے گھر میں جمع کر رہے ہیں۔ مغلانی بیگم نے اپنی ساس کے خفیہ خزانوں کا ذکر کر کے ابدالی کو شاہجہان آباد کے سفر کی دعوت دی تھی۔ عالمگیر ثانی کی طرف سے اس تصدیق اور درخواست کے بعد ابدالی نے عماد الملک اور خان خاناں سے روپیہ اور سونا چاندی واپس لینے کا فیصلہ کر لیا اور ان سے روپیہ، سونا،

چاندی اور زر و جواہر وصول کر کے شاہی خزانہ میں جمع کرانے پر مغلانی بیگم کے ماموں نواب زکریا خان لاہوری کے فرزند میر یحییٰ خان درویش کو مقرر کیا۔ درویش پر ابدالی اعتماد رکھتا تھا اور عمادالملک اور انتظام الدولہ سے اس کا خونی رشتہ تھا۔

''اس حویلی میں اتنا روپیہ اور زر و جواہر ہوتے تو ہم فوج تیار کر کے ابدالی کا مقابلہ کر سکتے تھے اور انہیں دو کروڑ روپیہ تاوان ادا کر کے واپس جانے پر آمادہ کر سکتے تھے''۔ عمادالملک نے درویش کو جواب دیا۔

''بادشاہ معظم نے آپ پر کرم کیا، آپ کو معاف فرمایا۔ خواہر محترمہ مغلانی بیگم پسند نہیں کریں گی کہ آپ پر سختی کی جائے''۔ درویش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بادشاہ معظم کو ہمارے بارے میں غلط اطلاع دی گئی ہے، ہم ان کے کرم کے لئے مشکور ہیں اور روپے کا مطالبہ پورا کرنے سے معذور ہیں''۔ عمادالملک نے جواب دیا۔

درویش نے سردار جہان خان کو عمادالملک کے جواب اور اپنی ناکامی سے آگاہ کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ شاہ ولی خان بیگم کے احترام اور عمادالملک سے تعلق کی بناء پر وصولی میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔ جہان خان فوج کے ایک دستہ کے ساتھ عمادالملک کی حویلی پہنچ گیا۔ ڈیوڑھی کے کمانڈار کو دروازہ کھولنے اور عمادالملک کو پیش کرنے کا حکم دیا تو افغان جرنیل کے انداز پہچان کر عمادالملک نے پچاس لاکھ روپے کی اشرفیاں اور ایک کروڑ روپیہ مالیت کے جواہر پیش کر دیئے۔ جہان خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ''بادشاہ معظم کی دختر مغلانی بیگم صاحبہ کے احترام میں ہم مزید کچھ نہیں مانگتے ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ مغل خزانہ کا بہت سا روپیہ اور جواہر اب بھی آپ کے ذاتی خزانہ میں موجود ہیں''۔

عمادالملک نے سر جھکا دیا۔ ''افغان سردار کو ہم پر اعتماد کرنا چاہئے''۔

''حضور بار بار ثابت کر چکے ہیں کہ آپ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ معظم کے حکم پر آپ خود یہ روپیہ اور جواہر پیش کر دیتے تو بادشاہ معظم خوش ہوتے''۔

جہان خان نے روپیہ اور جواہر احمد شاہ ابدالی کو پیش کر دیئے تو بادشاہ نے انتظام الدولہ سے وصولی بھی اس کے ذمہ لگا دی۔ جہان خان فوجی تھا، شاہ ولی خان کی مانند مصلحت اور تعلق کو بادشاہ کے حکم پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔ اس نے وزیراعظم ہندوستان انتظام الدولہ کو حکم دیا کہ اس کے اجداد نے شاہی خزانہ سے جو کچھ چرا کر اپنی حویلی میں جمع کر رکھا ہے نکال کر پیش کر دیا جائے انتظام الدولہ نے دو ہی روز پہلے احمد شاہ ابدالی سے دربار عام میں خلعت اور سند وزارت پائے تھے۔ وہ اپنے مقام و مرتبہ سے آگاہ تھا مگر افغان جرنیل کے مزاج سے آگاہ نہ تھا۔ ''آپ ہمارے کرم فرما بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کے جرنیل اور ہمارے گھر میں معزز مہمان ہیں ہمارے دل میں بادشاہ کابل و قندھار کا بے حد احترام ہے ورنہ ہم اس طرز گفتگو کے عادی نہیں''۔ خان خاناں نے جواب دیا۔

جہان خان نے مسکرا کر کہا۔ ''اس طرز گفتگو کے بعد وزیراعظم ہندوستان کو ہمارا مطلب اور ارادہ سمجھنے میں غلطی نہیں کرنا چاہئے''۔

''ہم اور ہمارے اجداد شاہی خزانہ سے چوری کے عادی ہوتے تو مغل شہنشاہ ان پر ہرگز اعتماد نہ کرتے''۔ خان خاناں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''اگر ہم اپنا حکم منوانے کے قائل نہ ہوتے تو ہمارے بادشاہ معظم بھی حضور سے شاہی خزانہ سے چرائے جواہرات اور روپیہ وصول کرنے کے بارے میں ہم پر اعتماد نہ کرتے''۔

''ہم بادشاہ معظم کے جرنیل محترم کو یقین دلاتے

ہیں کہ ہمارے بارے میں بادشاہ معظم کو غلط اطلاع دی گئی ہے اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم سے جو کچھ ہو سکا۔ جلد بادشاہ معظم کے حضور خود پیش کر دیں گے"۔ خان خاناں نے جہان خان کا انداز گفتگو دیکھتے ہوئے وعدہ کر لیا۔

"جہان خان نے اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ وزیر اعظم انتظام الدولہ کے خزانہ دار اور منتظم سے معلوم کریں کہ حویلی میں کتنا روپیہ اور جواہر ہیں اور کہاں رکھے گئے ہیں۔

افغان سرداروں نے انتظام الدولہ کے خزانہ دار اور حویلی کے منتظم کو بلا کر پوچھا تو اس نے بھی خزانہ کے بارے میں کچھ بتانے سے معذرت کر دی افغان فوجیوں نے کھڑے چابکوں سے ان کی پٹائی شروع کر دی۔ وزیر اعظم ہندوستان بے بسی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ مگر پٹائی کے باوجود خزانہ دار اور منتظم نے کچھ نہیں بتایا جہان خان بادشاہ معظم کے سپرد کردہ کسی مشن سے ناکام آنے کا عادی نہیں تھا مگر خاناں وزیر اعظم ہندوستان تھے۔ "بادشاہ معظم سے ہدایات لے کر کل ہم پھر آئیں گے اور خالی ہاتھ نہیں جائیں گے"۔ اس نے کہا اور رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

انتظام الدولہ اس توہین اور جہان خان کی دھمکی سے پریشان زنان خانہ کی طرف چل دیا۔

***

شیش محل کی نشست گاہ میں مغلانی بیگم کے سامنے عمادالملک مؤدب بیٹھا تھا۔ پردہ کے پیچھے سے خادمہ نے سرفراز خان کے لئے شرف باریابی کی اجازت چاہی تو مغلانی بیگم نے "اجازت ہے" کے انداز میں سر ہلایا عمادالملک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا سرفراز کمرے میں داخل ہوا اور آداب عرض کر کے بیگم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہم سمجھتے ہیں کوئی اہم اطلاع ہے جو مداخلت لازم ہو گئی"۔ مغلانی بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"حضور کا اندازہ درست ہے ورنہ خادم ایسی گستاخی کی کبھی جرأت نہ کرتا"۔ سرفراز خاں نے عرض کیا۔

"تاخیر سے اہم اطلاع غیر اہم ہو جائے گی"۔ بیگم کے چہرے پر سنجیدگی گہری ہو گئی۔

"اطلاع وزیر اعظم خان خاناں انتظام الدولہ سے متعلق ہے"۔ سرفراز خاں نے عمادالملک کی موجودگی کی وجہ سے کہا۔

"ہم چاہتے ہیں، عمادالملک بھی اس اطلاع سے باخبر ہوں"۔

"سردار جہان خان نے قلعہ معلی کے دیوان عام کے سامنے آہنی شکنجہ لگوانے کا حکم دیا ہے اور اپنے سرداروں سے کہا ہے کہ نواب خان خاناں کو اس پر جکڑ کر کوڑے مارے جائیں اور اس وقت تک نہ اتارا جائے جب تک وہ شاہی خزانہ کے زر و جواہر اور روپیہ واپس نہ کر دیں"۔

"ہم اس اطلاع پر یقین کر لیں؟" بیگم نے سرفراز خان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"خادم بلا تصدیق اطلاع دینے کی گستاخی نہیں کر سکتا"۔ سرفراز خان نے سر جھکا دیا۔

"خان خاناں انتظام الدولہ اس سے باخبر ہیں"۔ بیگم نے پوچھا۔

"وزیر اعظم دو روز سے قلعہ معلی نہیں گئے، جہان خان کے کیمپ سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے اس حکم سے آگاہ کر دیا گیا ہے"۔

"ڈیوڑھی میں ہمارے حکم کا انتظار کرو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

سرفراز خاں الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

مغلانی بیگم اس اطلاع پر پریشان ہو گئی جبکہ

عمادالملک خوش دکھائی دیتا تھا۔

"اس توہین کے بعد خان خاناں وزیراعظم ہندوستان نہیں رہ سکے گا"۔ عمادالملک نے خوشی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خان خاناں کی توہین کے بعد ہمارا کام اور بھی مشکل ہو جائے گا"۔ مغلانی بیگم نے پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "امراء اور درباری سوچیں گے اس میں ہمارا مشورہ شامل ہے"۔

"سب امراء اور درباریوں کو معلوم ہے خان خاناں کی حویلی میں خزانہ دفن ہے۔ شاہنشاہ نے خود بادشاہ معظم سے اس کی وصولی کی درخواست کی ہے"۔ عمادالملک اپنی بات پر قائم رہا۔

"اہل دربار اور افغان امراء جانتے ہیں کہ خان خاناں کا وزیراعظم بنایا جانا ہمیں پسند نہیں ان کی توہین پر یہ رائے ہو سکتی ہے کہ ہم نے تمہاری وجہ سے شاہ معظم اور سردار جہان خان کو ایسا مشورہ دیا ہے۔ اس سے تمہاری واپسی کے امکانات معدوم ہو سکتے ہیں"۔ بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بہت سے اہل دربار بھی خان خاناں کو وزیراعظم بنانے سے خوش نہیں خاص طور پر نجیب الدولہ اور شاہ ولی خان"۔ عمادالملک نے جواب دیا۔

"جو امراء نواب عمادالملک کے خلاف ہیں انہیں مخالفت کے لئے بہت وزنی دلیل میسر آ جائے گی"۔

مغلانی بیگم کے جواب پر عمادالملک خاموش ہو گیا۔

"ہم چاہتے ہیں تم بادشاہ معظم سے درخواست کرو کہ خان خاناں کی توہین نہ کی جائے اس سے بادشاہ معظم تمہارے بارے میں بہتر رائے قائم کریں گے اور امراء اور خان خاناں کی مخالفت میں بھی کمی آ جائے گی"۔ مغلانی بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہم مادر محترم کی دانش کے معترف ہیں اور ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں خوشی محسوس کریں گے لیکن ہم نہیں سمجھتے بادشاہ معظم ہماری درخواست پر حکم واپس لے سکتے ہیں"۔

"کامیابی کوشش سے ہوتی ہے، تم کوشش کرو خان خاناں کو توہین سے بچانے میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی تمہاری کوشش ہی نیک اعمال میں اضافہ کرے گی"۔

"حضور کے تعاون کے بغیر کوشش بھی محال نظر آتی ہے"۔

"ہم نہیں چاہتے تم ہمارے حوالہ سے بادشاہ معظم کے حضور عرضداشت پیش کرو، شاہ ولی خان تمہارے مددگار ہوں گے"۔ بیگم نے جواب دیا۔

عمادالملک سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ بیگم خاموش بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"حضور کے حکم کے مطابق آج ہی بادشاہ معظم کے حضور عرضداشت پیش کر دی جائے گی"۔ اس نے سر اٹھا کر بیگم کو جواب دیا۔

***

قلعہ معلٰی کی موتی مسجد کے امام نے دعا ختم کی تو عمال شاہی اور افغان سردار مصافحہ کے لئے حاضر ہونے لگے۔ منبری محراب میں تشریف فرما امام ایک سے ہاتھ ملاتے اور دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیتے۔ نمازی ایک ایک کر کے ہاتھ ملاتے اور جاتے رہے مگر جہان خان ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب چند نمازی رہ گئے تو وہ اٹھا اور سلام کہہ کر امام کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ "بادشاہ معظم نے حضور کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے"۔ اس نے امام سے کہا۔

"وعلیکم السلام، خدائے بزرگ و برتر بادشاہ معظم کو صحت و کامرانی عنایت فرمادے اور اسلام کی خدمت کا اجر عظیم دے"۔ امام نے سامنے کھڑے نمازی کی طرف

دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
"بادشاہ معظم کی خواہش ہے کہ آج رات حضور ان کے ساتھ کھانا تناول فرماویں"۔
"بادشاہ معظم کی دعوت قبول کرنا ہم پر واجب ہے"۔ امام نے جہان خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور چغہ سمیٹتے ہوئے اٹھنے کی تیاری کرنے لگا۔
جب وہ اپنے خدام اور جہان خان کے ہمراہ مسجد سے باہر آیا تو مسجد کے میناروں اور قلعہ کے برجوں پر صبح کا نور پھیل رہا تھا۔
دیوان عام کے سامنے کھلے میدان میں ہجوم دیکھ کر امام رک گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آنے والوں کے علاوہ قلعہ کے خدام افغان سپاہی اور بہت سے دیگر افراد وہاں جمع تھے۔ ہجوم کے درمیان میں لکڑی کے شکنجے پر ایک افغان سپاہی کو باندھ دیا گیا تھا اور ایک سپاہی پاس کوڑا لئے کھڑا تھا۔ ایک افغان سردار آگے بڑھا اور فرمان پڑھنا شروع کیا۔ "خدا کے اس مجرم نے جو شکنجے پر سزا کا منتظر ہے، بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شاہجہان آباد کے ایک ہندو ساہوکار سے دو صد اشرفیاں وصول کیں۔ اطلاع ملنے پر بادشاہ معظم نے معاملہ کی تحقیق کا حکم دیا اور الزام ثابت ہونے پر شاہ معظم نے دو صد اشرفیاں ساہوکار کو واپس دینے اور افغان فوج کے اس سردار کو کوڑے مارنے کا حکم جاری فرمایا ہے"۔
فرمان پڑھا جا چکا تو سپاہی نے شکنجے میں کسے سردار کو کوڑے مارنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخیں قلعہ معلی کے ایوانوں سے ٹکرا کر فضا میں گونجنے لگیں۔ کوڑے پورے ہو چکے تو امام آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس نے آج تک قلعہ معلی میں کسی مجرم کو کوڑے لگتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے خدام خاموش تھے، صبح کا نور سورج کی کرنوں کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کر رہا تھا۔ "ہمارے شہنشاہ نے کبھی کسی پر اتنا ظلم نہیں کیا"۔ ایک خادم نے امام کو خاموش پا کر آہستہ سے کہا۔
"ہمارے شہنشاہوں کے پاس اس طرح کے شکنجے اور کوڑے مارنے والے ہوتے تو آج قلعہ معلی اور محل سرا پر دوسرے قابض نہ ہوتے"۔ امام نے اس سے بھی آہستہ جواب دیا۔
شکنجے پر کسے افغان سردار کے زخموں سے شفاف فرش پر ٹپکنے والے خون سے مختلف شکلیں بن رہی تھیں۔ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھا۔ افغان سپاہی ارد گرد کھڑے تھے۔ "اس کے دونوں کان کاٹ دیئے جائیں اور کل سارا دن اسے شہر کے بازاروں میں گھمایا جائے"۔ فرمان پڑھنے والے نے انہیں حکم دیا۔
قلعہ معلی کے عمال اور خدام سراسیمہ تھے وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے منتشر ہونے لگے۔
"نواب خان خاناں انتظام الدولہ کو بھی اسی شکنجہ پر کسا جائے گا"۔ ڈیوڑھی میں ڈیوٹی والے ایک پہریدار نے ارد گرد دیکھ کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔
"اپنے اپنے مقدر کی بات ہے"۔ اس کا ساتھی مسکرایا۔ "ہوسکتا ہے خان خاناں بھی یہ اعزاز حاصل کر کے سلطنت کے لئے اپنا کچھ خون دے سکیں"۔
"خان خاناں کو بھی اسی طرح ماریں گے"۔ پہلے پہریدار نے حیرانی سے پوچھا۔
"اس افغان سردار نے تو صرف دو صد اشرفیاں وصول کی تھیں۔ ہمارے خان خاناں نے تو کہتے ہیں دو کروڑ سے بھی زیادہ کا مال چھپایا ہے اس سے حساب لگا لیں انہیں کتنے کوڑے کھانا پڑیں گے"۔
"یہ افغان تو بڑے ظالم معلوم ہوتے ہیں"۔
"ظالم نہ ہوتے تو ان کا بادشاہ بھی کسی دوسرے ملک کے بادشاہ سے سند حکمرانی حاصل کرتا پھرتا"۔ اس نے اسی لاپرواہی سے جواب دیا۔

اپنے کمانڈر کو آتا دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔

کمانڈر نے شب رفتہ کے پہریداروں سے رپورٹ حاصل کی دن کے پہرہ والوں کو ہدایات دیں اور اسلحہ خانہ کی پڑتال کے لئے چل دیا۔

"اب تو ہمارے کمانڈر روز اسلحہ چیک کرنے لگے ہیں"۔ پہریدار نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"جب سے خان خاناں کو شکنجے پر کسنے کی خبر پھیلی ہے سب حکام شاہی بڑے پابند اور کارے ہو گئے ہیں"۔

"افغان اچھا کریں تو جاتی دفعہ یہ شکنجہ یہیں چھوڑ جائیں"۔

"تاکہ آپ اس کی لکڑی سے کسی ٹھنڈی رات میں آگ تاپ سکیں"۔

وہ دونوں مسکرا دیئے۔

***

جب سورج کی روشنی شاہجہان آباد کی گلیوں اور بازاروں میں اتری تو اس نے گھر گھر سے خان خاناں کو شکنجے پر کسنے اور کوڑے مارنے کے فرمان شاہی کی خبر پائی۔ شاہجہان آباد کے باسیوں اور امراء اور حکام شاہی کے لئے یہ بہت حیران کن خبر تھی۔ انہوں نے آج تک کسی عام افسر کو ایسی سزا دینے کے شاہی حکم کے بارے میں بھی نہیں سنا تھا۔ خان خاناں وزیراعظم ابن وزیراعظم تھے جن کے نام کا ہندوستان کے طول و عرض میں خوف تھا اور وقت کا مغلیہ شہنشاہ بھی اس کے خاندان سے خوفزدہ رہتا تھا۔ بہت سے امراء اور درباری گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے جن امراء اور درباریوں نے مغلانی بیگم کے اغوا میں مشورہ دیا تھا یا ان کے اغوا میں حصہ لیا تھا ان کے خاندان اور اہل وعیال کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔

شاہ ولی خان اور نجیب الدولہ جاٹوں کے خلاف مہم پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کی درخواست پر مغلیہ سلطنت کے تحفظ کے لئے سورج مل کے خلاف لشکر کشی سے اتفاق تو کر لیا تھا مگر وہ موسم سرما کے ختم ہونے سے پہلے واپس قندھار جانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے سپاہی ہندوستان کے گرم موسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ نجیب الدولہ ہندوستان کے حالات سے بہتر طور پر واقف تھے اس کی رائے تھی کہ جب تک مرہٹوں کی قوت ختم نہیں ہو گی صرف جاٹوں کے خلاف لشکر کشی سے مغلیہ سلطنت کی حفاظت ممکن نہیں۔

"سورج مل کے خلاف فوج کشی سے بہتر ہوتا کہ اسے اطاعت پر آمادہ کر کے اس کی طاقت مرہٹوں کے خلاف دفاع کے لئے استعمال میں لائی جاتی"۔ نجیب الدولہ نے کہا۔

"شہنشاہ ہند کی درخواست پر بادشاہ معظم اس مہم کا فیصلہ کر چکے ہیں، اب ان کا ارادہ بدلنا ممکن نہ ہو گا"۔ شاہ ولی خان نے جواب دیا۔

"اس مہم کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب سورج مل کی قوت ختم ہو جائے"۔

"بادشاہ معظم اسی لئے تو خود اس جہاد میں شامل ہوں گے"۔

"اس سے ہماری قوت تو بڑھے گی مگر کفار کے اتحاد سے سورج مل کو بھی فائدہ پہنچے گا"۔

خادم نے اطلاع دی کہ عماد الملک کی سواری ڈیرہ میں داخل ہو چکی ہے۔ شاہ ولی خان عماد الملک کی بے وقت آمد سے خوش نہیں ہوئے نجیب الدولہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر اندازہ کیا کہ وہ عماد الملک کو انتظار کے لئے بھی نہیں کہہ سکتا اور اس کی موجودگی میں سورج مل کے خلاف مہم پر تبادلہ خیال بھی مناسب نہیں ہو گا۔

"آپ مہمان کا استقبال کریں، مہم پر کل بات ہو سکتی ہے"۔ نجیب الدولہ رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاہ ولی خان نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھ اس کی

طرف بڑھادیا۔ "ہم معذرت خواہ ہیں......"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے نجیب الدولہ نے "معذرت کیسی" ہمارے ہاں کہتے ہیں مہمان اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں"۔ کہا اور خیمے کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔

"سپاہی کے لئے موت ایسے مہمان سے زیادہ محترم ہے جس کے قلب پر زندگی اور کفار کی محبت قابض ہو"۔ شاہ ولی خان نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا تو نجیب الدولہ نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

عماد الملک نے دور سے نجیب الدولہ کو خیمے سے برآمد ہوتے دیکھا تو سواری سے اتر کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا جھک کر ادب سے سلام کیا مزاج پرسی کے بعد بے موقع آمد پر معذرت کی۔

نجیب الدولہ نے مسکرا کر سلام قبول کیا اور اپنے دستے کی طرف چل دیا۔

"ہمیں بتایا ہوتا کہ حضور امور سلطنت نپٹا رہے ہیں تو ہم واپس لوٹ جاتے"۔ عماد الملک نے شاہ ولی خان سے بغلگیر ہوتے ہوئے اس سے بھی بے وقت آمد کے لئے معذرت کی۔

شاہ ولی خان نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا اور خیمے کے اندر لے گیا۔

قلعہ معلی کی محل سرا کے دیوان خاص میں احمد شاہ ابدالی کے سامنے شاہ ولی خاں جہان خان شاہ کے ندیم خاص اور عماد الملک مؤدب بیٹھے تھے۔

"حضور نے خان خاناں کو مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم مقرر فرما کر اس پر کرم کیا ہے مگر سر عام سزا دینے سے وہ امراء اور امور سلطنت پر گرفت کے قابل نہیں رہے گا۔ حضور مجرموں اور گنہگاروں کو معاف کرنے میں اتنے فیاض ہیں کہ دشمن دین وایمان بھی معترف ہیں خان خاناں پر کرم سے حضور اور مغلیہ سلطنت کا وقار بلند ہوگا"۔ عماد الملک نے عرض کیا۔

"خان خاناں سے شاہی خزانہ سے چرایا مال واپس لینے سے مغلیہ سلطنت مستحکم ہوگی اور آئندہ کسی وزیر اعظم کو جرأت نہ ہو سکے گی کہ خزانہ زر وجواہر اور روپیہ چرا جائے۔ خان خاناں مال واپس کر دیں تو ہم سزا واپس لے لیں گے"۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا۔

"حضور کا یہ خادم اس سے مال واپس حاصل کر کے خزانہ میں جمع کرانے کی کوشش کرے گا"۔ عماد الملک بادشاہ کے انداز دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"آپ ضمانت دیں تو ہم سزا معاف کر سکتے ہیں"۔ بادشاہ معظم نے کہا۔

"آپ کا کرم ہے کہ خاکسار کو ضمانت کے قابل سمجھا بندہ یہ ضمانت نبھانے میں پورے خلوص سے کام کرے گا"۔ عماد الملک نے وعدہ کیا۔

"ما بدولت ایک بار پھر عماد الملک پر اعتماد کرتے ہیں۔ جہان خان انتظام الدولہ کو سزا نہیں دیں گے مگر انہیں شاہی خزانہ سے چرایا مال ہر صورت واپس کرنا ہو گا"۔ بادشاہ نے عماد الملک کی عرض قبول کرتے ہوئے جواب دیا۔

عماد الملک نے سر جھکا کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ جہان خان کے اطمینان کے مطابق خان خاناں کی حویلی میں چھپایا خزانہ واپس نہ دلا سکے تو آپ اور خان خاناں دونوں کے لئے اچھا نہیں ہوگا"۔ احمد شاہ ابدالی نے خبردار کیا۔

****

سرائے مہر پرور کے دروازے پر دو سوار آ کر رکے خدام نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کی لگامیں پکڑ لیں۔ وہ گھوڑوں سے اتر آئے اور باتیں کرتے ہوئے سرائے کے مالک کے حجرے کی طرف چل دیئے۔ "یہاں کوئی

پنجاب کا قافلہ اترا ہے؟'' انہوں نے مالک سے پوچھا۔

''حضور! قافلہ دیکھے تو مدتیں گزر گئیں، چند مسافر ہیں اور آج ہی اترے ہیں''۔ مالک نے جواب دیا۔

''رجسٹر دیکھ کر نام بتا سکتے ہو، ان مسافروں کے آپ؟''

مالک رجسٹر کھول کر نام دیکھنے لگا۔ ''حضور کسی سے ملنا چاہتے ہیں تو اس کا نام بتادیں، موجود ہوا تو کہہ دیں گے سب کے نام بتانا اخلاقیات کے منافی ہوگا''۔

''ہم ملک سجاول کی تلاش میں ہیں''۔

''ملک سجاول نام کے ایک مسافر درج تو ہیں۔ حضور اپنا نام بتادیں، ہم انہیں اطلاع کرادیتے ہیں''۔

''میرا نام سرفراز خان ہے''۔

''حضور! تشریف رکھیں، بندہ ابھی اطلاع بھجواتا ہے''۔ مالک نے نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ملازم کو مہمانوں کی اطلاع کرنے بھیج دیا۔

''ہم بہت سرائیں گھوم آئے سب خالی پڑی ہیں''۔ سرفراز خان نے مالک سے بات شروع کرنے کو کہا۔

''شاہجہان آباد خالی ہوگا تو سراؤں میں کون آئے گا ہم تو سنتے ہیں شہنشاہ ہندوستان بھی قلعہ سرائے خالی کر گئے ہیں''۔ سرائے کے مالک نے دہلوی انداز میں جواب دیا اور سرفراز خان کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ان دنوں کوئی تاجر بھی نہیں آتے؟''

''مغرب سے تاجر تو مدت ہوئی بند ہوگئے ہر طرف انتشار ہے لٹنے کو کون قافلہ تیار کرتا ہے''۔

''آپ کا دھندا تو مشکل چلتا ہوگا تب''۔

''حضور جس ملک میں شہنشاہ کا اپنا دھندا نہ چلے رعایا کا دھندا کیا چلے گا جو مجبوری کے سفر والے آجاتے تھے افغانوں کے آنے سے وہ بھی ختم ہوئے''۔

''افغانوں نے آپ کو تو کچھ تنگ نہیں کیا''۔

''حضور! ہم کون سے نواب عمادالملک، نواب انتظام الدولہ ہیں جو وہ تنگ کریں گے ہم تو خادم ہیں۔ خادموں سے حاکموں کا کیا جھگڑا، ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ افغان منگیشور کے مرہٹوں اور سورج مل کے جاٹوں سے بہت بہتر ہیں''۔

''نواب انتظام الدولہ سے افغانوں نے کیا سختی کیا کچھ ہم بھی جانیں''۔ سرفراز خان اس کی بات پر غور کرتے ہوئے انجان بن گیا۔

''حضور! ہم تو سننے کے مجرم ہیں اور سنتے ہیں۔ قلعہ معلی میں شکنجہ لگ گیا ہے۔ نواب انتظام الدولہ جواہرات کو عزت سے عزیز رکھتے ہیں جو کچھ خزانہ سے چرایا اور حویلی میں چھپایا اس کی واپسی کا تقاضا سنتے ہیں''۔

''انتظام الدولہ نے خزانہ چرالیا؟ وزیر اعظم چوری کرے گا؟'' سرفراز خان نے حیرانی ظاہر کی۔

''حضور! وزیر اعظم چور نہ ہوتے تو آج مرہٹہ اور جاٹ ہندوستان میں حکمران نہ ہوتے۔ شاہجہان آباد والے افغانوں سے حفاظت کی درخواستیں کیوں کرتے؟''

سرائے کے مالک کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''ملک سجاول کو آتا دیکھ کر سرفراز خان اور اس کا ساتھی مالک کے حجرے سے باہر نکل آئے۔ مالک بھی ان کے ساتھ مہمانوں کی طرف بڑھا انہوں نے جھک کر ملک سجاول کو سلام کیا۔

''حضور کو شاجہان آباد سے دوری پسند ہے جو یہاں آگئے؟'' سرفراز خان نے کہا۔

''ہم نے سوچا اہل شاجہان آباد بادشاہ قندھار کی مہمان نوازی میں لگے ہیں، ہمیں کون پوچھے گا یہاں چلے آئے''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''امید ہے حضور بندہ کو شرف مہمان نوازی سے

محروم نہیں کریں گے"۔ سرائے کے مالک نے سرفراز خان اور ملک سجاول سے اپنے حجرے میں چلنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم مہمانوں کو اپنے حجرے میں تشریف فرما ہونے کو کہیں"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"بندہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تو حضور مختار ہوں گے"۔ سرائے کے مالک نے عرض کیا۔

"ہم کل سے حضور کی تلاش میں ہیں"۔ سرفراز خان نے مالک کے حجرے میں بیٹھتے ہوئے ملک سجاول سے کہا۔ "حضور نے یہاں آمد کی اطلاع ہی دی ہوتی"۔

"ہم ایک شب کے لئے یہاں آئے تھے"۔ ملک سجاول نے مختصر جواب دیا وہ سردار لکھنا کی آمد کے بارے میں اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے کے میدان میں ہجوم دیکھ کر ملک سجاول نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ ان کے ساتھی بھی رک گئے۔ "بندر والا تماشہ دکھا رہا ہے کوئی خاص بات نہیں"۔ سرفراز خان نے ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

"شاہجہان آباد کے بندروں کا تماشہ دیکھے بہت مدت ہوئی دیکھیں ان دنوں بندر کیسے ناچتے ہیں یہاں کے"۔ ملک سجاول نے کہا اور گھوڑا ہجوم کی طرف موڑ دیا سرفراز خان ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اپنا گھوڑا ساتھ کر دیا۔

وہ ہجوم کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور بندر والے کی باتیں سننے لگے۔

"آج صبح جب ہم اپنے گھر سے چلے تو ہماری بیگم نے سب کے لئے کھانا تیار کر کے باندھ دیا"۔ "شاہجہان آباد والے اتنے مہمانوں کا خرچ اٹھا رہے ہیں کیا معلوم ان کے پاس کچھ کھانے کو ہے یا نہیں"۔ بندر والے نے تماشہ دیکھنے والوں کی طرف منہ کر کے کہا۔

تماشائیوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"شاہجہان آباد پہنچ کر ہم لوگوں کو خوش کرنے لگ گئے۔ دوپہر کو کھانا کھانے بیٹھے تو تھیلا خالی تھا"۔ اس نے کہا اور بندر کی طرف ڈنڈا ہلا کر پوچھا۔ "جو کھانا ہم گھر سے لے کر چلے تھے وہ کون کھا گیا ہے؟"

"بندر اچھل کر ریچھ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

ریچھ سر ہلانے لگا۔

"یہ تو قسمیں اٹھاتا ہے کہ اس نے ہمارا بھوجن نہیں چرایا"۔ مداری نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

بندر ریچھ کی پیٹھ پر اچھلنے لگا

ریچھ تیزی سے سر ہلانے لگا

"یہ نہیں مانتا حضور آپ سب دیکھ رہے ہیں بالکل نہیں مان رہا اب آپ انصاف کریں ہم کس کے خلاف شکایت کریں، کس سے پوچھیں، کس سے حساب لیں، بتائیں حضور مائی باپ آپ ہی کچھ بتائیں"۔ وہ چلانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

ریچھ مسلسل انکار کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

تماشائی قہقہے لگانے لگے۔

"حضور والا! انصاف کے بغیر ہندوستان کی حکومت تو چل سکتی ہے ہمارا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اگر ایک ہی سب کا کھانا کھا جائے تو باقی کیا کریں، وہ تو بھوکے مر جائیں گے ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے"۔ اس نے ریچھ کی پیٹھ پر سوار بندر کی طرف ڈنڈا بڑھاتے ہوئے کہا۔

بندر اچھل کر ریچھ کی پیٹھ سے اتر گیا اور مداری کے ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ کر ریچھ کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔

''یہ تو اب بھی نہیں مانتا''۔
ریچھ خاموشی سے بندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔
بندر نے زور سے ریچھ کی پیٹھ پر ڈنڈا مارا تو ریچھ اقرار کے انداز میں سر ہلانے لگا۔
مداری چلایا۔ ''مان گیا حضور آپ دیکھ رہے ہیں موٹا چور مان گیا ہم نے اس پر اعتماد کیا یہ اپنے ساتھیوں کا حصہ بھی خود کھا گیا اسی لئے تو یہ اتنا موٹا ہو گیا ہے''۔ اس نے ریچھ کی زنجیر کھینچی۔
ریچھ سر جھکا کر گھوم گھوم کر تماشائیوں کو سلام کرنے لگا۔
مداری نے بلند آواز میں کہا۔ ''حضورق آپ سب دیکھ رہے ہیں ڈنڈا پیر ہے بگڑیاں تگڑیاں وا''۔
تماشائی قہقہے لگانے اور مداری کے کپڑے پر سکے پھینکنے لگے۔
سرفراز خان نے ملک سجاول کی طرف دیکھا اس نے گھوڑے کی لگامیں چھوڑ دیں۔ وہ خاموش تھا ان کے ساتھی خاموشی سے ساتھ چلنے لگے۔

***

مغلانی بیگم نے نشست گاہ کے دروازے پر ملک سجاول اور ساتھیوں کا استقبال کیا اور جب تک وہ سب بیٹھ نہیں گئے کھڑی رہی۔ ''اس پردیس میں چند اپنوں کی صورتیں دیکھنے پر آج ہم بہت خوشی محسوس کر رہے ہیں، آپ نے شاہجہان آباد واپسی پر اطلاع تک نہ کی ملک سجاول سے ہمیں تو یہ امید نہ تھی''۔
سرفراز خان ابھی تک دروازے کے پاس کھڑا تھا۔
''سرفراز دو روز سے تلاش میں رہا''۔ بیگم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مقدر میں تھا جو اس نے تلاش کر لیا''۔
''حاضری کی خواہش تو تھی مگر امید نہ تھی کہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ کابل و قندھار اور ان کے امراء وزراء سب اس شہر میں موجود ہیں''۔ ملک سجاول نے کہا۔
''شہباز خان نے آپ کو مسجد فتح پوری میں نہ دیکھ لیا ہوتا تو ہمیں خبر تک نہ ہوتی کہ آپ شاہجہان آباد واپس آ چکے ہیں''۔
''استاد محترم کا حکم تھا ورنہ اتنی جلد واپس آنا ممکن نہ ہوتا ان دونوں ہر طرف انتشار ہے، کوئی راستہ محفوظ نہیں''۔
''ہم سمجھتے تھے آپ مدرسہ میں ٹھہرے ہوں گے، معلوم ہوا وہاں بھی نہیں ہیں''۔
''استاد محترم بادشاہ معظم کی مشاورت کے لئے جا چکے تھے۔ ساتھی اور گھوڑے ساتھ ہوں تو سرائے ہی مناسب مقام ہے''۔ ملک سجاول بیگم کو بھی سردار لکھنا کے مشن کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔
''شیش محل میں بہت وسعت ہے، پنجاب اور اہل پنجاب کے قلب جیسی وسعت نہ سہی پھر بھی ڈیڑھ دو درجن سوار اور گھوڑے تو سما سکتے ہیں۔ سرفراز آپ کا سامان منتقل کرنے میں تاخیر نہیں کرے گا''۔ بیگم نے سرفراز خان کی طرف دیکھ کر کہا۔
سرفراز خان نے سر جھکا دیا۔ ''حضور کے حکم کی تعمیل میں ملک صاحب کی اجازت کی ہی تاخیر ہے''۔
''ہمارے حکم کے بعد ملک صاحب کی اجازت لازم نہیں''۔ بیگم نے ملک سجاول کی طرف دیکھا۔
''ہم جنگلوں میں رہنے والے محلوں میں رہنے کے آداب سے واقف نہیں''۔ ملک نے آہستہ سے کہا۔ ان کے ہمراہ ان کے قبیلے کے نوجوان بھی تھے۔
''ہم آپ کے ہاں قیام کے آداب جان سکتے ہیں تو آپ کو بھی کوئی مشکل پیش نہیں آنے دیں گے۔ یہ نوجوان جس گھر میں رہیں اس پر محل بھی رشک کرتے ہیں''۔ مغلانی بیگم نے کہا۔
نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ملک پور کی یاد ہمارے قلب سے قریب تر رہتی ہے، ہم ملک پور کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔ بیگم نے پوچھا۔

"تمام روائتی گاؤں محفوظ تھا جنگل آباد تھا اور راوی خاموش تھا سال گزشتہ ساون بھادوں کی برکھا میں قبروں پر جو گھاس اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں، انہیں کاٹنے والا کوئی نہ تھا کنارے راوی کے شہر خاموشاں کے باسی حضور کو یاد کرتے ہوں گے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"کنارے راوی کے خاموش شہر اور اس کے باسی ہمارے دل سے بہت قریب ہیں مگر شاہجہان آباد سے بہت دور ہیں"۔ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

راوی کے ڈھائے پر قدیم قبرستان کی دیکھ بھال کے لئے ان کے خاندان نے خدام بھرتی کر رکھے تھے۔

"سکھوں کی سرکشی میں کمی ہوئی یا اضافہ؟"

"پنجاب میں سکھ اور مسلمان حاکم اور رعایا سب نواب میر منو مرحوم کو یاد کرتے ہیں سکھ خوشی سے مسلمان دکھ سے حاکم بے بسی سے اور رعایا سکھوں کے ظلم کی وجہ سے نواب مغفور کے بعد سکھوں کو دبانے والا کوئی نہیں ہوا"۔ ملک سجاول کی بجائے ملک قاسم نے جواب دیا۔

میر منو کے ذکر سے بیگم کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تو کوشش کے باوجود وہ ملک سجاول اور اس کے ساتھیوں سے اپنے جذبات چھپا نہ سکی۔ "نواب مغفور کو سب یاد کرتے رہیں گے مستقبل کے لکھنے والوں کو لکھنا پڑے گا کہ پنجاب کی حکومت اور رعایا کو ان جیسا محافظ پھر کبھی نہ ملا"۔

ماحول کی سوگواری سب کے دلوں میں اترنے لگی۔

"نواب مغفور اور میر امین الدین کی روحیں ہمیں تلاش کرتی ہیں ہمارا جسم شاہجہان آباد میں ہے مگر روح لاہور میں ہے ہم نے جسم کے سفر کا سامان باندھ رکھا ہے اور مقدر کے فیصلہ کے منتظر ہیں"۔ بیگم دکھ سے مغلوب ہو گئی۔

ملک سجاول نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ ایک خاتون کے روبرو بیٹھا ہے۔ میر منو کی وفات اپنے بیٹے کے جنازہ دربار لاہور کے امراء کی سازشوں اور بغاوتوں حویلی میں قید کے کسی مرحلہ پر مغلانی بیگم نے جذبات کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا تھا۔

"بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی ہمیشہ حضور پر مہربان رہے ہیں۔ حضور کی مدد کے لئے وہ قندھار سے شاہجہان آباد آئے ہیں، اب حضور کی واپسی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی"۔ ملک بیگم کے ذہن سے پرانی یادیں نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بادشاہ معظم نے ہم پر ہمیشہ کرم کیا ہے مگر امور سلطنت کی مصلحتیں الگ ہوتی ہیں پھر بھی ہماری لاہور واپسی پر بادشاہ معظم کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہئے"۔ بیگم نے جواب دیا۔

بیگم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے خادم دست بستہ کھڑا تھا۔ "مہمانوں کی خوشی میں ہم تو آداب میزبانی بھی بھول گئے"۔ اس نے دسترخوان بچھانے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

"یہاں کے کھانوں کا ذائقہ شاید پنجاب جیسا نہ ہو مگر ہمارا خلوص پنجاب کا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ اہل پنجاب دہلوی تکلف سے کام نہیں لیں گے"۔ وہ خود ماحول بدلنا چاہتی تھی۔ "ہماری وطن سے دوری کو دل سے دوری نہ سمجھا جائے"۔

***

قلعہ معلی کے محل سرا کی ڈیوڑھی کے سامنے سنہری وردیوں میں ملبوس کہاروں نے پالکی رکھی تو کنیزیں تیزی سے آگے بڑھیں ایک کنیز نے پالکی کا سنہری پردہ ہٹا دیا وزیراعظم انتظام الدولہ کی بوڑھی والدہ نواب شولا پوری

م نے آہستہ سے زمین پر قدم رکھا تو سب کنیزوں نے
ـ زبان "بسم اللہ" کہا وہ ایک وقار سے قدم اٹھاتی
وازے تک پہنچی تو احمد شاہ ابدالی کے حرم سرا کی کنیزیں
ب کے لئے رکوع میں چلی گئیں۔ ایک قدم رک کر
اب شولا پوری بیگم نے ڈیوڑھی کی منقش چھت اور
چاروں کا جائزہ لیا۔ کنیزوں کی قطاروں کو ایک نظر دیکھا
رملانی بیگم کے ہمراہ احمد شاہ ابدالی کی خاص نشست
اہ کی طرف چلتی رہی نشست گاہ کے دروازے پر
لڑے خدام دیکھتے ہی ادب کے لئے جھک گئے،
کنیزوں نے نشست تک ان کی رہنمائی کی۔

"تشریف رکھیں"۔ ایک کنیز نے ادب سے انہیں
یک نشست پر بٹھا دیا۔

"عمادالملک نے خان خاناں انتظام الدولہ کو شاہی
زانہ میں روپیہ اور زر و جواہر واپس جمع کرانے کا مشورہ
یا تو وہ اپنی بات پر قائم رہا کہ میرے پاس نہ کوئی روپیہ
ہے نہ زر و جواہر"۔

عمادالملک نے بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہ
نے۔

جہان خان نے انہیں شکنجے پر چڑھانے کا فیصلہ کر
یا۔

"حویلی میں اگر کوئی روپیہ اور زر و جواہر ہیں تو ان
کا میری والدہ کو علم ہوگا، مجھے کچھ معلوم نہیں"۔ انتظام
دولہ نے جہان خان کا ارادہ بھانپ کر کہا۔ ان کا خیال
تھا کہ افغان جرنیل ان کی والدہ کے مرتبہ اور عمر کا احترام
کریں گے اور وہ خود بچ جائیں گے۔

"مجھے حضور نے اقرار کر لیا باقی بیگم صاحبہ مان
جائیں گی"۔ جہان خان نے نواب شولا پوری بیگم کو حاضر
کرنے کا حکم دے دیا۔

عمادالملک کو امید نہ تھی کہ انتظام الدولہ ایسا جواب
یں گے۔ نواب شولا پوری بیگم ان کے خاندان کی سب
سے بزرگ خاتون تھیں، اس نے جہان خان سے
درخواست کی کہ انہیں بیگم صاحبہ سے بات کرنے کا موقع
دیا جائے۔

جہان خان مان گیا اور انتظام الدولہ کی حویلی سے
واپس آ گیا۔

مغلانی بیگم نے اپنی ساس کو سمجھانے کی کوشش کی
مگر وہ بھی کچھ نہ مانیں۔ بیگم نے احمد شاہ ابدالی سے
درخواست کی کہ وہ خود نواب شولا پوری بیگم کو محل سرا میں
طلب فرما کر ان سے بات کریں تو ابدالی نے کہا جو بات
ہوگی تمہاری موجودگی میں ہوگی اور نواب شولا پوری بیگم کو
محل سرا میں طلب فرمایا۔

کنیزیں مشروب پیش کر چکیں تو احمد شاہ ابدالی خود
نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ مغلانی بیگم اور کنیزوں نے
شاہ کو آداب عرض کیا۔ بوڑھی بیگم شولا پوری نے آداب
کے لئے اٹھنے کی کوشش کی تو شاہ نے روک دیا۔ "حضور کی
عمر اور مرتبہ کا تقاضہ ہے کہ مابدولت خود سلام پیش کریں۔
ہمیں خوشی ہوگی آپ ہمارا سلام قبول فرمائیں اور ہمیں
دعا دیں"۔

احمد شاہ ابدالی نہایت سادہ لباس میں تھے، ڈھیلی
ڈھالی شلوار کھلی قمیص اور سر پر کلغی دار ٹوپی۔ نواب
شولا پوری بیگم کو یقین نہیں آیا کہ یہی وہ احمد شاہ ابدالی ہے
جس سے ہندوستان کے مسلمان اپنے تحفظ کی امیدیں
وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ سرپوش میں نہ کوئی ہیرا نہ جواہر
اور نہ زرق برق لباس اس سے شاندار لباس تو مغل دربار
کے عام درباریوں کا انہوں نے دیکھا تھا ابدالی ایسے آ کر
ان کے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا تھا جیسے محل سرا نہ ہو کوئی
عام گھر ہو، وہ بادشاہ نہ ہو کوئی عام آدمی ہو۔ نواب
شولا پوری بیگم کو احمد شاہ ابدالی کو عام سا آدمی پا کر بہت
مایوسی ہوئی۔

مغلانی بیگم نے بادشاہ سے اجازت حاصل کر کے

عرض پیش کی۔ "حضور والا عالی مرتبہ بادشاہ معظم! اس کنیز کے لئے والد حقیقی سے بھی زیادہ مشفق اور محترم ہیں۔ نواب شولاپوری بیگم ہماری والدہ کے مقام پر ہیں۔ ہم درخواست گزار ہیں کہ بیگم حضور کے احترام و مرتبہ کا خیال کر کے ہم پر مزید کرم فرمایا جاوے"۔

ابدالی نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ "ہم افغانوں میں ماں اور بہن کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ انتظام الدولہ نے اپنے مقام اور اپنی عالی مرتبت والدہ کے احترام کا بھی خیال نہ کیا اور حویلی میں مدفون خزانہ کی ساری ذمہ داری بیگم صاحبہ پر ڈال دی۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ہندوستان کے اتنے عظیم اور عالی خاندانوں کے امراء اس پستی تک پہنچ چکے ہیں"۔

نواب شولاپوری بیگم صاف اور سیدھا جواب سن کر الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ مغلانی بیگم نے عرض کیا۔ "کنیز کو یہ جان کر دکھ ہوا کہ خان خاناں نے خزانہ کی موجودگی تو تسلیم کر لی مگر اس کی تلاش کی ذمہ داری اماں حضور پر ڈال دی"۔

نواب شولاپوری بیگم نے مغلانی بیگم کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوا چھا یہ بات ہے؟

"خان خاناں کی حویلی میں جو خزانہ موجود ہے اسے ہر صورت واپس لایا جائے گا۔ انتظام الدولہ کو ہمیں اور ہمارے حکم کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرنا چاہیے تھی اس غلطی کی سزا کس کس کو ملے گی، ہم نہیں جانتے"۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا۔

"ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری حویلی میں مختلف اوقات میں کچھ چیزیں محفوظ کی گئیں لیکن کہاں دبائی گئیں ہم خود بھی نہیں جانتے"۔ بیگم شولاپوری نے بادشاہ کو خزانہ کی بازیابی کے لئے ہر طریقہ استعمال کرنے پر آمادہ دیکھ کر تسلیم کر لیا۔

"ہم سمجھتے ہیں بیگم صاحبہ کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ ہم یہ خزانہ ڈھونڈنے کے لئے ماہرین ان کی حویلی بھیج دیں"۔ ابدالی نے پوچھا۔

"بیگم حضور کو اس پر ہرگز اعتراض نہیں ہوگا"۔ نواب شولاپوری بیگم کے جواب دینے سے پہلے مغلانی بیگم بول پڑیں۔

نواب شولاپوری بیگم کے لئے خاموشی لازم ہوگئی۔

"بیگم حضور مابدولت کے لئے مرتبہ مادر ہیں، حضور اسی محل میں مقیم رہیں گی تاکہ تلاش کے دوران انہیں کوئی زحمت نہ ہو۔ ہم ان کی اجازت سے آج ہی اس خزانہ کی تلاش شروع کروا رہے ہیں"۔ احمد شاہ ابدالی نے فیصلہ سنا دیا۔

نواب شولاپوری بیگم خاموش رہیں۔ مغلانی بیگم نے کچھ کہنا چاہا مگر ابدالی کھڑے ہو گئے اور کنیزوں کو حکم دیا کہ بیگم صاحبہ کے مقام و مرتبہ کے مطابق آرام و آسائش کا خاص اہتمام کیا جائے۔

دو شب و روز خان خاناں کی حویلی کی تلاشی جاری رہی ایوانوں کی چھتوں میں بنے خانوں اور فرشوں کے نیچے سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ نقد اور کئی کروڑ کے ہیرے موتی جواہرات اور سونے چاندی کے برتن اور سلاخیں برآمد ہوئیں۔

احمد شاہ ابدالی کے سامنے جب یہ جواہر ڈھیر کیے گئے تو اس نے بیگم شولاپوری اور انتظام الدولہ کو مخاطب کیا۔ "اگر یہ دولت کے ڈھیر اور زر و جواہر فوج کی تیاری اور سلطنت کے نظم کے استحکام پر خرچ کیے جاتے رہتے تو آج کسی کو وزیراعظم بن وزیراعظم کی حویلی میں داخل ہونے اور اس کی چھتیں اور فرش اکھاڑنے کی جرأت نہ ہوتی"۔

ماں بیٹا سر جھکائے سنتے رہے۔

"محمد امین خاں مرحوم نواب قمر الدین مرحوم اور

ان کے بعد آنے والوں نے پون صدی میں جو کچھ چرایا اور چھپایا تھا وہ اس وقت ہمارے سامنے ڈھیر ہے۔ کاش! انہیں احساس ہوتا کہ دولت اہل طاقت کی لونڈی ہے، وہ اس بے وفا لونڈی کی پرستش کرنے کی بجائے اس سلطنت کو مضبوط بناتے جس نے یہ لونڈی ان کے حرم میں داخل کر دی"۔

اہل مجلس دم بخود تھے۔

"ہندوستان کے شہنشاہ اس خزانہ کی حفاظت نہ کر سکے، ہم نہیں چاہتے شہنشاہ کی کمزوری کی وجہ سے کوئی اور یہ خزانہ پھر چرا لے جائے، ہم اسے افغان خزانہ میں داخل کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ پھر نہ لٹ جائے"۔

افغان خزانہ دار روپیہ اور زر و جواہر کی تفصیلات رجسٹروں میں درج کرنے لگے تو احمد شاہ ابدالی نے کچھ ہیرے اور اشرفیاں ایک سنہری طشت میں رکھ کر نواب شولا پوری بیگم کو پیش کرنے کا حکم دیا۔

نواب شولا پوری بیگم نے سر جھکا کر وصول کر لیا۔

مغلانی بیگم اپنی کامیابی پر خوشی چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

***

شاہجہان آباد کے ہر گھر میں مغلانی بیگم کا ذکر ہونے لگا تھا وہ شاہجہان آباد کی سب سے طاقتور خاتون تھیں۔ جن امراء اور سالاروں نے ان کے اغواء کا مشورہ دیا تھا یا لاہور کے شاہی قلعہ سے اغوا کر کے شاہجہان آباد پہنچانے میں حصہ لیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے سب کو ذلیل و خوار کیا اور افغان فوجیوں نے ان کے گھر لوٹ لئے بیگم نے جس کسی امیر وزیر کی سفارش کی ابدالی نے اس کے دروازے پر اپنے پہریدار بٹھا دیئے تاکہ کوئی افغان سپاہی غلطی سے بھی ادھر کا رخ نہ کرے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی شائستہ اطوار حسین و جمیل شاعرہ اور وزیر اعظم کی چہیتی بیوی گنا بیگم کو اس کی لونڈیوں میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن اور خوش نہیں تھی۔ وہ عماد الملک کو پھر سے ہندوستان کا وزیر اعظم دیکھنا چاہتی تھی جسے شہنشاہ ہند عالمگیر ثانی کے علاوہ شاہجہان آباد کے علماء اور ابدالی کے دست راست نواب نجیب الدولہ سب ہندوستان کی مسلم ملت کا مجرم اور مرہٹوں کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ ان سب کی مخالفت اور احمد شاہ ابدالی سے ان کا فیصلہ بدلوانے کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی مغلانی بیگم نے ہمت نہیں ہاری۔ "ہم جاننا چاہیں گے کہ سورج مل جاٹ سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟" اس نے عماد الملک سے براہ راست سوال کیا۔

"سورج مل بہت ہوشیار حکمران ہے، ایک طرف وہ مرہٹوں سے خوفزدہ ہے اس کے باوجود اس نے ملکیشور راؤ کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے وہ مغلیہ سلطنت کو اتنا طاقتور نہیں دیکھنا چاہتا کہ وہ اس کی آزادی کے لئے خطرہ بن جائے اور نہ ہی مغل شہنشاہ کو اتنا کمزور دیکھنا پسند کرے گا کہ مرہٹے شاہجہان آباد پر غلبہ حاصل کر کے اس کی ریاست ختم کر دیں۔ اس کی سیاست سمجھنے والا نہ اس کی دوستی پر اعتماد کر سکتا ہے نہ دشمنی پر یقین رکھ سکتا ہے"۔ عماد الملک نے جواب دیا۔

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ سورج مل نے بادشاہ معظم کو عرضداشت ارسال کی ہے کہ "اگر حضور عماد الملک کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ قندھار لے جائیں تو میں حضور کا باجگزار اور وفادار بن کر رہوں گا اور مرہٹوں کے خلاف مہم میں حضور کا ساتھ دوں گا اور پچاس لاکھ روپیہ پیش کر کے اپنے خلوص کا ثبوت دینے کو تیار ہوں"۔

"ہم سورج مل کی کسی بھی عرضداشت پر یقین کر سکتے ہیں"۔ عماد الملک نے پریشانی سے جواب دیا۔ "اس نے ہمیں پیشکش کی تھی کہ اگر ہم بادشاہ قندھار کے خلاف لڑیں تو وہ خود اور تمام راجپوت مہاراجے ہمارا ساتھ دیں گے مگر ہم نے اس کا مشورہ نہیں مانا تھا۔ بادشاہ معظم سورج

مل کی پیشکش اور ہمارے فیصلے سے آگاہ ہیں اس لئے ہم نہیں سمجھتے وہ اس پر اعتماد کریں گے"۔

"بادشاہ معظم سورج مل پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں یہ الگ بات ہے آپ کو بادشاہ معظم کو اپنے خلوص کا ثبوت دے کر ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی، ہم چاہتے ہیں کہ سورج مل کے خلاف افغانوں کی مہم میں آپ خود شامل ہوں"۔

"بندہ حضور کے حکم کی تعمیل کرے گا"۔

"آپ ابھی سے سپاہیوں کی بھرتی شروع کر دیں، شاہ ولی خاں کو علم ہونا چاہئے کہ آپ دستہ تیار کر رہے ہیں"۔

"بندہ اس مہم میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا"۔

"سورج مل کی عرضداشت انتظام الدولہ نے شاہ ولی خاں کو پہنچا دی ہے اس لئے شاہ ولی خاں اور انتظام الدولہ کو شبہ تک نہیں ہونا چاہئے کہ ہم یا آپ سورج مل کے مراسلے سے آگاہ ہیں"۔ بیگم نے ہدایت کی۔

"آپ کے حکم پر ہم نے خان خاناں کے ساتھ احسان کیا وہ پھر بھی دشمنی پر قائم رہا"۔ عمادالملک نے افسوس ظاہر کیا۔

"اقتدار اور اختیار کی جنگ میں کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے احسان خان خاناں پر نہیں اپنے آپ پر کیا ہے وقت شاید اس کو بھی ثابت کر سکے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ انتظام الدولہ پر مزید احسانات سے اپنے خلوص کی سند حاصل کریں اور اس سے تعاون جاری رکھیں"۔

عمادالملک کو مغلانی بیگم کی دانش پر اعتماد مستحکم ہونے لگا تھا مگر وہ ان کے بعض مشوروں کو سمجھ نہیں پاتا تھا پھر بھی بیگم کی حیران کن کامیابیاں دیکھ کر ان کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

"ہم بادشاہ معظم کے فرزند شہزادہ تیمور شاہ کی

شادی کے سلسلہ میں ایک دعوت دینا چاہتے ہیں۔ آپ اس بارے میں ہماری مدد کریں تو ہمیں خوشی ہوگی''۔ بیگم نے موضوع بدل دیا۔ ''کھانے شیشہ محل میں تیار ہوں گے اور محل سرا پہنچائے جائیں گے ان کے لئے ہمیں باورچی اور خدام کی ضرورت ہوگی''۔

''شاہجہان آباد میں ایسے باورچیوں اور خدام کی کمی نہیں''۔

''انتظام ملک سجاول کریں گے، آپ کے لوگ ان سے تعاون کریں تو مناسب ہوگا۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں''۔

''حضور نے اس خادم کو حکم دیا ہوتا''۔

''یہ دعوت اہل پنجاب کی طرف سے ہے اس لئے اہتمام ملک سجاول اور ان کے نوجوان کریں گے ہم اس اجنبی شہر میں بادشاہ معظم اور ان کے حرم کو پنجاب کے خلوص کی یاد دلانا چاہتے ہیں''۔

عمادالملک بیگم کے پنجاب اور اہل پنجاب کے خلوص کے ذکر پر کچھ پشیمان سا ہو گیا۔

٭٭٭

دولہا کے ایک طرف ان کے سسر شہنشاہ ہندوستان تشریف رکھتے تھے اور دوسری طرف ان کے والد بادشاہ کابل و قندھار تشریف فرما تھے۔ مغلانی بیگم کنیزوں کے جلوس کے ساتھ داخل ہوئی، دولہا کے قریب پہنچ کر آداب عرض کیا۔ ایک کنیز نے دولہا کو سلام کیا اور دوسری سے طشتری پکڑ کر اس پر سے ریشمی رومال ہٹا کر طشتری آگے بڑھا دی۔ بیگم نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر طشتری دولہا کو پیش کی تو پاس کھڑے خادم نے پکڑ کر تپائی پر رکھ دی۔ بادشاہ، شہنشاہ اور دولہا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہونے لگی۔ طشتری میں نادر ہیرے جواہر بھرے تھے۔

دوسری کنیز نے آگے بڑھ کر ایک اور طشتری پیش کی بیگم نے اسی انداز میں وہ بھی دولہا کو پیش کر دی۔

خادم نے وہ طشتری پکڑ کر بھی تپائی پر رکھ دی۔ اس میں بھی ہیرے جواہر چمک رہے تھے۔ موتیوں اور ہیرے جواہرات سے بھری درجن بھر طشتریاں پیش کرنے کے بعد بیگم نے ایک ہیرا دولہے کے سر پر سے وار کر پاس کھڑے خادم کو دیا۔ وہ واپسی کے لئے مڑنے لگی تو احمد شاہ ابدالی اپنی نشست سے اٹھے اور اپنے سر سے کلاہ شاہی اتار کر بیگم کے سر پر رکھ دی۔

امراء وزراء اور مہمان جو ہیروں کی چمک اور کثرت پر حیران ہو رہے تھے احمد شاہ ابدالی کے اپنی کلاہ مغلانی بیگم کو پہنانے پر اور بھی حیران ہوئے۔

''بادولت کشور پنجاب کی رسوم سے آگاہ نہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ بھائی کو سلامی دے کر بہن خالی ہاتھ واپس نہیں جایا کرتی''۔ بادشاہ نے ہیرے جواہرات سے مزین اپنا چوغہ بھی اتار کر بیگم کو پیش کر دیا۔ ''بادولت اب تک آپ کو بیٹی کی مانند جانتے تھے آج سے آپ ہمارے لئے فرزند ہیں اور ہم اپنے فرزند کو سلطان مرزا کا خطاب دیتے ہیں''۔

جس نے دیکھا اور جس کسی نے نہ دیکھا اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر شبہ ہونے لگا۔

اعلان کرنے والے نے بادشاہ معظم کے ان التفات اور خطاب سے سب شرکائے دعوت کو آگاہ کر دیا۔

''بادولت عمدہ بیگم کی شادی کی تقریب خود منانا چاہتے تھے''۔ احمد شاہ ابدالی مغلانی بیگم سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ کی مجبوریوں اور ہماری مصروفیات کی وجہ سے ہماری بیٹی کی شادی پر کوئی اہتمام نہ ہو سکا تھا''۔

سننے والوں کو ایک بار پھر اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ''بادولت حکم دیتے ہیں کہ شاہ ولی خان اور جہان خان عمدہ بیگم اور عمادالملک کی شادی کی شاہی تقریب کی تیاریاں کریں''۔

مغلانی بیگم کی دعوت اور احمد شاہ ابدالی کے اپنی کلاہ اور چوغہ اسے پہنا کر سلطان مرزا کا خطاب دینے کی باتیں بھی گھر گھر ہونے لگیں۔

دو ہفتے کی تیاریوں کے بعد احمد شاہ ابدالی نے عماد الملک سے عمدہ بیگم کی رسم نکاح میں حنا بندی کی رسم خود ادا کی پانچ ہزار زر نقد اور اپنی شال خاص عماد الملک کو اور دو لاکھ روپیہ دو زنجیر ہاتھی اور چار آراستہ گھوڑے عمدہ بیگم کو جہیز میں دیئے۔

بیگم نے احمد شاہ ابدالی کے مقرر کردہ وزیر اعظم ہندوستان خانخاناں انتظام الدولہ اور سورج مل کی چال ناکام بنادی مگر عماد الملک کو خانخاناں کی مسند پر بٹھانا ابھی باقی تھا اور عماد الملک کے سب مخالف پریشان رہنے لگے تھے۔

***

ماگھ کی ٹھنڈی طویل راتوں کے بعد پھاگن کا خوشگوار مہینہ شروع ہو چکا تھا گنا بیگم کو ہندوستان کے جابر وزیر اعظم کی چہیتی بیوی سے عماد الملک سے بھی طاقتور ملانی بیگم کی خدمت میں بحیثیت کنیز پیش ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا شیشہ محل کی حاکم نہیں تھی وزیر اعظم ہندوستان کی بیگم نہیں تھی ملانی بیگم کی کنیز تھی اگرچہ بیگم نے اسے بھی اس کا احساس نہ ہونے دیا تھا مگر وہ اس تلخ حقیقت سے آگاہ تھی اور دن کا بیشتر حصہ اپنے کمرے میں بند رہتی تھی اور رات کا زیادہ حصہ اس کے کمرے میں دیا روشن رہتا تھا۔

رات تیزی سے بیتی جا رہی تھی، چاند اپنا سفر مکمل کر کے اس کے اپنے عروج کے چاند کی مانند کسی اندھیری منزل میں داخل ہو گیا تھا مگر وہ اب بھی جاگ رہی تھی۔ دیئے کی مدھم لاٹ کے سامنے بیٹھی لکھ لکھ کر کاٹ رہی تھی۔ کل رات اس نے جو غزل لکھی تھی اس کے پرزے چاروں طرف بکھرے تھے۔ کئی روز سے وہ ایک بھی غزل مکمل نہیں کر سکی تھی جو شعر ایک رات لکھتی اگلی رات پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ الفاظ اس کے غم کی گہرائی اور شدت کے اظہار کے متحمل نہیں ہو رہے۔ وہ اٹھی اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی نیلے آسمان پر تارے چمک رہے تھے چاند کے غروب ہو جانے سے تاروں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ "میں نے تاروں سے چاند کی تعزیت کرنا چاہی تو وہ خوشی سے ناچنے لگے چاند کی موت کی خوشی میں او چاند تو تو آسمانوں کا بادشاہ تھا۔ جس کے سر پر نور کا تاج تھا۔ آسمانوں اور زمین کی مخلوق تیرے عروج اور مقدر پر رشک کرتی تھی۔ مسافر تجھ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ستارے تیرے سامنے ادب سے آنکھیں بند رکھتے تھے۔ یہ کیا تیرے اندھیری منزل میں اترتے ہی تیرا غم ان کے لئے جشن شادمانی کا سبب بن گیا۔ چاند کا زوال ستاروں کا عروج ہے چاند کی موت ستاروں کی زندگی ہے"۔ اس نے محسوس کیا جیسے شعر اس پر نازل ہونے لگے ہیں وہ گنگنانے لگی "چاند آسمانوں کا ہو یا زمین کا اس کا مقدر ایک ہے" خوشگوار ہوا کا جھونکا آیا اور اس کی پیشانی چوم کر گزر گیا وہ کھڑکی کے اور قریب ہو گئی تاروں کا جشن غور سے دیکھنے لگی۔

ندیاں تارو ہو گیاں مشکل ہو گئے نے لانگھے
پردیس گیا ئے بادشاہ ہی پھر دی وطناں نوں تانگھے

مردانہ کی طرف سے پرسوز آواز اس کے دل میں اتر گئی وہ اس گیت کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی مگر گانے والے کی نے اور سوز نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا وہ شعر بھول گئی اور آواز کے سوز اور گیت کے معانی کی تلاش میں کھو گئی جب تک آواز آتی رہی وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔

اگلی صبح اس کے دروازے کی خادمہ سلام کے لئے حاضر ہوئی تو اس نے اشارے سے پاس بلایا۔ ریشمی تھیلی سے ایک چمکدار موتی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا خادمہ

شکریہ کے لئے رکوع میں چلی گئی۔

"ہم جاننا چاہتے ہیں کہ مہمان خانہ میں شب گزشتہ کون گا رہا تھا"۔ اس نے ہتھیلی میں بند ہیرے جواہر اپنے سامنے قالین پر بکھیر دیے۔

"ادھر بیگم عالیہ کے پنجابی مہمان ٹھہرے ہیں ان میں سے کوئی ہوگا"۔ خادمہ اس کا مدعا سمجھ نہ سکی۔

"یہ تو ہم جانتے ہیں ادھر کون ٹھہرا ہے مگر ان میں سے رات کے پچھلے پہر گا کون رہا تھا؟" گنا بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ تو مہمان خانہ کے خادم ہی بتا سکیں گے"۔ خادمہ نے بھولپن کا سہارا لینا چاہا۔

"ان موتیوں کی قیمت جانتی ہو؟" گنا بیگم نے خادمہ سے پوچھا اور اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی کہا۔ "مہمان خانہ کے خادم ضرور جانتے ہوں گے جو بتا سکے کون گا رہا تھا اسے ہماری طرف سے یہ موتی پیش کرو"۔ اس نے خادمہ کی طرف ایک اور موتی بڑھایا۔

خادمہ نے موتی اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ "یہ تو کوئی بات ہی نہیں اس کے لئے اتنا قیمتی موتی دینا لازم نہ ہوگا"۔

"ہمارے پاس ایسے بہت سے موتی ہیں ہم ان میں سے بہت سے موتی دے سکتے ہیں احتیاط یہ کرو کہ کسی اور کو علم نہ ہو"۔ گنا بیگم نے ہدایت کی۔

"حضور غم نہ رکھیں ان دیواروں اور پردوں کے سوا کسی کو کچھ علم نہ ہوگا"۔ خادمہ نے آداب کے لئے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

***

سرفراز خاں نے مغلانی بیگم کو اطلاع دی کہ گنا بیگم ملک قاسم کے گیت میں دلچسپی لینے لگی ہے اور اسے پیغام بھیجا ہے کہ رات کے پچھلے پہر وہ بلند آواز میں گایا کرے۔ مغلانی بیگم کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "اس میں کوئی حرج نہیں گنا بیگم علی قلی خاں اور عماد الملک کے محل میں گانے سے دل بہلاتی رہی ہے ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس کو خوش رکھنے کے لئے ایسا اہتمام نہ کر سکے"۔

سرفراز خاں حیران رہ گیا۔ "ملک سجاول کو علم ہو تو انہیں کیا کہا جائے؟"

"ہماری طرف سے ملک صاحب کو کہہ دو کہ ہم گنا بیگم کے دکھ کے لئے دکھی ہیں اگر وہ ان کے کسی ساتھی کے گیت سے فرحت محسوس کرتی ہیں تو ہم ان کے مشکور ہوں گے مگر ملک سجاول کے سوا ہمارے حکم کا کسی اور کو علم نہ ہونا چاہئے"۔ مغلانی بیگم نے تنبیہ کی۔

"مہمان خانہ میں متعین جس خادم کو حضور کی طرف سے خبر رسانی کا حکم ہے وہ اس سے واقف ہے؟" سرفراز خان نے بتایا۔

"اسے ہماری طرف سے حکم دیا جائے کہ اس کے کانوں نے کچھ نہیں سنا"۔

سرفراز خان کمرے سے باہر نکل گیا وہ بیگم کے احکامات اور فیصلوں کی وجوہ اور جواز ڈھونڈنے کا عادی نہ تھا۔

چند لمحے بعد گنا بیگم ان کے کمرے میں موجود تھی۔

"حضور نے اس کنیز کو یاد فرمایا تھا"۔

"ہم کئی روز سے اپنی دختر عزیز سے مل نہ سکے، ہمیں امید ہے کہ آپ نے برا نہ مانا ہوگا"۔ بیگم اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"حضور کی زیارت کنیز کے لئے باعث شادمانی ہے"۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ مہمان خانہ میں ہمارا ایک مہمان رات کے پچھلے پہر گیت گاتا رہتا ہے"۔ بیگم نے کنیز کو قہوہ لانے کا حکم دیتے ہوئے پوچھا۔

"حضور نے درست سنا ہم نے بھی ایک دو دفعہ گانے کی آواز سنی ہے"۔ گنا بیگم نے ڈوبتے دل سے

جواب دیا وہ بیگم کے قہر و غضب کی کہانیاں سن چکی تھی۔

"آواز ہی سنی یا اس گیت کے کچھ معنی بھی جاننے کی کوشش کی"۔ بیگم نے پوچھا۔

"معنی تو ہم نہ جان سکے"۔ گنا بیگم کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ مغلانی کی اس تفتیش کا انجام کیا ہوگا۔

"یہ پنجاب نوجوان شاہجہان آباد کے چند روزہ قیام سے ہی اداس ہونے لگے ہیں۔ ہم نے ملک سجاول سے پوچھا اس نے جو گیت سنایا وہ ان کی اداسی کا اظہار ہے۔ "ندی نالوں میں پانی بھر گیا ہے، انہیں عبور کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ پردیس میں بادشاہی مل جائے تو بھی دل اپنے وطن کے لئے بے چین رہتا ہے"۔ مغلانی بیگم نے مسکراتے ہوئے اس گیت کا ترجمہ کر کے اسے سنایا۔

"ان کا وطن ان کا گاؤں ہے جہاں ہمارے والد محترم کی جاگیر تھی، ہم بچپن سے وہاں جاتے رہے ہیں، اتنا سکون دنیا میں بھی کہیں نہ مل سکا جتنا وہاں ملا۔ دریا کے کنارے میلوں تک ہرا بھرا جنگل اس میں کھیلتے سور اور گاتے ناچتے پرندے اور یہ بہادر اور وفادار لوگ، ہم تو بھی سوچتے تھے سب کچھ چھوڑ کر ابا حضور کی جاگیر میں جا بسیں، ان سادہ دل لوگوں کے درمیان مگر مقدر میں نہ ہوا"۔ مغلانی بیگم کی آواز پر اداسی غالب آنے لگی۔

"ملک پور نواح لاہور میں ہوگا؟" گنا بیگم بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔

"اتنا نزدیک کہ ہم نے جب بھی آواز دی انہوں نے سن لی، گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈال کر تلواریں لہراتے سامنے آ موجود ہوئے۔ ان کے ہی نہیں خود ہمارے دل سے بھی شاہجہان آباد لاہور اور ملک پور کی یادیں نہیں نکال سکا"۔

"ہمیں بچپن میں لاہور کی جو کہانیاں سنائی جاتی تھیں ان میں ملکہ نور جہاں کا وہ شعر بھی تھا۔ "لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم۔ جاں دادہ ایم جنت دیگر خریدہ ایم"۔ گنا بیگم غیر ارادی طور پر شعر و شاعری کی طرف نکل گئی۔

"ملکہ نور جہاں نے شہنشاہ جہانگیر اور اپنے مقبروں کے لئے جو مقام پسند کیا وہ ملک پور سے اتنا قریب ہے کہ مقبروں کے مینار صاف نظر آتے ہیں۔ راوی کے ایک طرف ملک پور ہے اور تھوڑا نیچے چل کر شاہدرہ ہے۔ شکاری تین تیر چلائیں تو شاہدرہ پہنچ جاتے ہیں۔ ملک پور سے دریا میں کشتی ڈال دیں دو ڈیڑھ گھنٹے میں شیش محل کی کھڑکیوں کو چھو لیں۔ شاہدرہ میں تو ایک دو مقبرے ہیں ملک پور میں کئی مقبرے ہیں تالاب ہیں کہانیاں ہیں اگر کہیں جنت دیگر ہے تو ملک پور میں ہے، شاہدرہ میں نہیں"۔ مغلانی بیگم نے چہرے پر مزید اداسی اوڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہی کیا سعد سعود سلمان تک شاہجہان آباد کے دربار میں عزت و حشمت میں شرابور ہونے کے باوجود لاہور کے لئے تڑپا کرتے تھے۔ "مولدم لاہور واز لاہور دور۔ زشتق اے لاہور تجھ بن کے سرور"۔

مغلانی بیگم نے پنجاب لاہور ملک پور اور وہاں کے باسیوں کا اس سوز و گداز سے ذکر کیا کہ گنا بیگم سوچنے لگی کہ اگر آج وہ کنیز نہ ہوتی تو عماد الملک سے لاہور دکھانے کی سفارش کرتی۔

"ملک سجاول اور اس کے ساتھی ہمارے اپنے خاندان کے افراد کی مانند ہیں ہمیں ان کی موجودگی کا علم ہوا تو ہم نے خدام کو بھیج کر ان کا سامان اٹھوا لیا ہمیں انہیں دیکھ کر فرحت ہوتی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے ساتھی کا گیت آپ کی طبع پر ناگوار نہیں گزرتا ہوگا"۔ بیگم نے ظاہر کیا جیسے وہ گانے والے کی گستاخی پر معذرت خواہ ہو۔

"حضور کے مہمانوں کی خوشی مقدم ہے، ہم ایسا نہیں سوچ سکتے"۔ گنا بیگم نے محتاط جواب دیا۔

"ہم نے سنا تو سوچا ملک صاحب سے کہیں کہ آپ کے سکون میں خلل نہ ڈالا جائے پھر ہم نے سوچا آپ سے پوچھ لیا جائے آپ کہیں تو ہم منع کرائے دیتے ہیں"۔

"اس کی ہرگز ضرورت نہیں"۔ گنا بیگم نے جواب دیا۔

آج پہلا دن تھا جب مغلانی بیگم نے اس سے شعروشاعری اور احوال و انداز پنجاب کے بارے میں کھل کر باتیں کی تھیں جب وہ آداب عرض کر کے رخصت ہوئی تو نہ صرف اس کے دل سے چوری پکڑے جانے کا خدشہ نابود ہو چکا تھا بلکہ اس کی سوچ نئی راہوں پر ڈھلنے لگی تھی۔

گنا بیگم کے جانے کے بعد مغلانی بیگم بھی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ بات چیت میں گنا بیگم اپنے لئے "ہم" اور "ہمیں" کے الفاظ استعمال کرتی رہی تھی اور "کنیز" ایک دو بار ہی کہا تھا۔ مغلانی بیگم نے اس کا خاص نوٹس لیا تھا، اس نے گنا بیگم کو احساس دلائے بغیر اسے نئی راہ پر ڈالنے میں کافی کامیابی حاصل کر لی تھی اور یہ ظاہر تک نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے گنا بیگم کے موتی بانٹنے کا علم ہو چکا ہے۔

بیگم نے ملک سجاول اور اس کے ساتھیوں کو بلایا اور ان سے احمد شاہ ابدالی کی چالوں کے خلاف مہم کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ جب وہ رخصت ہونے کو اٹھے تو ایک نوجوان کو مخاطب کیا۔ "ہم نے قاسم کی بہادری کی کہانیاں سنی ہیں، ان آنکھوں سے دیکھیں گے"۔

***

وہ سر جھکائے چلتا ہوا اچانک رک گیا تو اس کے ساتھی بھی وہیں رک گئے۔ اس نے محسوس کیا جامع مسجد کا محنت مجھ کر بیٹھے ہوئے وہ تھک گیا ہے۔ تھکن کی نسبائی آنکھوں سے ٹالی اور ساتھیوں سے تھکاوٹ کی شرمندگی چھپانے کے لئے جلدی سے امام کے حجرے کی طرف چل پڑا۔ اسے تھکاوٹ کی وجہ سمجھ نہیں آئی زندگی میں کبھی اس نے اتنی تھکاوٹ محسوس نہ کی تھی۔ لڑائی میں شکار میں اور طویل سفر میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ امام جامع سے معانقہ کر کے وہ خاموش بیٹھ گیا۔ "آج آپ کے ذہن پر فکرِ جہاں کا بوجھ کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے"۔ امام نے پوچھا تو اس کے ساتھی بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ فکرِ جہاں کا بوجھ ہے فکرِ دوراں کا یا فکرِ ذات کا میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ شاہجہان آباد کے قیام میں جو کچھ محسوس کیا، جو کچھ دیکھا اس پر یقین نہیں آتا"۔ ملک سجاول نے امام کی طرف دیکھا۔ "ہم اہل پنجاب کفر سے دفاع کے لئے شاہجہاں آباد کی طرف دیکھتے ہیں یہاں یہ دیکھا کہ ہر امیر وزیر اور جاگیردار کی تلوار اس کے ذاتی مفاد کے حصول اور دفاع کے لئے بے نیام ہوتی ہے ملت کا نہ کوئی سوال ہے نہ اس کی فکر ہے"۔

"امرائے ملت کو مفادِ ملت کی فکر ہوتی تو علماء کو احمد شاہ ابدالی سے درخواست نہ کرنا پڑتی"۔ امام نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"احمد شاہ ابدالی ملت ہند کے مفاد کی کب تک حفاظت کرے گا؟" ملک سجاول نے اس انداز میں پوچھا جیسے کہہ رہا ہو ایسا ممکن نہیں۔

"مسئلہ ملت کے مفاد سے ملت کے وجود تک پہنچ چکا ہے یہ امراء اور وزراء یہ بھی نہ جان سکے کہ ان کا اپنا وجود ملت سے وابستہ ہے۔ خدانخواستہ اگر سلطنت کی عمارت نابود ہوتی ہے تو یہ بھی نہ رہیں گے۔ کفر کے ارادوں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ باہمی سازشوں میں مصروف ہیں"۔

"یہ سب مرکز سلطنت کے زوال سے ہوا شہنشاہ

ہند اپنے وزیراعظم کے ہمراہ آج جلوس بنا کر غضنفر آباد احمد شاہ ابدالی سے یہ درخواست کرنے گئے تھے کہ ان کے جانے کے بعد شاہجہان آباد میں جو چند درجن فسادی گھس آئے ہیں ان سے حفاظت کے لئے دستے بھیجے جائیں ہم ایسے شہنشاہ ہند اور اس کے وزیراعظم سے یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ وسیع وعریض سلطنت کی حفاظت کر سکیں گے اور کفر کی یلغار کو روک سکیں گے؟" ملک سجاول نے ایسے پوچھا جیسے ان کے سامنے خود شہنشاہ ہند بیٹھے ہوں اور وہ خود احمد شاہ ابدالی کے وکیل ہوں اور شہنشاہ سے اس نااہلی پر باز پرس کرنے آئے ہوں۔

"جس شہنشاہ کو تاج وتخت بھیک میں ملیں ہم اس سے کوئی امید وابستہ نہیں کر سکتے صرف اس کے نام کا خطبہ پڑھ سکتے ہیں"۔ امام کے دل کا درد ان کی زبان پر آ گیا۔

"قلعہ معلیٰ کے پاس سے گزرے تو جو سوال اس کی فصیل اور برجوں نے مجھ سے کیا تھا وہی میں حضور سے کر رہا ہوں اس زوال کی مجرم آل تیمور ہے یا ملت اسلامیان ہند؟"

"خود ہم بھی مجرم ہیں آپ بھی اور قلعہ معلیٰ کی فصیل کے پیچھے پناہ گزین شہنشاہ ہند بھی اجتماعی زوال کا کوئی ایک فریق ہی ذمہ دار نہیں ہوا کرتا"۔ امام کی آواز سامنے بیٹھے سب لوگوں تک مشکل سے پہنچ سکی۔

"جب واپسی پر میرے گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو کر مجھ سے پوچھیں گے کہ دارالحکومت شاہجہان آباد میں تم نے کیا دیکھا تو میں انہیں کیا بتاؤں؟" ملک سجاول نے پوچھا۔

"انہیں بتانا کہ شہنشاہ ہند کو ہم نے اپنے امراء اور وزراء سے تحفظ کے لئے بادشاہ کابل و قندھار سے التجائیں کرتے دیکھا علماء اور خطیبوں کو نہایت ادب و احترام سے اس شہنشاہ ہندوستان کے نام کے خطبے پڑھتے سنا درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے درویشوں کو سماع کی محفلوں میں مستانہ وار محو رقص دیکھا اہل مدرسہ کو تلاش دنیا میں گم پایا اور امراء و وزراء کو لوٹتے اور خود لٹتے دیکھا"۔ امام نے جواب دیا۔

"کیا یہ مختصر جواب دینے کی اجازت ہے کہ ہم نے آل تیمور کا سورج منزل زوال میں دیکھا؟" ملک قاسم نے اجازت لے کر امام سے پوچھا۔

امام نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ "اس جواب سے کون اختلاف کر سکتا ہے مگر ملت کا ہر فرد پوچھتا ہے کسی نے صبح نو کے آثار بھی دیکھے ہیں! گر گاؤں کے لوگوں نے یہی سوال پوچھ لیا تو کیا جواب دو گے؟"

"حضور! فرماویں جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہم نے جامع مسجد کے امام کے حجرہ میں متھرا کے ہندوؤں کی گھنٹیوں اور بندرابن کے گائے چرانے والے جوگیوں کی بانسریوں کی آوازیں سنی تھیں"۔ ملک قاسم نے جواب دیا۔

"ہم مایوسی کو گناہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت حال کے بیان سے منع بھی نہیں کر سکتے"۔ امام نے اور بھی آہستہ آواز میں کہا۔ "مگر پنجاب اور لاہور میں حالات مختلف ہونا چاہیے وہ تو کابل وقندھار سے قریب ہیں"۔

"حضور! جب گنگا اور جمنا کے مقام بھنور میں کوئی کشتی ڈولتی ہے تو پوری ڈوبا کرتی ہے۔ لہروں کے زور سے کوئی تختہ الگ بھی ہو جائے تو وہ طوفان میں بہہ جایا کرتا ہے"۔ ملک قاسم کی آواز بھی بہت دھیمی ہو رہی تھی۔

مینارہ مسجد سے مؤذن نے اللہ کی کبریائی کا اعلان کیا تو وہ سب نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ "ہم نے کبھی ترکوں کی تلوار اور کبھی افغانوں کی یلغار میں تحفظ تلاش کرنے کی کوشش کی آج دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانان ہند کو کفر کی یلغار سے نہیں بچا سکے گا"۔ ملک سجاول نے امام کے ساتھ چلتے ہوئے کہا اس

کے ساتھ خاموش تھے۔

امام شاید موضوع کی شدت سے فرار چاہتے تھے۔
"آپ نے کہاں سے سند حاصل کی؟" انہوں نے قاسم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مدرسہ روشن الدولہ میں چند سال گزار کے اسے واپس جانا پڑا"۔ قاسم کی بجائے ملک سجاول نے جواب دیا۔ "سکھوں سے حفاظت کے لئے ہمیں علماء کی بجائے تلوار اٹھانے والوں کی ضرورت تھی۔ خدا نے اسے میدان میں کامیاب بنایا اس کے پاس بہت سی اسناد ہیں"۔

امام نے گردن گھما کر قاسم کو غور سے دیکھا۔ "خدا تعالیٰ نے انہیں فکر و عمل کے میدان جہاد کے لئے خصوصیات سے نوازا ہے"۔ ان کے ذہن میں قاسم کے سوال جواب ابھی تک تازہ تھے۔

مدرسہ روشن الدولہ کے صدر مدرس مفتی شہر اور جامع مسجد کے امام سے ملاقاتوں میں دن بھر مصروف رہنے کے بعد وہ مغرب کے بعد شیش محل پہنچے تو ڈیوڑھی کے سامنے کے میدان میں سامان سفر چھکڑوں اور بیل گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی کا کماندار ملک سجاول کو دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا۔ "بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ حضور کی واپسی سے انہیں فوراً آگاہ کیا جائے اجازت ہو تو اطلاع کروا دوں؟"

"بیگم صاحبہ کے حکم کے بعد ہماری اجازت کی ضرورت نہیں رہتی۔ مہمان خانہ میں ہمیں خبر کر دیں جب فارغ ہوں ہم حاضر ہو جائیں گے"۔ ملک نے گھوڑا خادم کے حوالے کرتے ہوئے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے بیگم صاحبہ بھی احمد شاہ ابدالی کے کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہونے جا رہی ہیں"۔

قاسم نے ملک سجاول کی طرف دیکھا۔

"اگر [illegible] روز آپ کو دے

دیا تھا"۔ ملک سجاول نے اسے مغلانی بیگم کا "قاسم کی بہادری کی کہانیاں ہم نے بہت سنی ہیں، اب آنکھوں سے دیکھیں گے"۔ کہنے کی طرف اشارہ کیا۔

***

احمد شاہ ابدالی کا لشکر خضر آباد سے چل کر بدر پور میں خیمہ زن ہو گیا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ سورج مل کا بیٹا جواہر سنگھ متھرا سے فرار کے بعد بلب گڑھ میں قلعہ بند ہو گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے ارادہ جہاد کی خبر سن کر بھرت پور کا راجہ سورج مل خود کمہیر میں قلعہ بند ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹے جواہر سنگھ اور مرہٹہ سرداروں مانی کشور اور شمشیر بہادر نے متھرا سے نکل کر افغانوں کا راستہ روکنا چاہا اور لڑائی میں اپنے تین ہزار سپاہی گنوا کر مرہٹہ سرداروں کے ساتھ بھاگ کر بلب گڑھ پہنچ گیا۔ جواہر سنگھ نے قلعہ کے دفاعی انتظامات شروع کر دیئے۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے عقب میں جاٹ اور مرہٹہ فوجوں کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا ارادہ بدل لیا اور پہلے بلب گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ بادشاہ نے اس مہم کی قیادت خود کرنے کا فیصلہ کیا۔

عماد الملک بھی اپنے دستوں کے ہمراہ بدر پور میں مقیم تھا۔ مغلانی بیگم کے مشورہ سے فوج بھرتی کر کے وہ جہاد کے لئے شاہ کے ساتھ آن ملا تھا۔ کمہیر کی طرف سفر جاری رکھنے کی بجائے پہلے بلب گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی تجویز اسی نے پیش کی تھی مقامی حالات اور جاٹوں اور مرہٹوں کی گوریلا لڑائی کے طریقوں سے عماد الملک زیادہ واقف تھا اور ابدالی اس کے مشوروں کو اہمیت دینے لگا تھا۔

ایک سہ پہر شاہی لشکرگاہ کے محافظوں نے دور سے ایک قافلہ آتے دیکھا تو ہوشیار ہو گئے۔ خبر رسانوں کو بھیجا کہ معلوم کریں کس کا قافلہ سیدھا لشکرگاہ کی طرف چلا آتا ہے۔ انہوں نے واپس آ کر مغلانی بیگم کی آمد کی اطلاع دی تو شاہ ولی خان نے اپنے عمال کو بیگم کے استقبال کے

لئے روانہ کر دیا اور بادشاہ معظم کو اطلاع بھجوائی کہ بیگم صاحب بھی شریک جہاد ہونے کے لئے پہنچ گئی ہے۔ بادشاہ یہ خبر سن کر مسکرایا۔ ''شہنشاہ ہندوستان ہمیں جہاد کا مشورہ دے کر خود اپنے وزیر اعظم اور امراء کے ساتھ قلعہ معلیٰ میں آرام فرما ہو گیا اور ایک خاتون زنانہ کے آرام سے نکل کر جہاد کے لئے ہم سے آن ملی''۔

بیگم کے لئے شاہی لشکر گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر خیمے لگوا دیے گئے۔ اس رات احمد شاہ ابدالی نے انہیں اپنے ہاں سے کھانے کے خوان بھجوائے۔ مغلانی بیگم میر منو کے ہمراہ سکھوں کے خلاف مہموں میں تو شامل ہوا کرتی تھی لیکن کسی لڑائی میں شریک ہونے کا اس کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا۔ سامان رسد کے وافر ذخیرہ کے علاوہ دو گھوڑسواروں کا ایک دستہ اور پیادے بھی بھرتی کرلائی تھی۔ ملک قاسم اور ان کے ساتھی بھی بیگم کے ہمراہ تھے۔

***

خندق کے گرد چکر لگا کر جاٹ شہزادے نے گھوڑا قلعہ کے مرکزی دروازے کی طرف موڑا تو مخبر نے احمد شاہ ابدالی کے لشکر کی بلب گڑھ کی طرف روانگی کی خبر دی۔ مخبر کی سانس ابھی پھولی ہوئی تھی، جواہر سنگھ نے اسے شاباش دی اور قلعہ دار کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ان کے آرام اور انعام میں تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی''۔ پھر اس نے مرہٹہ سرداروں کی طرف دیکھا۔ ''بادشاہ معظم سے مقابلہ کے اعزاز کے لئے اب ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا''۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''انتظار کے ان خوشگوار لمحوں کو ہمیں مفید کاموں میں صرف کرنا ہوگا''۔ رانی کشور نے مسکراہٹ کا جواب سنجیدگی سے دیا۔ ''غروب آفتاب سے پہلے خندق پانی سے بھر جانی چاہئے''۔

''قلعہ میں پانی کا ذخیرہ وافر ہے، خندق بھرنے میں تاخیر نہیں ہوگی''۔ جواہر سنگھ کی بجائے قلعہ دار نے جواب دیا۔

''ہم نے قلعہ سے فرار کے راستوں کا ابھی جائزہ نہیں لیا خفیہ دروازہ سے نکل کر خندق کیسے عبور کرنا ہے اور جنگل تک کیسے پہنچنا ہے ہمیں شب کی سیاہی پھیلنے سے پہلے سب جائزہ مکمل کرنا ہوگا''۔ رانی کشور نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

''ہم آخری آدمی تک لڑیں گے فرار کا سوال ہی نہیں۔ ہم نے فصیل کے خفیہ دروازوں کے سامنے دیواریں چن دینے کا حکم دیا ہے تاکہ کسی کو فرار کے بارے میں سوچنا تک نہ پڑے''۔ جواہر سنگھ نے فیصلہ سنا دیا۔

''ہم احمد شاہ ابدالی سے لڑائی کرنا چاہتے ہیں خودکشی کرنا ہوتی تو اس کے لئے متھرا سے مقدس اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی وہاں سے نہ بھاگتے تو افغانوں کو کمپیر کا راستہ بدل کر بلب گڑھ آنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی''۔ رانی کشور نے شہزادے کو متھرا سے فرار یاد دلایا۔

''بھاگنا ہے تو لڑائی کی کیا ضرورت ہے؟ قلعہ کے دروازوں کو اندر سے بند کر کے آج رات بھاگ جاتے ہیں۔ ایک دو روز کے محاصرہ اور انتظار کے بعد افغان قلعہ پر قابض ہو جائیں گے اور ہمارا کچھ نقصان بھی نہ ہوگا''۔ جواہر سنگھ نے رانی کشور کے مشورہ پر طنز کیا۔

''لڑائی کی اشد ضرورت ہے اور پسپائی کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، جتنے دن افغانوں کو بلب گڑھ میں مصروف رکھیں گے۔ اتنے دن کمپیر کا ان کا سفر کھوٹا ہوگا اگر ہم افغانوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو وہ بھی ہندوستان کی گرمی کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ہمیں ہر مرحلہ پر ان سے لڑتا اور زیادہ سے زیادہ انہیں مصروف رکھنا ہے تاکہ ہندوستان کا آخری کنارا انہیں بہت دور نظر آئے اور موسم انہیں پسپائی پر مجبور کر دے تب یہ قلعہ پھر ہمارا ہو

گا"۔ مانی کشور نے جواہر سنگھ کو لڑائی اور پسپائی کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہم عبدالصمد کے جال سے نکل کر بھاگے۔ نجیب الدولہ اور جہان خاں کے متھرا میں مقابلہ سے بھاگے اب احمد شاہ ابدالی سے بلب گڑھ کے مقابلہ سے بھاگے تو ہمیں جواہر سنگھ کی بجائے اپنا نام بھاگ سنگھ رکھنا پڑے گا"۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

شمشیر بہادر بھی مسکرا دیا۔ قلعہ دار سر جھکائے دور کھڑا رہا۔

"محسن کا ساتھ چھوڑنا ہماری روایت نہیں، نجیب الدولہ کے دستوں سے مقابلہ ہار جانے پر ہم جاٹوں کی پناہ میں آئے ہیں۔ ان کا احسان ہماری گردن پر ہے۔ جاٹ شہزادہ جو فیصلہ کرے گا، مرہٹہ اس کے پابند ہوں گے لیکن شہزادے کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ عبدالصمد خاں کے جال سے نکل کر نہ بھاگتا تو اسے احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کا اعزاز نصیب نہ ہوتا ہم بلب گڑھ کی لڑائی کمبیر کے دفاع کے لئے لڑیں گے اور کمبیر میں ابدالی سے جنوبی ہند کے دفاع کی لڑائی ہو گی"۔ مانی کشور کے بدلے ہوئے انداز گفتگو سے جواہر سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔

✽✽✽

بلب گڑھ کے قلعہ کے خوبصورت ایوان کے چھت اور دیواروں کی نقش نگار سے شمعوں کی روشنیاں منعکس ہو کر آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔ ریشمی قالینوں کے فرش پر دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے مرہٹہ سردار اور شہزادہ جواہر سنگھ شغل مے و جام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

جواہر سنگھ نے سنہری جام سے آخری گھونٹ لیا تو سامنے کھڑی دوشیزہ اس کا جام بھرنے کے لئے ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گئی۔ جواہر سنگھ نے جام پیچھے ہٹا لیا۔ دوشیزہ پریشان [illegible] روایت مہمان نوازی کی توہین برداشت نہیں کر سکتے"۔ اس نے جام دوشیزہ کے چہرے پر دے مارا۔ "ہمارے مہمان کا جام خالی ہو اور ہمارا جام بھرا ہوا ہو"۔

دوشیزہ کے چہرے سے خون بہہ کر اس کے لباس کو رنگین کرنے لگا وہ اسی طرح گھٹنا ٹیکے بیٹھی رہی۔ دوسری دوشیزہ نے اسی انداز میں جھٹ مانی کشور کا جام بھر دیا تو زخمی دوشیزہ نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو اور خون کی ضرورت ہے یا چہرہ صاف کروں؟

ایک اور دوشیزہ نے گھٹنا فرش پر ٹیک کر جام پیش کیا تو جواہر سنگھ نے اٹھ کر وہ جام زخمی دوشیزہ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ "ہمارے مہمان خون دیکھنے کے عادی نہیں تم اپنے بدصورت چہرے پر گھٹیا خون سجا کے ان کا نشہ خراب کر رہی ہو، اٹھو اور گندگی کی چتا میں جل جاؤ"۔

قلعہ دار نے جلدی سے آگے بڑھ کر زخمی دوشیزہ کا بازو پکڑا اور اسے باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔

جواہر سنگھ کے طنز کا تیر مانی کشور کے دل میں اتر گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور زخمی دوشیزہ کی ٹانگ پکڑ کر اندر کی طرف کھینچنے لگا۔ "اسے یہیں بٹھا دو، ہمارے بہادر شہزادہ کو جام زنی میں ہی مشاق ہو لینے دو"۔

شمشیر بہادر اب تک خاموش بیٹھا دیکھ رہا تھا، مرہٹہ سرداروں کے مغل شاہوں اور شہنشاہوں کے پاؤں کے جوتوں سے محبت کرنے کے طنز پر اسے بھی غصہ آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر قلعہ دار کو گریبان سے پکڑ لیا۔ "تمہیں معلوم تھا کہ بھرت پور کے جاٹ راجہ کو عماد الملک کے جوتے بہت پسند ہیں۔ تم نے اس کے بہادر سپوت کو جام پیش کرنے والی دوشیزہ کو مغلوں کے اس خادم کے پرانے جوتے ہی پہنا دیئے ہوتے"۔

جواہر سنگھ نے ہاتھ کا جام قلعہ دار کے سر میں دے مارا۔ "تم نے اس گھٹیا عورت کے پاؤں میں جوتے کیوں

پہنائے تھے"۔ اس نے اندازہ کیا کہ جوتوں کی زبانی تیراندازی میں مرہٹہ سردار نشانے زیادہ ٹھیک لگا رہے ہیں اور جاٹوں کے خدام اور ملازم سب سن اور دیکھ رہے ہیں۔ "اس کے پاؤں میں سونے کی پائل کیوں نہ ڈالی تمہیں معلوم ہونا چاہئے ہمارے معزز مہمان سنہری بتوں کے پجاری ہیں"۔ اس نے مرہٹوں کے کرایہ کے سپاہی کے کردار پر طنز کیا۔

مانی کشور نے دوشیزہ کی ٹانگ چھوڑ دی وہ لڑکھڑاتا ہوا جواہر سنگھ کی طرف بڑھا تو شمشیر بہادر درمیان میں آ گیا۔ "ابھی نہیں سردار ابھی تو ہمیں ملیچھ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے جواہر سنگھ تو گھڑے کی سنہری مچھلی ہیں، پہلے ملیچھ کو بھگا لیں اس مچھلی کا کیا ہے"۔

شمشیر بہادر کی بات سن کر جواہر سنگھ چونک پڑا۔ "ملیچھ مسلمانوں سے پلید مرہٹہ ہمارے بڑے دشمن ہیں۔ ہمارا وجود تب تک ہے جب تک ان دونوں دشمنوں میں سے کوئی دوسرے پر غالب نہیں آ جاتا"۔ سورج مل نے اسے عمادالملک کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لئے کہا تھا۔

قلعہ دار زخمی دوشیزہ کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا تو جواہر سنگھ لڑکھڑاتا ہوا واپس اپنی نشست پر آ گیا وہ زخمی سانپ کی مانند وِس گھول رہا تھا اس کے اپنے افسروں کے سامنے مرہٹہ سرداروں نے اس کی توہین کی تھی شمشیر بہادر مانی کشور کو کھینچ کر اس کی نشست تک لے گیا۔ خالی جام آگے بڑھایا تو خوفزدہ دوشیزہ نے گھٹنا قالین پر ٹیک کر اس کا جام بھر دیا۔ وہ اٹھا اور بھرا ہوا جام فرش پر دے مارا۔ "سب قصور اس کا ہے"۔ اس نے شکستہ جام کو ٹھڈا مارا۔ "سب قصور اس کا ہے۔ جواہر سنگھ بہادر تمہارے قلعہ کے باہر ملیچھ فوجی جمع ہیں، ہم تو مسافر ہیں یہاں تم حکومت کرتے ہو"۔

***

احمد شاہ ابدالی نے قلعہ کے گرد چکر لگا کر فصیل دروازوں اور دفاعی انتظامات کا خود جائزہ لیا اور مختلف دستوں کی پوزیشنوں کی جگہ متعین کر دی تھی۔ نماز فجر کے بعد دستے شاہی لشکرگاہ سے قلعہ کی طرف روانہ ہوئے تو قاسم نے ملک سجاول سے کہا۔ "سردار! اجازت ہو تو ہم ذرا اس جنگل میں شکار کا جائزہ لے آئیں؟" اس نے قلعہ کے مشرق میں فصیل سے دور تک پھیلے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

"آگ اور بارود کی بارش شروع ہونے والی ہے، شکار خود جنگل سے بھاگنے لگے گا۔ جب فرصت ملے گی تو وہاں کیا رکھا ہوگا؟" ملک سجاول اس کی سادگی پر مسکرایا۔ "تم میدانِ جنگ میں بھی شکار سے باز نہیں رہ سکتے"۔

"سردار! وہ شکار قابو آ گیا جس کا کھوج لگانے ہم جا رہے ہیں تو بادشاہ معظم آپ کو بھی خلعت سے نوازیں گے"۔ قاسم نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے خلعت سے تم زیادہ عزیز ہو، کہیں دور نہ جانا۔ کیا معلوم کب یلغار ہو جائے"۔ ملک سجاول نے ہدایت کی۔

"فصیل اور جاٹ اتنے کمزور نہیں کہ ہماری واپسی کا بھی انتظار نہ کریں"۔ قاسم نے گھوڑے کو جنگل کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

جنگل بہت گھنا تھا سردی سے درختوں اور جھاڑیوں کے پتے جھڑ گئے تھے۔ پھر بھی گھوڑسواروں کو اس میں سے گزرنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ وہ فصیل کے ساتھ ساتھ دور تک گئے اور پھر واپس لوٹ آئے۔ "اگر شکار نکلے گا تو یہیں کہیں سے نکل سکتا ہے"۔ قاسم نے ساتھیوں سے کہا۔

"شکار کے نکلنے سے زیادہ اس کے بھاگنے کے راستوں کا جائزہ لینا لازم ہے"۔ اس کے ساتھی نے کہا۔

جب وہ جنگل کا جائزہ لے کر لوٹے تو آگ اور بارود کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ جاٹ اور مرہٹہ فصیل

کے برجوں سے اس قدر آگ برسا رہے تھے کہ کوئی افغان دستہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ سب سردار اپنے اپنے دستوں کے ساتھ محفوظ فاصلہ پر کھڑے بادشاہ معظم کی طرف سے عام حملہ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ خندق عبور کرنے والے اور کمندیں ڈالنے والے سب تیار تھے مگر بادشاہ کی طرف سے دوپہر تک کسی دستہ کو آگے بڑھنے کا حکم نہیں ملا۔ قلعہ میں داخلہ کے بڑے دروازے کے اوپر سے توپ بھاری گولے پھینک رہی تھی۔ ابدالی نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد شاہ ولی خان کو اپنی توپ بڑے دروازے کے سامنے نصب کرنے اور قلعہ سے چلنے والی توپ پر گولہ باری کا حکم دیا اور اپنے خیمہ میں واپس چلے گئے۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے لڑائی کی صورت حال کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ جاٹوں کی توپ خاموش ہو گئی ہے۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے لمبی دعا کے بعد وہ خیمے سے باہر آئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ کے مرکزی دروازہ کی طرف چل دیئے۔

دروازے کے اوپر کے دفاعی حصار میں بڑے بڑے شگاف پڑ چکے تھے اور جاٹ انجینئر گولوں کی بارش میں ان شگافوں کی مرمت کر رہے تھے، بادشاہ نے گولہ باری روکنے کا حکم دے دیا۔ ”شگافوں کی فکر نہیں توپ تلاش کرو“۔

تھوڑی دیر بعد مشرقی دروازہ کی طرف سے بھاری گولہ باری شروع ہو گئی جاٹ توپچی نے دروازہ کے حصاروں کی مرمت کے لئے توپ ادھر منتقل کر دی تھی تاکہ افغان بھی اپنی توپ کے گولوں کا رخ دوسری طرف موڑ دیں۔

بادشاہ نے توپ کے گولوں کا رخ موڑنے کا حکم دے کر شاہ ولی خان کے دستہ کو بڑے دروازہ پر یلغار کا حکم دیا تو افغان سوار اور پیادے طوفان کی صورت قلعہ کی طرف بڑھے مگر فصیل سے برستی آگ ان کے سامنے دیوار بن گئی۔ جواہر سنگھ کی قیادت میں جاٹ بڑے دروازہ سے برآمد ہوئے اور افغان دستوں پر جھپٹے شاہ ولی خاں نے پہلے سے تیار منصوبے کے تحت اپنے دستہ کو لڑتے ہوئے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا تاکہ جاٹ ان کے تعاقب میں دروازہ اور فصیل سے دور آ جائیں تو ان کو گھیرے میں لیا جا سکے لیکن جواہر سنگھ عبدالصمد خاں سے جال کے تجربہ کے بعد ان کے تعاقب میں نہیں بڑھا۔ افغانوں کے پیچھے ہٹتے ہی وہ قلعہ میں پلٹ گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

بادشاہ نے یلغار ختم کرنے کا اشارہ دیا تو آگے بڑھتے افغان پھر پیچھے ہٹ آئے۔ ”ہم اس معمولی قلعہ کے لئے سپاہیوں کا نقصان پسند نہیں کرتے۔ محاصرہ محفوظ فاصلہ سے کیا جائے اور گولہ باری کا جواب گولہ باری سے دیا جائے“۔ بادشاہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ جاٹ اور مرہٹے قلعہ سے نکل کر حملہ نہیں کر سکتے مگر یلغار کرنے والوں سے وہ جان توڑ کر لڑتے ہیں۔

دن بھر دونوں طرف سے گولہ باری جاری رہی، قلعہ کی فصیل اور برجوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے مگر جاٹ بڑی بہادری سے ان شگافوں کی مرمت کر رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے اندازہ لگایا کہ محاصرہ طویل ہو گا اور محصور جاٹ اور مرہٹے آسانی سے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

غروب آفتاب کے بعد فصیل پر شمعیں روشن کر دی گئیں تو خندق سے آگے دور تک روشنی پھیل گئی۔ دن کے محاصرہ والے افغان دستے لشکر گاہ میں واپس آ گئے اور تازہ دم سوار اور پیدل دستے ان کی جگہ متعین کر دیئے گئے۔

عشاء کی نماز کے بعد قاسم اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں پر زینیں کس لیں اور جنگل کی طرف چل

دیئے۔ ملک سجاول نے ہدایت کی ''جنگل اور شکار دونوں نا آزمودہ ہیں، میں تمہاری واپسی تک سلامتی اور کامیابی کی دعا کروں گا''۔

وہ سلام کر کے ڈیرے سے باہر نکل گئے اور قلعہ کا محاصرہ کرنے والے افغان دستوں کے اوپر سے چکر کاٹ کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ خشک جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے گھوڑوں کے گزرنے سے دور دور تک شور فغاں پھیل جاتا۔ ایک بڑے درخت کے پاس وہ گھوڑوں سے اتر آئے گھوڑے درخت سے باندھ کر ایک ساتھی کو ذرا فاصلہ پر جھاڑیوں میں چھپا کر بٹھا دیا۔ آسمان پر چمکتے ستاروں سے راستہ لیا اور گھنے جنگل میں رات کو شکار کرنے والے چیتوں کی مانند چلنے لگے۔ ان کے پاؤں کے نیچے آنے والے خشک پتوں کی پکار خود ان کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

کافی فاصلہ چلنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔ ''یہ جھاڑیاں تمہارے مورچے ہیں جب تک گولی کی آواز نہ سنو مورچے سے باہر نہیں نکلنا''۔ ملک قاسم نے اپنے چار ساتھیوں کو وہیں چھپا دیا۔ ''شکار جب تک قریب نہ پہنچ جائے اس پر وار کر کے بھاگنے کا موقعہ نہیں دینا''۔

پھر وہ اسی انداز سے چلتے ہوئے کچھ آگے جا کر رک گئے۔ ایک دفعہ پھر آسمان پر چمکتے ستاروں سے رہنمائی حاصل کی اور ایک بڑے درخت کی جڑوں کے ساتھ چاروں ساتھی چاروں طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔

جمادی الثانی کی آٹھویں کا چاند اپنی روشن چادر لپیٹ چکا تو آسمان پر تاروں کی چمک تیز ہو گئی۔ جنگل میں اندھیرا مزید گہرا ہو گیا قاسم نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار اور خبردار رہنے کا اشارہ کیا اور نیزے کی انی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد خشک پتوں نے شکار کی آمد کا اعلان کیا تو ان چاروں نے نیزے پھینکنے کے لئے سیدھے کر لئے، پتوں کی چیخ و پکار اور بھی بلند ہو گئی۔ انہوں نے سانس روک لی جب شکار کی پھولی ہوئی سانس نے اس کی تھکاوٹ کا اعلان کیا تو وہ چاروں جست لگا کر اس پر جھپٹے اور اس کے سنبھلنے سے پہلے تینوں کلاہ پوشوں کو چت کر کے ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے۔ ان کے پٹکے اتار کر ان کے بازو پشتوں پر باندھے اور درخت سے دور لے گئے۔ وہ تینوں جاٹ تھے، بانکے بنے افغان سپاہیوں کے لباس میں انہوں نے بتایا کہ جنگل میں چار اور مقامات پر بھی جاٹ جوان جواہر سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے انتظار میں ہیں جنہوں نے پروگرام کے مطابق چاند غروب ہونے کے ساتھ ہی خفیہ راستہ سے نکل کر جنگل میں داخل ہونا تھا۔ جنگل میں نصف میل کے فاصلہ پر جاٹ دستہ منتظر ہے جو انہیں افغانوں سے دور بھگا لے جائے گا۔ چاند غروب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی، قاسم نے ایک ساتھی کو ان کی نگرانی کے لئے چھوڑا اور اپنے گھوڑوں کی طرف بھاگے۔ جب وہ منتظر دستہ کی جگہ پہنچے تو وہ جواہر سنگھ اور مرہٹہ سرداروں کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے بہت تلاش کیا مگر کوئی نشان نہ ملا۔ قاسم کو شکار ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا مگر یہ خوشی بھی تھی کہ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔

جب وہ تینوں جاٹ نوجوانوں کو اپنے ڈیرے کی طرف لے جا رہے تھے تو ایک ساتھی نے قاسم سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم تھا کہ جواہر سنگھ بھاگ جائے گا؟''

''جواہر سنگھ پچھلے چند دنوں میں ہر مقابلہ سے فرار ہوا پھر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا اس کے پاس''۔ قاسم نے جواب دیا۔ ''لیکن ہمارا راستے کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا، صبح جنگل میں گھوم پھر کر ہم نے اندازہ کیا تھا کہ قلعہ کی فصیل سے آنے والے کے لئے یہ دو ہی راستے ہو سکتے ہیں۔ جواہر سنگھ ہماری نسبت جنگل سے زیادہ واقف تھا''۔

"اگر آپ کو یقین تھا تو ملک سجاول یا شاہ ولی خاں کو کیوں نہ بتایا؟ وہ جنگل کا محاصرہ کر لیتے"۔ اسی نوجوان نے پوچھا۔

"بادشاہ اور وزیر ساتھ ہوں تو شکار کوئی بھی مارے نام ان کا ہی ہوتا ہے"۔ قاسم نے جواب دیا۔

***

فجر کی نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے سرداروں کو بلایا وہ جلد از جلد قلعہ پر قبضہ کر کے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ جاٹ معماروں نے رات میں فصیل کے سب شگافوں کی مرمت کر دی تھی اور مقابلہ کے لئے توپیں درست کر رہے تھے۔ بادشاہ کے خادم خاص نے مداخلت کے لئے معذرت چاہی اور اطلاع دی کہ مغلانی بیگم تشریف لائی ہیں اور فوری حاضری کی خواستگار ہیں۔ بادشاہ کو اس وقت مغلانی بیگم کی آمد پر تشویش ہوئی۔

"ان کے ساتھ تین جاٹ قیدی بھی ہیں"۔ خادم نے بادشاہ کی تشویش کا اندازہ کر کے کہا۔

قیدیوں کا سن کر بادشاہ نے انہیں فوری طور پر پیش کرنے کا حکم دیا۔

مغلانی بیگم نے خیمے میں داخل ہوتے ہی آداب عرض کیا تو بادشاہ اور امراء اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ مغلانی بیگم نے بے وقت مداخلت پر معذرت کی اور بادشاہ کے سامنے مؤدب بیٹھ گئی۔

"ظل دولت جاننا چاہتے ہیں کہ اس وقت حاضری کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" بادشاہ نے براہ راست سوال کیا وہ جلد جاننا چاہتے تھے کہ تین جاٹ کون ہیں۔

"بادشاہ معظم کی یہ خادمہ اس خبر کے ساتھ آئی ہے کہ جواہر سنگھ اور مرہٹہ سردار رات کی تاریکی میں جنگل کے راستے قلعہ سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں"۔

"اس کا ثبوت؟" بادشاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

سب امراء اور سردار مغلانی بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔

"ثبوت وہ تین جاٹ نوجوان ہیں جو ہمارے آدمیوں نے جنگل سے گرفتار کئے ہیں۔ حضور کا حکم ہو تو انہیں اور ملک قاسم کو اندر بلا لیا جائے تاکہ وہ خود ساری تفصیل بتا سکیں"۔

بادشاہ نے ملک قاسم اور جاٹ قیدیوں کو پیش کرنے کا حکم دے دیا۔

ملک قاسم نے اپنے اندازہ جنگل میں راستوں کی تلاش اور رات کی مہم کی تفصیلات سے بادشاہ کو آگاہ کیا۔ جاٹ قیدیوں نے جواہر سنگھ اور ساتھیوں کو جنگل کے راستہ باہر لے جانے اور سواروں کے دستہ تک پہنچانے کے بارے میں اپنے فرائض سے آگاہ کر کے بتایا کہ جواہر سنگھ کے ہمراہ قلعہ سے فرار ہونے والوں کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں ہوگی۔

بادشاہ نے اپنی موتیوں کی تسبیح ملک قاسم کو عنایت کر دی۔ "ظل دولت کو اب اندازہ ہوا کہ ہمیں سپاہ کے ساتھ ماہر شکاری بھی رکھنا چاہئے۔ ہم تمہاری جرأت اور کارکردگی پر خوش ہیں اور دختر عزیز کو مبارک دیتے ہیں کہ ان کے پاس ایسے باصلاحیت نوجوان ہیں"۔

مغلانی بیگم نے شکریہ کے لئے سر جھکا دیا۔

افغان سردار نئی صورت حال پر غور کرنے لگے قلعہ بند جاٹوں کی تیاریوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ اپنے شہزادہ کے فرار کے باوجود ان کے عزم میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

بادشاہ معظم جلد از جلد قلعہ فتح کر کے سورج مل سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

اس صبح بھی لڑائی کا انداز گزشتہ روز والا ہی تھا۔ افغان دستے محفوظ فاصلہ پر یلغار کے لئے مستعد کھڑے تھے اور قلعہ کی فصیل سے توپیں گولے برسا رہی تھیں۔

بادشاہ نے قلعہ کے گرد چکر لگا کر فصیل کا جائزہ لیا اور داخلہ کے بڑے دروازہ اور اس کے حصاروں کی بجائے عقبی دروازے پر گولہ باری کا حکم دے کر واپس اپنے خیمے چلے گئے۔

ظہر کی نماز کے بعد بادشاہ نے ایک بار پھر قلعہ کے چاروں طرف گھوم کر فصیل کا جائزہ لیا۔ عقبی دروازہ کے دونوں طرف فصیل میں بڑے بڑے شگاف پڑ چکے تھے اور جاٹ ان شگافوں کی مرمت کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے مگر گولہ باری کی شدت کی وجہ سے انہیں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بادشاہ نے شاہ ولی خاں کو حکم دیا کہ وہ افغان دستہ کے ساتھ مرکزی دروازہ پر یلغار کر دے اور جب جاٹ قلعہ سے باہر آئیں تو فوری پسپائی اختیار کر کے واپس لوٹ آئے۔ بادشاہ نے اپنے خاص دستہ اور عمادالملک کے سواروں کو عقبی دروازہ پر یلغار کی تیاری کا حکم دیا۔ جیسے ہی شاہ ولی خاں نے قلعہ کے بڑے دروازے پر یلغار کی محصور جاٹ اس کے مقابلہ کے لئے قلعہ سے باہر آ گئے اور فصیل کے اوپر سے آگ برسنے لگی۔ شاہ ولی کے دستہ نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ شاہ نے اپنے دستہ اور عمادالملک کے سواروں کو تیزی سے عقبی دروازہ میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ جاٹ سپاہی اس یلغار کا سامنا نہ کر سکے۔ ان کے دوسرے دفاعی مورچوں تک پہنچنے سے پہلے ہی افغان سوار قلعہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس اطلاع پر بڑے دروازہ کے سامنے جمع جاٹ دستے بڑی تیزی سے پیچھے ہٹے، وہ عقبی یلغار کو روکنے اور قلعہ میں داخل ہو جانے والے افغانوں کو باہر نکالنے کے لئے ادھر بھاگے، قلعہ کے اندر دست بدست لڑائی ہونے لگی، شاہ ولی خاں بھی چکر کاٹ کر عقبی دروازے کی طرف سے قلعہ میں داخل ہو گئے، جاٹ دستوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر افغان یلغار کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور شاہی دستہ کے کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

قلعہ سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت میں زر نقد کے علاوہ سونے چاندی کے برتن، اونٹ، گھوڑے اور غلہ کی بہت بڑی مقدار تھی۔ گھوڑوں میں سب سے قیمتی جواہر سنگھ، مانی کشور اور شمشیر بہادر کی سواری کے گھوڑے تھے جن کی شاہجہان آباد اور بھرت پور میں بہت شہرت تھی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ گھوڑے ان سپاہیوں اور سرداروں کو انعام میں دیئے جائیں جو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار پانی سے بھری خندق پھلانگنے کے مقابلہ میں کامیاب ہوں۔ افغان سردار پہاڑی اور میدانی لڑائی کے ماہر تھے، ان کے گھوڑے رکاوٹیں تو پھلانگ سکتے تھے مگر پانی سے بھری خندقیں عبور کرتے ہوئے بدک جاتے تھے۔ بادشاہ نے بلب گڑھ کی فتح کو نیک فال قرار دیا۔ وہ آگرہ سے ہوتے ہوئے کمہیر کی طرف بڑھنا چاہتے تھے اور اس مہم میں انہیں کھلے میدان کی بجائے قلعہ بند جاٹوں سے مقابلہ پیش آنے والا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ افغان سپاہی اور ان کے گھوڑے پانی اور خندقوں سے واقف ہو جائیں۔ بہت سے افغان سردار اور سپاہی اپنے اپنے گھوڑوں پر زینیں کس کر مقابلہ کے لئے خندق کے پاس قطاروں میں کھڑے تھے۔ بادشاہ معظم شاہ ولی خان اور عمادالملک قلعہ میں داخلہ کے بڑے دروازے کے سامنے مقابلہ دیکھنے کے لئے موجود تھے۔ سب سے پہلے ایک قزلباش سردار آگے بڑھا، گھوڑے کو چکر دے کر تیزی سے خندق کی طرف موڑ دیا۔ بجلی کی رفتار سے دوڑتا ہوا گھوڑا خندق کے کنارے پہنچ کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ سوار نے ایڑی لگائی تو گھوڑا اور سوار دونوں خندق میں جا گرے۔ سپاہیوں کے قہقہوں سے فضا گونج اٹھی، شرمسار سردار پانی میں ڈبکیاں لینے لگا۔ اسے گھوڑے سمیت خندق سے نکال لیا گیا۔ ایک اور افغان سوار اپنا گھوڑا خندق تک لایا۔ اسے پانی اور خندق دکھائے اور گھوڑے کو واپس لے جا کر خندق کی طرف موڑ کر چھانٹا

رسید کیا گھوڑا دوڑتا ہوا آیا خندق کے کنارے پاؤں سکیڑ کر فضا میں اچھلا اور دوسرے کنارے سے ٹکرا کر سوار سمیت خندق میں جا گرا، فضا میں ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا۔

درجن بھر افغان سردار خندق عبور کرنے کے مقابلہ میں ناکام ہو چکے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ مقابلہ میں حصہ لینے کے خواہشمند سب ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں اور ایک ہی وقت میں گھوڑے دوڑا کر سب اکٹھے خندق عبور کرنے کی کوشش کریں۔ چار پانچ درجن گھوڑے بیک وقت خندق کی طرف دوڑے اور ایک کے بعد دوسرا پانی میں گر گئے۔ خندق میں ہر طرف گھوڑے اور سوار ڈبکیاں لے رہے تھے اور افغان سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔ سب گھوڑے اور سوار خندق سے نکالے جا چکے تو بادشاہ نے ہندوستانی سواروں کو خندق عبور کرنے کا حکم دیا۔ ملک سجاول کے سوار مقابلہ کے لئے نکلے تو سب سے آگے ملک قاسم تھا۔ وہ گھوڑے کو چکر دیتا ہوا خندق سے دور لے گیا اور خندق کی طرف موڑ کر اس کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور خود گھوڑے کی پشت سے چپک گیا۔ گھوڑا خندق کے قریب پہنچ کر فضا میں تیرتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ قاسم نے اس کی گردن پر تھپکی دی اور پشت سے نیچے کود گیا۔ ایک افغان سردار نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور بادشاہ معظم کے حضور پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس کے چہرے میں نظریں گاڑ دیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ عماد الملک نے بتایا کہ یہ وہی شکاری ہے جو تین جاٹوں کو گرفتار کر کے لایا تھا۔ بادشاہ نے اسے شاباش دی اور حکم دیا کہ جواہر سنگھ کا گھوڑا ساز سمیت اسے عنایت کر دیا جائے۔

ملک قاسم کے دونوں ساتھی بھی یکے بعد دیگرے خندق عبور کر گئے، ان کے گھوڑے راوی کے کنارے ہونے کے ... دریا ... عبور کرنے کے عادی تھے۔ تینوں گھوڑے ان تینوں جوانوں نے جیت لئے مقابلہ ختم ہو گیا تو ملک سجاول نے درخواست کی کہ ان کے باقی سواروں کو بھی خندق عبور کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ بھی اپنی شاہسواری کا مظاہرہ کر سکیں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اس کے بارہ سواروں میں سے گیارہ نے خندق عبور کر لی۔

بادشاہ ان کے دستہ کے سواروں کی مہارت اور کامیابی سے بہت خوش ہوئے، باقی آٹھ سواروں کو بھی مال غنیمت سے ملنے والا ایک ایک گھوڑا دینے کا حکم دیا مقابلہ کے بعد بادشاہ شاہی لشکر گاہ میں واپس چلے گئے۔

ظہر کی نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے امراء اور سرداروں کا اجلاس بلایا وہ قلعہ کے انتظام اور آگے کے پروگرام کے بارے میں ان سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ جہان خان اور نجیب الدولہ متھرا سے ہوتے ہوئے آگرہ کی طرف نکل گئے تھے جہاں جاٹ فوجیں مقابلہ کے لئے جمع ہو رہی تھیں اور سورج مل کے توپ خانہ کے مشاق کمانڈر مرزا سیف اللہ خود آگرہ کے قلعہ کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ قلعہ پر جہان خان کے پہلے حملہ کو ناکام بنا چکے تھے۔ مرزا سیف اللہ نے اس مہارت سے گولہ باری کرائی تھی کہ افغان فوجیں فصیل کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی تھیں۔ ایلچی ہر محاذ کے بارے میں اطلاعات فراہم کر چکے تو افغان سرداروں نے سب محاذوں کا جائزہ لے کر متھرا اور گوکل کے راستے آگرہ کی طرف بڑھنے کا مشورہ دیا، بادشاہ نے کوچ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

مغلانی بیگم بادشاہ معظم کو اس فتح پر مبارکباد پیش کرنے حاضر ہوئی تو بادشاہ نے دوآبہ جالندھر صوبہ جموں اور کشمیر مغلانی بیگم کو عطا کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر بیگم کے لئے اتنی بڑی عنایت کی کسی کو امید نہ تھی۔ مغلانی بیگم خود بھی کسی انعام کی امید نہ رکھتی تھی جموں اور کشمیر کے پہاڑی صوبے اور دوآبہ جالندھر شمالی

ہندوستان میں بہت اہم علاقے تھے۔ ''اس کامیابی پر مابدولت نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے اور جموں کشمیر اور دوآبہ جالندھر اپنی دختر عزیز کو عنایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے''۔ بادشاہ نے اچانک اعلان کر کے سب حاضرین کو حیران کر دیا۔

مغلانی بیگم نے جھک کر آداب عرض کیا۔ ''اس کنیز پر بادشاہ معظم کا ہمیشہ بے پایاں لطف و کرم رہا ہے، اس عنایت کے شکریہ کے لئے الفاظ اس کنیز کے جذبہ تشکر کا بوجھ اٹھانے سے معذور ہیں''۔

''اس جہاد میں دختر عزیز ہر جگہ ہمارے ساتھ رہیں مابدولت ان کی وفا اور جاں نثاری کے معترف ہیں اور ان کے شاہسواروں کی جہارت سے بہت خوش ہیں جن کی دانشمندی سے بلب گڑھ میں ہمیں شدید جنگ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی''۔

مغلانی بیگم نے ایک بار پھر بادشاہ معظم کے بے پایاں کرم کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اس رات شاہی لشکر متھرا کی طرف روانگی کی تیاریاں مکمل کرتا رہا اور مغلانی بیگم دوآبہ جالندھر اور جموں کشمیر کے انتظامی امور مکمل کرنے میں مصروف رہی۔ صبح جب وہ ابدالی لشکر کے ہمراہ متھرا کی طرف روانہ ہو رہی تھی تو طہماس خان جموں کشمیر اور دوآبہ جالندھر کے لئے بیگم کے مقرر کردہ حاکموں کے نام ان کی طرف سے جاری کردہ اسناد لے کر روانہ ہو رہا تھا۔ بیگم نے دوآبہ جالندھر کا انتظام آدینہ بیگ کے سپرد کر دیا جو ابھی تک اپنی فوج سمیت شوالک کی پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ کشمیر کا ناظم اپنے عزیز خواجہ ابراہیم کو مقرر کیا اور جموں کے راجہ رنجیت دیو وا اپنی طرف سے سند حکمرانی ارسال کر دی۔

خواجہ ابراہیم خان شاہجہان آباد میں مقیم تھے، مغلانی بیگم نے انہیں حکم دیا کہ وہ فوری طور پر انتظامات مکمل کر کے جالندھر کے راستہ کشمیر روانہ ہو جائیں اور وہاں کا انتظام سنبھال لیں۔

شاہجہان آباد میں اس عنایت کی اطلاع پہنچی تو وزیر اعظم انتظام الدولہ اور بھی پریشان ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی اب تک مغلانی بیگم کی ہر درخواست قبول کر رہے تھے۔ بیگم کی توقعات سے بڑھ کر اس پر مہربان رہے تھے۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی، انتظام الدولہ اور امرائے شہر سب جانتے تھے کہ بیگم اپنے داماد عماد الملک کو پھر سے وزیر اعظم ہندوستان دیکھنا چاہتی ہیں اس لئے اس عنایت سے ان کا پریشان ہونا بلا سبب نہ تھا۔ شہنشاہ ہند کو یہ پریشانی تھی کہ انہوں نے احمد شاہ ابدالی سے عماد الملک کے قتل کی درخواست کی تھی اگر وہی عماد الملک وزیر اعظم بنا دیا گیا تو ان کا اپنا انجام کیا ہوگا؟ شہنشاہ کے لئے جاٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی کامیابی کی خبر سے بھی زیادہ یہ خبر اہم تھی اس خوف اور ناپسندیدگی کے باوجود خان خاناں انتظام الدولہ اور ان کی والدہ نواب شولا پوری بیگم نے مغلانی بیگم کو مبارکباد کے پیغامات بھجوائے۔

عماد الملک کا راستہ روکنے کے لئے مغلانی بیگم کے بارے میں احمد شاہ ابدالی کی رائے بدلنا لازم تھا مگر اس کے لئے کیا کیا جائے کسی کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ انتظام الدولہ کے مشیروں نے احمد شاہ ابدالی کو آدینہ بیگ کی سازشوں سے آگاہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ پنجاب میں سکھوں کی سرکشی روکنے میں اب تک کامیابی نہ ہونے کا بڑا سبب آدینہ بیگ تھے جو ان کی مدد کرتے رہے تھے اور اپنے ذاتی اقتدار کے لئے پنجاب میں کسی حاکم کو کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے۔ مغلانی بیگم نے اسی آدینہ بیگ کو دوآبہ جالندھر کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے ابدالی کو بیگم کے اس اقدام کے اثرات سے آگاہ کرنے پر اتفاق کر لیا۔

(جاری ہے)

جگ بیتی

راہِ حیات میں خطائیں سرزد ہو جائیں اور کوئی در بند ہو جائے
تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ نئے در بھی کھل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

عاقب کے خالو احمد ادھیڑ عمر میں بھی خاصے شریر تھے۔ عاقب کی شادی تھی اور انھوں نے دیگوں کے بیچ اپنی کرسی بچھا رکھی تھی۔ اس ادھیڑ اتر کچن کا دھواں اوپری منزل پر کھڑکی کے راستے عاقب کے عروسی کمرے میں جا رہا تھا جہاں وہ دلہن کے ساتھ پہلی رات گزار رہا تھا۔ کڑوے کسیلے دھوئیں سے تو وہ سمجھوتہ کر لیتا مگر باورچیوں کی بھانت بھانت کی بولیوں میں خالو کے فقرے اس کے ذہن پر سوار ہو چکے تھے اور انھیں نظر انداز کر... مشکل تھا کہ وہ ان ذومعنی صداؤں کے پس منظر سے واقف تھا اور بسا اوقات اس کے لیے ہنسی روکنا دشوار ہو جاتا تھا۔ خالو کو ناراض کرنے کا خمیازہ اسے یوں بھگتنا پڑتا کہ اگلے روز دعوتِ ولیمہ میں طعام موجود نہ ہوتا۔

دلہن کا رویہ بھی عاقب کے لیے لمحہ فکریہ بن گیا تھا۔ مانا کہ لجتی شیرنی تھی مگر شیرنی بھی تو دلہن بن سکتی تھی۔ عاقب نے خیال کیا، اسی لمحے حسین و جمیل شیرنی نے اس کے دل پر وار کر دیا اور مباحثے میں الجھ گئی۔ لجتی کی گفتگو کو سراسر غلط کہنا غیر مناسب تھا مگر وہ بے محل ضرور تھی جبکہ

عاقب اس شب بہتر رومانوی طرز فکر اپنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تلخیوں کے لئے عمر پڑی تھی مگر لبنیٰ کا لہجہ تلخ ہوتا گیا تھا جو اس خاتون کی ضرورت سے زیادہ میٹھی حقیقت شناسی میں زہر گھول رہا تھا۔ اس کا موضوع گفتگو کچھ اس طرح کسیلا تھا۔

روایتی سزائیں صرف صنف نازک کے لئے مخصوص ہیں۔ شادی کے موقع پر وہ زندہ لاش کی طرح ایک سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتی ہے اور اپنے ماضی کے تمام رشتے منقطع کر دیتی ہے، صرف ایک مرد کی پراپرٹی بننے کے لئے۔ وہ یہ غلط فہمی لے کر آتی ہے کہ اس کا انجانا ساتھی اپنی کائنات میں اس پر پیار بھری برکھا برسا دے گا اور الفت کی ہمہ رنگ زنجیر سے اسے ایسے بندھن میں باندھ لے گا جس میں صرف جذبوں کی ندرت اور سچائی ہوگی۔ حالانکہ وہ ادراک رکھتی ہے کہ اس کے گرد سجائی جانے والی عارضی دنیا محض صیادوں کا فریب ہوتی ہے اور اس مصنوعی سجاوٹ کو جہنم بننے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔

"تو گویا تم شادی کا بندھن محض سرابوں کا مجموعہ سمجھتی ہو؟" عاقب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"لڑکیوں کا نقطہ نظر دیکھیں تو آپ کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ ماں کہلانے والی ساس کبھی ماں نہیں ہوتی۔ زخموں پر پھاہے صرف میکے والے رکھ سکتے ہیں، سسرال سدا چرکے لگانے پر نازاں رہتا ہے۔ رہا معاملہ شوہر کا تو میرے نزدیک وہ جب ماں کے چنگل سے رہائی پانے کی تدبیر کرتا ہے تو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور بے چارہ والدین اور بیوی کے درمیان پستا رہتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ۔" لبنیٰ حدیں عبور کر گئی۔ یہ خرافات سن کر عاقب کی سٹی گم ہو گئی۔ ماں کا شفیق چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ اپنی دلہن اسے خوبصورت ناگن دکھائی دینے لگی۔

"کاش! میں شادی کرنے سے پہلے موصوفہ سے بات چیت کر لیتا"۔ اس نے تاسف کیا۔

"مرد ہر پہلو خوش نصیب ہوتا ہے، جو اسے گھر کے لئے پلی پلائی خادمہ مل جاتی ہے، جس کا وہ ہر انداز میں استحصال کر سکتا ہے"۔ لبنیٰ نے بات جاری رکھی۔

عاقب نے پھر بھی حالات سنبھالنے کی کوشش کی۔ گرم جوشی سے بولا۔ "میں سعی کروں گا کہ ہماری شاہراہ حیات ہمیشہ پھولوں سے سجی رہے"۔ یہ کہہ کر اس نے دلہن کو پہنانے کے لئے موتیے کا گجرا اٹھا لیا۔ شومئی نصیب کہ پھولوں کی چند کلیاں خاتون کی آغوش میں گر پڑیں اور معاملہ مزید نزاع کا باعث بن گیا۔

"مجھے زرد اور مرجھائے ہوئے، دونوں قسم کے پھولوں سے سخت نفرت ہے"۔ لبنیٰ نے چلا کر کہا اور پھول اٹھا کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیئے۔ عاقب کے چہرے پر ملال جھلکنے لگا۔

اب شیرنی کا روپ مردانہ وجاہت پر غالب آنے لگا تھا، جلد ہی نسوانی لبوں کی پنکھڑیوں سے مزید زہریلے تیر برسنا شروع ہو گئے۔

"ہمارے باہمی عقد میں آپ کی الفت کس قدر شامل ہے، میں نہیں جانتی لیکن اپنے جذبوں کا اظہار برملا کر سکتی ہوں۔ اس شادی کے تحت آپ میرے جسم کے مالک تو بن جائیں گے مگر میری روح آپ سے نفرت کرے گی، شدید نفرت"۔ بات سن کر عاقب کی روح فنا ہو گئی، اسے سنے پر یقین نہ آیا۔

"کیا کہا؟" اس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔ لبنیٰ کے چہرے پر غصہ گہرا ہو گیا۔

"عاقب صاحب! میں اپنی وفا کے پھول کسی دوسرے پر نچھاور کر چکی ہوں، آپ پرائی مہک پر تکیہ کر رہے ہیں۔ میرے دل میں کوئی اور بسا ہوا ہے۔ میں جبراً آپ کے ساتھ نتھی کر دی گئی ہوں۔ اس طور آپ کو صرف

حقارت دے سکتی ہوں'' لبنیٰ نے ارادوں کا اظہار کر دیا۔ اس کے لہجے میں بھری رعد کے باعث عاقب کا دل بھی تنا ہو گیا۔

اس دھچکے پر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی استعداد سے محروم ہو گیا۔ اسے سنبھلنے میں خاصا وقت لگا۔ سنبھلا تو کمرے سے باہر نکل گیا اور خالو کے پاس جا بیٹھا۔ اگلی شام خالو معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔

◆◆◆

دنیا کہتی ہے کہ عورت ایک پہیلی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ہر فرد کہانیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کہانیاں دلوں میں دفن پڑی رہتی ہیں اور عموماً دوسری کہانیوں کا حصہ بنتی جاتی ہیں۔ اجل کئی کہانیاں ختم کر دیتی ہے، نئی بھی جنم دیتی ہے۔

لبنیٰ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی کہی جا سکتی تھی جسے والدین کے غیر متوازن رویوں نے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ اسے اپنی بات منوانے کی ٹوہ پڑ چکی تھی اور اس سلسلے میں وہ جائز و ناجائز کی تمیز بھی کھو بیٹھی تھی۔

صنفِ نازک کی نظر عموماً عمیق مانی جاتی ہے، پھر بھی وہ زندگی کے فیصلوں میں دھوکہ کھا جاتی ہے۔ لبنیٰ دلاور کے سحر میں جکڑی جا چکی تھی۔ دلاور میں سحر انگیزی قدرت نے خوبی کے طور پر رکھی تھی مگر بے ضمیری کے نقائص نے اس کی شخصی خوبی عیب میں بدل ڈالی تھی، گو اس کی عمومی چالاکی اپنا یہ منفی پہلو چھپائے رکھتی تھی۔ لبنیٰ یہ منفی پہلو نہ سمجھ پائی تھی۔

دلاور لبنیٰ کا ہم جماعت تھا۔ دونوں بی اے کر رہے تھے۔ لبنیٰ جانتی تھی کہ چند اور لڑکیاں بھی دلاور کے انتہائی قریب تھیں مگر وہ یہ فریب نہ بھانپ سکی اور خود فریبی کا شکار رہی۔ وہ اپنا روپ اس کا مرکزِ نگاہ جانتی رہی اور اس پہلو مسرور و مسحور بھی رہتی تھی۔ سحر سے لبنیٰ تو شاید سوچ و فکر بھی کر پاتی مگر اب سوچ بچار کے لئے زیادہ نہیں بچا تھا۔

دلاور اس کی آرزوؤں پر غلبہ پا چکا تھا اور وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا جو اس کا مطمع نظر کہا جا سکتا تھا۔ لبنیٰ اب اس کے تعاقب میں گھسٹ رہی تھی۔

لبنیٰ کے والدین شادی بیاہ میں ذات پات کے قائل تھے بلکہ خاندانی بدحالی سے قطع نظر اپنی ذات پات پر فخر کیا کرتے تھے۔ عاقب کا رشتہ ان کے ہاں آیا تو وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے اور میرٹ بیورو کو بساط سے بڑھ کر مالا مال کر دیا لیکن جلد ہی ان کی خوشی ہرن ہو گئی۔ لبنیٰ جس قدر فساد برپا کر سکتی تھی، اس نے کر دیا۔

لبنیٰ کے والد، فیاض ان تمام قباحتوں کا علاج جانتے تھے جو ان کے منصوبوں میں رکاوٹ کا باعث بنا کرتی تھیں۔ وہ احباب کی محفلوں میں ڈنڈے سوٹے کے فضائل پر خوب لیکچر دیا کرتے تھے اور سمجھا کرتے تھے کہ رویوں میں سختی بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیتی ہے۔ انہوں نے اپنا یہ حربہ بدرجہ اتم استعمال کیا۔ اسی سختی کی بدولت وہ بظاہر کامران بھی ٹھہرے اور لبنیٰ کی شادی عاقب سے ہو گئی مگر والدین یہ نہ بھانپ سکے کہ موصوفہ بھی انہی کی بیٹی تھی اور اس کی پرداخت میں شدید کوتاہیاں سرزد ہو چکی تھیں۔

یہ تھی لبنیٰ کی کہانی۔ عاقب کا رشتہ کسی بھی لڑکی کے لئے فخر کا باعث ہو سکتا تھا۔ لبنیٰ کے اعزہ یہ جانتے تھے انہوں نے اس انتخاب کو سراہتے ہوئے لبنیٰ کو خوش نصیب قرار دیا تھا اور اسے شکر بجا لانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس کے محبوب دلاور نے جب اسے مبارک دی تو وہ کبیدہ خاطر ہو گئی اور اس سے لڑ پڑی۔ دلاور کے لئے اپنی جان بچانا مشکل ہو گئی۔

''دیکھو لبنیٰ! اگر تم عاقب سے نجات حاصل کر لو تو میں تمہیں اپنا بنا لوں گا''۔

اس نے تھک ہار کر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ نہ نو من تیل ہو گا، نہ رادھا ناچے گی لیکن اس کا یہی وعدہ تھا جس نے

تمام بربادی جشم دن۔ لبنیٰ کے دماغ پر پردہ پڑ گیا اور وہ ابہام میں مبتلا ہو گئی۔ وہ دلاور کی بات پر یقین کر بیٹھی تھی۔

◆◆◆

عاقب کے والد ڈنمارک میں بزنس کرتے تھے۔ عاقب وہاں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ خاندان اپنے وطن آتا جاتا رہتا تھا۔ تمام اہل خانہ انسانی اقدار سے مالا مال تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے ہاں دولت کی فراوانی تھی، جس کا اظہار عروسی تقریبات میں بدرجہ اتم موجود تھا۔

ضیافت ولیمہ بخوبی انجام پذیر ہوئی سونے میں لدی پھندی لبنیٰ تقریب میں مرکز نگاہ بنی رہی۔ جتنا وہ دکھی، اس سے زیادہ مدعوین اس کے زیورات اور زریں ملبوس دیکھتے رہے۔ چند ایک نے تو اسے گھمنڈی تک کہہ دیا مگر اس کی غیر حاضر دماغی دوسری وجوہات کے باعث تھی۔ اسے اپنا پہناوا کفن جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا حتمی طرز عمل شادی کے دم سے جاری تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ عاقب دوسری شب دلہن کے کمرے میں جانے سے ڈر رہا تھا۔ اسے اپنا بیڈروم آسیب زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ دیر تک وہ اپنے خالو کے پاس بیٹھا رہا حتیٰ کہ والدین کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اس پر جرح شروع کر دی۔ اسے بادل نخواستہ سونے منتقل جانا پڑا۔ اس شب لبنیٰ کھل کر عاقب کے مقابل آ گئی۔

"جناب شوہر نامدار صاحب! بہتر ہوگا کہ آپ مجھے آزاد کر دیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو وہ جانیں چلی جائیں گی۔ رات سوتے میں میں آپ کو ذبح کر دوں گی اور پھر اپنی جان بھی دے دوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتی ہوں جس پر تن من وار چکی ہوں"۔ اس نے برملا کہہ دیا۔ اس دم شیرنی کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ عاقب کو وہ ارادوں میں پختہ دکھائی دی۔

اس شب عاقب بالکل نہ سو سکا۔ لبنیٰ نے پھلوں کی ٹوکری کمرے میں رکھ لی تھی اور اس کے ساتھ چھریاں بھی موجود تھیں۔ ایک چھرا وہ خصوصاً اٹھا لائی تھی، جس کی مدد سے گھر میں ڈبل روٹی کاٹی جاتی تھی۔ عاقب کی آنکھ لگتی تو وہ یہ ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا اپنی گردن پر محسوس کرتا۔ اس کے رتجگے کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ سوچتا کہ وہ والدین کو کیسے باور کرائے گا کہ ان کی نویاہتا بہو باغی ہو گئی ہے اور وہ مرد ہوتے ہوئے بھی صنف نازک سے خوفزدہ ہو چکا ہے؟ دیگر احباب کو وہ کیا منہ دکھائے گا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ انہیں حالات کیسے باور کرائے گا؟ کیا دنیا اس کے کہے پر یقین کرے گی؟ ان تفکرات کے زیر اثر وہ پلنگ پہ لیٹا پہلو بدل رہا تھا جبکہ لبنیٰ خود گہری نیند سو چکی تھی اور بے ضرر بھی دکھائی دے رہی تھی۔

صبح عاقب نے تمام صورت حال اپنے والدین کے گوش گزار کر دی۔ باتیں سن کر ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے مگر سبکی سے ڈر کر وہ بیٹے کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتے تھے۔

عاقب کے والد نے لبنیٰ کو پاس بلایا اور معاملے کی وضاحت چاہی۔ لڑکی نے تمام کردہ خطاؤں کا اعتراف کر لیا۔ اس پر عاقب کے والد نے لبنیٰ سے بلاتردد کہہ دیا کہ وہ بابمی ناطہ جوڑنے کی غلطی کرنے پر افسردہ ہیں۔

"ہم تمہیں بڑی چاہ سے اپنے گھرانے میں لائے تھے مگر افسوس کہ تمہارے بھیدوں سے قطعی ناواقف تھے"۔ عاقب کے والد نے کہا۔ "ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہم ہمارے ہمراہ اب نئی زندگی شروع کر سکتی ہو، چاہو تو واپس بھی جا سکتی ہو۔ واپسی کے لئے تمہیں صرف ایک دروازہ کھولنا پڑے گا۔ باقی دروازے تمہارے لئے میں خود کھولوں گا"۔ عاقب کے والد نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں مشورے سے نواز دیا۔ خفگی ان کے چہرے پر بھی عیاں ہو گئی تھی۔

''میں اس ناگوار بندھن سے نبھاہ نہیں کر سکوں گی''۔ لبنیٰ نے فوراً اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''تو پھر تم جا سکتی ہو''۔ عاقب کے والد نے فیصلہ تسلیم کر لیا اور کئی ہدایات پر بات جاری رکھی۔ ''زیورات جو تمہیں تحفتاً ملے تھے، تم ہمراہ لے جا سکتی ہو۔ حق مہر کی رقم تمہیں مل جائے گی۔ احباب سے ملنے والے تحفے بھی تمہارے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی جو تم چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔ تمہارے جانے کے بعد کاغذی کارروائی مکمل کر دی جائے گی اور ہاں، اپنے والدین کو ناگوار معاملے سے تم خود آگاہ کرو گی''۔ عاقب کے والد نے وضاحت مکمل کی۔

''مجھے میرے گھر پہنچا دیں''۔ لبنیٰ نے سسرال میں آخری درخواست کی۔ ''اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہئے''۔ اس نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناگوار بندھن سے آزاد ہو چکی تھی۔

لبنیٰ اجڑ کر واپس اپنے گھر پہنچی تو وہاں افراتفری مچ گئی۔ اس نے روئیداد سنائی تو ہر سو قیامت برپا ہو گئی۔ باپ کا چہرہ افسردگی پر منجمد ہو گیا جبکہ ماں پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ خبر خاندان بھر میں پھیل گئی۔ احباب مدد کو پہنچے، جبکہ کئی جاننے والے افسوس کرنے امڈ آئے۔ اس انہونی پر ہر قسم کے تبصرے وجود پانے لگے۔ کچھ لوگ دکھی ہوئے، چند ایک نے تماشا بنا لیا۔

''لڑکی کو شادی کے بعد پتہ چلا کہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اس لئے شروع ایام ہی میں ان کے بیچ جھگڑا ہو گیا''۔ لڑکی کے والدین پریشانی میں ہر کسی سے یہی کہہ رہے تھے۔ سننے والے کانوں پر انگلیاں دھر رہے تھے۔ لبنیٰ نے زندگی میں پہلی بار والدین کو یوں جھوٹ بولتے ہوئے سنا تھا۔ بہر[illegible] لیکن کبھی کبھی وقت کے ساتھ معاملہ دب جاتا تھا۔ جو [illegible] نہ ہو سکا تھا۔ والدین سے بھی ان کا ناطہ سرد مہری کا شکار ہو گیا اور ان

سے بات کرنا بھی اسے محال دکھنے لگا۔

◆◆◆

شادی کے بعد لڑکی والدین کے گھر بطور مہمان آتی ہے۔ اپنے گھر بس جائے یا نہ بس پائے، نفسیاتی طور پر آبائی گھر میں اس کی حیثیت وہ نہیں رہتی جو رخصتی سے پہلے ہوتی ہے۔ لبنیٰ کو یہ احساس اپنی تباہی کے بعد ہوا۔

وہ خاندان میں رہتے ہوئے بھی اہل خانہ سے بچھڑ چکی تھی۔ گھمبیر صورت حال نے اس پر ذہنی بوجھ بڑھا دیا اور اس تناؤ کے تسلسل نے اس سے شخصی رویوں میں توازن کی قوتیں چھین لیں۔ اس کے پاس کوئی چارہ کار نہ رہا بجز اس کے کہ وہ دلاور کی پناہ اپنانے کی فیصلہ کن کوشش کرے۔

"میں آج کل بہت مصروف ہوں، فراغت ہوگی تو ہم مل بیٹھیں گے اور مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کریں گے"۔ دلاور ٹیلی فون پر لبنیٰ کے مسلسل تقاضوں کا یہی جواب دیتا تھا جو اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ لبنیٰ کو دلاور کے برتاؤ میں گرمجوشی کا فقدان بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ دونوں کے بیچ روابط گزرتے وقت کے ساتھ معدوم ہوتے جارہے تھے۔ لبنیٰ کا ذہنی تناؤ اس وم حدیں چھونے لگتا جب دلاور اس کا فون اٹھانے سے گریز کرتا اور اسے پیغام رسانی کے لیے سہیلیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ ان واقعات کے باعث اس کی مایوسی بڑھتی جارہی تھی۔ اکثر پچھتاوے اس کے ذہن میں آتے اور وہ روتی رہتی۔

ایک رتجگے کے بعد وہ صبح سویرے اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی، جو اس وقت کچن میں طعام پر طبع آزمائی کر رہی تھی۔ لبنیٰ ماں کے قریب آکر بُری طرح رونے لگی۔ ماں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کام کاج کے سلسلے میں کچن سے باہر نکل گئی۔ اس روز لبنیٰ بے حد پریشان رہی۔ ناطوں کے تمام بندھن اسے زنگ آلود دکھے۔

اسے یہ بھی ادراک ہو چکا تھا کہ وہ کبھی بھی دلاور کی تمنا نہیں تھی اور اب وہ سرابوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

شام اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس روز موسم سرد تھا اور ارضی یخ بستگی اپنے عروج پر دکھائی دیتی تھی۔ ابر کی باریک پھوار ہواؤں میں رچ گئی تھی۔ سرد باد کے تھپیڑے جسموں کا لہو جما رہے تھے۔ حیات ارضی پناہ گاہوں میں سمٹ گئی تھی۔ لبنیٰ سڑکوں پر دیر تک بلا مقصد گھومتی پھری، پھر شہر کے دوسرے کونے کی طرف چل پڑی۔ نہ جانے کتنی دیر چلتی رہی۔ تھکاوٹ کا احساس اسے بے معنی دکھنے لگا۔ کبھی اکا دکا راہگیروں کی توجہ میں بھی آئی جنہیں اس نے نظر انداز کردیا اور بے خوف آگے بڑھتی رہی۔ دیر سے ایک برقعہ پوش خاتون اس کا تعاقب کررہی تھی لیکن لبنیٰ اس سے بھی بے نیاز رہی۔

آخر وہ جب مانوس گلیوں کی طرف مڑی تو اسے وہ گھر دکھائی دینے لگا، جہاں رنگ ونور کی بارات اتر آئی تھی۔ وہاں جولانی اپنے جوبن پر تھی اور گرم جوشی نے جاڑے کو پچھاڑ دیا تھا۔ شادمانی میں ہر چہرہ دمک رہا تھا۔ لبنیٰ کہکشاں میں آگے بڑھتی رہی، حتیٰ کہ برقی شمعوں میں گھرے آتشیں الاؤ کے کنارے پہنچ گئی جہاں سٹیج پر پھولوں کی پھبن دیدنی تھی۔

وہاں دلاور جلوہ فگن تھا، تمکنت سے آلودہ۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں دلہن اس کی طرف لائی جارہی تھی۔ لبنیٰ منظر کی تاب نہ لاسکی۔ صدمے کے باعث اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ لڑکھڑا کر بمشکل سنبھلی۔ موسیقی کی تانیں اسے ماتمی سنگیت سنائی دینے لگیں۔ آتش بازی کے شعلے بھڑکے اور جہنمی آگ کی صورت ہر سو پھیل گئے۔ ہر طرف قیامت سی مچ گئی۔ پھر تمام چہروں پر آنکھیں ابل پڑیں اور لبنیٰ پر مرکوز ہوگئیں۔ اسے اردگرد بدروحیں ناچتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس کے اپنے گلے سے بھی ہذیانی صدائیں پھوٹ رہی تھیں۔ اسے اپنا بدن نیم جلی لاش کی

طرح سجھائی دینے لگا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی اپنی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے تھے۔ دلاور اسے دیکھ چکا تھا۔ اسے وہاں پا کر وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ لبنیٰ کے گلے سے غراہٹ سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس پر جھپٹ پڑی اور تصور میں اپنے تیز لمبے ناخن اس کی گردن میں گاڑ دے چکی تھی۔

ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ کئی باراتی سٹیج کی جانب دوڑے اور دلہا کو حملہ آور لڑکی سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ نفسیاتی ہیجان نے لبنیٰ کی گرفت میں توانائی جو عادی تھی۔ دلاور کو بمشکل شکنجے سے رہائی ملی۔ اس دم وہ سٹیج پر دلہن کے قدموں گرا پڑا تھا۔ بہنیں اس کی گردن سہلا رہی تھیں۔ ماحول میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"تم نے یہ کیوں کیا؟" دلاور کے والدین لبنیٰ کی طرف لپکے۔ لبنیٰ اپنی ہذیانی حالت سے نکل رہی تھی مگر بے حد بے چین تھی۔ اس دم لڑکیاں بھی اس کی مدد کر رہی تھیں۔ کچھ سنبھلی تو بے ساختہ بول پڑی۔

"معافی چاہتی ہوں جو میں آپے سے باہر ہو گئی تھی اور تقریب میں بدمزگی کا باعث بنی۔ شاید ابھی بھی میں اپنے اوسان میں نہیں ہوں۔ آپ لوگوں کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ یہ شخص، جو دولہا کی پوشاک پہنے کھڑا ہے، کئی معصوم لڑکیوں کا گنہگار ہے۔ میں بھی اس کی ہوس کا شکار ہو چکی ہوں۔ مجھ میں ہمت تھی جو یہاں اس کے مقابل آ گئی اور اس کا کچا چٹھا کھول رہی ہوں، ورنہ کئی شریف زادیاں گھروں میں بیٹھی اسے بددعائیں دے رہی ہیں۔ یہ معاشرے کا ناسور ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ اپنے کارنامے شادی کے بعد بھی جاری رکھے گا اور کئی معصوم لڑکیوں کو تباہ کر دے گا۔ اپنی خطائیں مانتی ہوں جو اس کے جھانسے میں آتی رہی۔ میں برباد ہو چکی ہوں اور اسی شخص کے ہاتھوں جو آج اپنی صفائی دینے سے بھی عاری ہے۔" لبنیٰ کی آواز بھرا گئی اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ پھر بوجھل قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ جانتی تھی کہ وہ تماشہ بن چکی تھی۔ نظروں نے اسے بتا دیا تھا۔

لبنیٰ بڑی سڑک کے کنارے پہنچی تو نڈھال ہو کر بھاری پتھر پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہر نوع کی گاڑیاں فراٹے بھرتی رواں دواں تھیں۔ وہ کسی تیز بھاری گاڑی کے آگے کود جانا چاہتی تھی۔ اس ارادے سے اٹھی تو کسی نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ کوئی شخص اسے خودکشی کرنے سے روک رہا تھا، کیونکہ وہ اس کے ساتھ لگا ہوا سڑک پر گھسٹ رہا تھا۔ لبنیٰ کو اپنا منفی ارادہ بدلنا پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کا محسن مرد نہیں، کمزور سی خاتون تھی اور وہ برقعے میں لپٹی ہوئی اس کی اپنی ماں تھی جو کھینچا تانی میں کھردری سڑک پر زخمی ہو چکی تھی۔ لبنیٰ ماں کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"دیکھو بیٹی! ہر شخص اپنے طور پر الگ ذہن رکھتا ہے۔ کئی نوعمر اپنے بڑوں کے تجربات سے سیکھ لیتے ہیں مگر ایسے افراد بھی موجود ہیں جو فقط اپنے تجربوں سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے نادان بھی اسباق شناس ہو جاتے ہیں، مگر کڑی آزمائشیں سہہ لینے کے بعد۔ راہِ حیات میں خطائیں سرزد ہو جائیں اور کوئی در بند ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ نئے در بھی کھل جاتے ہیں۔ درِ بہار پر دستک کبھی ترک نہیں کرنی چاہیے، خواہ خزاں کا فسوں گہرا ہی کیوں نہ ہو۔" ماں کی آنکھوں میں آس کے دیے روشن تھے۔

لبنیٰ نے ماں کی طرف دیکھا، پھر ممتا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ماں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں گھر کی طرف چل پڑیں جہاں فیاض نے بیٹی کو گلے لگا لیا۔

"یہ رشتے کس قدر بے لوث ہوتے ہیں"۔ لبنیٰ سوچنے لگی پھر پچھتاووں نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔

OOO

پوسٹ ماسٹر نے کہا مجھے معلوم ہے مفرور کی گرفتاری پر انعام مقرر ہے مگر میں اس کی عورت کی خاطر یہ انعام قربان کر رہا ہوں۔

بھگوڑا

☆ علی اکبر جتوئی

ہر ملک کی فوج سے سپاہی بھگوڑے ہوتے رہتے ہیں اور پولیس انہیں ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جلدی یا تھوڑے عرصے بعد بھگوڑے سپاہی پکڑے جاتے ہیں اور انہیں سزائیں دی جاتی ہیں۔ فوج سے بھاگنے کی سب سے بڑی وجہ جنگ ہوتی ہے۔ سپاہی موت کے خوف سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسری وجہ فوج کی سخت زندگی ہے جسے بعض آدمی برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ فوج کا بھگوڑا پکڑا نہ گیا ہو۔ ایک انسان آخر کب تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکتا ہے۔ بعض سپاہیوں نے روپوشی کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ان میں سپین کا ایک آدمی مینوئل کورٹس تھا جو تیس سال روپوش رہ کر اپریل 1969ء میں لوگوں کے سامنے آیا۔

جب وہ روپوش ہوا اس کی عمر چونتیس سال تھی۔ وہ چونسٹھ برس کی عمر میں باہر نکلا۔ وہ سپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرینکو کی فوج کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خانہ جنگی 1939ء میں ختم ہوئی اور فتح فرینکو کو ہوئی۔ اس نے اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنے مخالفین کی گرفتاریاں شروع کر دیں جو اس کی مخالف فوج یعنی پہلی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ کورٹس کی گرفتاری کے بھی احکام جاری ہوئے۔ وہ اپنے مکان کی سیڑھیوں کے نیچے کوڑے کباڑ کے ایک ڈربہ نما کمرے میں چھپ گیا۔ گھر والے اسے وہیں روٹی پانی دیتے رہے اور انہوں نے یہ افواہ بھی پھیلا دی کہ وہ خانہ جنگی میں مارا گیا تھا۔ تاہم پولیس نے اس کے گھر چھاپے مارے لیکن پولیس کو بھی گمان تک نہ ہوا کہ اس کوڑے کباڑ کے اندر ان کا مطلوبہ ملزم چھپا ہوا ہوگا۔ پولیس نے کئی بار یہ کمرہ کھلوایا اور تاک سکیز کر بند کر دیا تھا۔ آخر پولیس نے اس افواہ پر یقین کر لیا کہ کورٹس جنگ میں مارا گیا تھا۔

تیس سال بعد اپریل 1969ء میں جب کورٹس کے خاندان کی ایک اور نسل جوان ہو چکی تھی بلکہ یہ نسل بھی

بال بچے دار ہو گئی تھی۔ جنرل فرینکو نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور حکم نامہ جاری کیا کہ اب کسی کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اسی حکم کے تحت جو لوگ جیلوں میں پڑے تھے، انہیں بھی عمر قید سے رہائی دے دی گئی۔

مینوئل کورٹس جو جوانی میں روپوش ہوا تھا، بڑھاپے میں ڈربے سے نکلا۔ جب وہ باہر نکلا تو دو ایسے آدمیوں نے اسے دیکھا جو اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ وہ الٹے پاؤں بھاگ اٹھے اور تھوڑی دیر بعد قصبے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ خانہ جنگی میں جو کورٹس مارا گیا تھا، اس کی بدروح گھر کے دروازے پر کھڑی دیکھی گئی ہے۔ بعض دلیر قسم کے نوجوان بدروح کو دیکھنے کے لئے اس کے گھر کی طرف چل پڑے اور باقی لوگوں نے اس کے گھر کے سامنے کا راستہ چھوڑ دیا۔ بڑی مشکل سے لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ یہ جیتا جاگتا مینوئل کورٹس ہے، بدروح نہیں۔

کورٹس کا قائم کیا ہوا ریکارڈ برطانیہ کے ایک سپاہی ولیم گارفیلڈرو کے ریکارڈ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ ولیم فوج سے بھاگ کر چالیس سال روپوش رہا تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران 1915ء میں بھگوڑا ہوا تھا اور 1955ء میں باہر نکلا۔

وہ روپوشی سے اس طرح باہر آیا کہ 1955ء میں ایک علاقے میں ڈیوٹی پر گھومتے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو ایک غلیظ سا بوڑھا آدمی کچھ گھبرایا گھبرایا سا اور مشکوک حالت میں پھرتا نظر آیا۔ پولیس کانسٹیبل نے اس سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میری ماں مر گئی ہے۔ اس کے کفن دفن کے لئے مجھے کسی کی مدد چاہئے۔ پولیس کانسٹیبل اس کے ساتھ چلا گیا۔ جب ولیم اسے اپنے گھر لے گیا تو وہ حیران ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس گھر میں صرف ایک ضعیف عورت رہتی ہے جس کا ایک بیٹا پہلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔

اس گھر کے سامنے پہلی جنگ عظیم میں اس گاؤں کے مرنے والوں کا ایک یادگاری مینار تعمیر کیا گیا تھا جس پر اس بوڑھی عورت کے بیٹے کا نام "ولیم گارفیلڈرو" بھی کندہ تھا۔ یہ نام اس کی ماں نے دوسرے مرنے والوں کی فہرست میں لکھوایا تھا۔ اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کا بیٹا مارا گیا ہے بلکہ وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ یادگاری مینار اسی عورت کی کوشش سے تعمیر ہوا تھا۔ وہ ہر کسی کے پاس جا کر روتی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا مارا گیا ہے۔ اسی طرح اس علاقے کی ماؤں کے کئی جوان بیٹے مارے گئے ہیں۔ ان کی تسکین کے لئے کوئی یادگار تعمیر کرنی چاہئے۔ چنانچہ لوگوں نے چندہ جمع کر کے یہ مینار تعمیر کیا جس پر مرنے والوں کے نام کندہ کئے گئے۔ ان میں اس آدمی کا بھی نام تھا جو چالیس سال بعد پولیس کانسٹیبل کو گھر لایا تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا تھا کہ ولیم زندہ ہے اور اپنے یادگاری مینار سے تھوڑی ہی دور ایک مکان کے اندر بڑی ساری الماری میں چھپا ہوا ہے۔

جب ولیم کانسٹیبل کو اپنے گھر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ چارپائی پر ایک ضعیف عورت کی لاش پڑی تھی۔ کانسٹیبل نے ولیم سے پوچھا کہ یہ عورت اس کی ماں نہیں ہو سکتی کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ یادگاری مینار ہے جس پر اس کا نام کندہ ہے۔

ولیم نے کانسٹیبل کو اپنے فوجی کاغذات (پے بک وغیرہ) دکھائے اور ثابت کر دیا کہ وہ اس عورت کا بیٹا ہے اور وہ مرا نہیں تھا بلکہ اس الماری میں چھپا رہا تھا۔ اس نے کانسٹیبل کو بتایا کہ جب اسے جنگ میں جانے کا حکم ملا تو وہ آخری بار ماں سے ملنے کے لئے آیا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ اس کی بیوہ ماں بیٹے کی جدائی اور موت کے خوف کو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے بیٹے کو گھر میں چھپا لیا۔ پھر اس نے لکڑی کی ایک بہت بڑی الماری بنوائی جس میں بیٹے کو بند کر دیا۔ فوجی اور سول پولیس نے اس کے گھر

کئی بار چھاپے مارے لیکن کسی نے کبھی الماری کو ہاتھ نہ لگایا۔ ماں نے بیٹے کو سوائے رات کے وقت ایک دو گھنٹوں سے زیادہ الماری سے باہر نہ نکلنے دیا۔ وہ الماری بند کر کے تالا لگا دیتی تھی اور خود محنت مزدوری کر کے بیٹے کو الماری میں کھانا دے دیتی تھی۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی تو بھی ماں نے اسے باہر نہ نکلنے دیا بلکہ لوگوں کو آنسوؤں سے متاثر کر کے مرنے والوں کا یادگاری مینار تعمیر کروا دیا۔ اکیس سال بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ جنگ بھی ختم ہو گئی۔ دس سال بعد دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں پر نئی عمارتیں کھڑی ہو گئیں اور لوگ اس جنگ کو بھی بھول گئے۔ ماں نے بیٹے کو پھر بھی الماری سے نہ نکالا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا بیٹا پکڑا جائے گا اور اسے گولی مار دی جائے گی۔ آخر ایک روز ماں مر گئی۔ الماری کا تالا کھلا تھا ولیم باہر نکلا۔ دیکھا کہ ماں مری ہوئی تھی۔ اس کے پاس پلے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ باہر گیا اور اس پولیس کانسٹیبل کو ساتھ لے آیا۔ اس نے سرکاری طور پر بڑھیا کو دفنا دیا پھر ولیم کے متعلق فوج کو اطلاع دی لیکن فوج نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔

15 اگست 1963ء کی صبح لوگوں نے دیکھا کہ ولیم کی لاش اس کے دروازے کی دہلیز پر پڑی تھی۔ اسے ڈنڈوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کے قاتلوں کا سراغ لگا لیا گیا۔ وہ دو جواں سال آدمی تھے۔ انہوں نے اقبال جرم کر لیا اور بیان دیا کہ انہیں یقین تھا کہ اس آدمی نے گھر میں پہلی جنگ عظیم میں کہیں سے لوٹا ہوا خزانہ چھپا رکھا ہے ورنہ وہ اتنا عرصہ ایسے پُراسرار طریقے سے روپوش نہ رہتا۔ یہ دونوں آدمی جب اس کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ جاگ پڑا۔ اس نے ان کا مقابلہ کیا لیکن وہ بہت بوڑھا تھا اور ڈاکو جوان بھی تھے اور ڈنڈوں سے مسلح بھی۔ انہوں نے ڈنڈے مار مار کر جان سے مار دیا۔ جب گھر کی تلاشی لی تو کل چار پونڈ یعنی پچاس ساٹھ روپے برآمد ہوئے۔

ولیم مارے جانے کے ڈر سے ہی چالیس سال گھر میں چھپا رہا تھا۔

ایسے بہت سے ملکوں کے سپاہی گزشتہ جنگ عظیم کے دوران فوج سے بھاگے تھے جو جنگ ختم ہونے کے دس دس اور پندرہ پندرہ سال بعد روپوشی سے نکلے ہیں۔

پاکستان کے ایک قصبے کا ایک آدمی پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی فوج سے بھاگا تھا اور پچیس سال پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل کر روپوشی میں مر گیا تھا۔ پولیس کے ہاتھ وہ اس وقت آیا جب وہ مر چکا تھا۔ میں اس کا اور اس کے قصبے کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اس کی اولاد کی اولاد پاکستان کے کسی اور قصبے میں باعزت زندگی گزار رہی ہے۔ یہ آدمی انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں جمعدار تھا جسے اب نائب صوبیدار کہتے ہیں۔ وہ غالباً فوج کے سپلائی کے محکمے میں تھا۔ ہم اس وقت بچے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ جب چھٹی آیا کرتا تھا تو نہایت قیمتی فرنیچر اور بیش قیمت سامان لایا کرتا تھا۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی فوج کے جمعدار کو اتنی تنخواہ نہیں ملتی کہ وہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر سکے۔ اس کی بیوی بچے شہزادوں کی طرح کپڑے پہنتے تھے۔

ایک روز پولیس کی پوری گارد نے اس کے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ خود گھر نہیں تھا، نوکری پر تھا۔ ایک تھانیدار اور دو سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ جمعدار کے بیوی بچوں کو انہوں نے باہر نکال دیا اور گھر کے کونے کونے کی تلاشی ایسی سختی سے لی کہ ٹرنک تک صحن میں نکال کر کھول کھول کے دیکھے۔ پھر تھانیدار بہت دیر اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کرتا رہا اور پولیس چلی گئی۔ اس کے بعد دو آدمی اکثر ہماری گلی میں آتے اور گلی میں گھوم پھر کر چلے جاتے۔ ایسے دو آدمی اس کے مکان کے پچھواڑے

کھیتوں میں بھی اکثر گھومتے دیکھے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ سی آئی ڈی کے سپاہی ہیں۔

چند دنوں بعد آدھی رات کے وقت گلی میں شور اٹھا تو لوگ باہر نکل آئے۔ دیکھا کہ پولیس کی گارد (آٹھ دس سپاہی) اس کے گھر کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے بیوی بچوں کو جگا کر گلی میں نکال دیا تھا اور گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ سپاہی مکان کی چھت پر بھی گھومتے پھرتے رہے۔ اس کے بعد پولیس اس کی بیوی اور محلے کے دو معزز آدمیوں کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔

ہم بچے تھے۔ ہمیں کوئی نہ بتاتا تھا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ جمعدار فوج سے بھاگ گیا ہے اور پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ تلاشیوں اور چھاپوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ پولیس رات کے وقت اچانک آ جاتی اور اس کے بیوی بچوں کو گھر سے باہر نکال کر سارے گھر کی تلاشی لیتی۔

ہم بڑے ہو گئے تو بھی یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ جمعدار فوج میں راشن اور کپڑوں کے سٹور کا انچارج تھا۔ وہ سامان نکال نکال کر بیچتا رہتا تھا۔ اسی آمدنی سے اس کا کنبہ شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حرام کی اس دولت سے یہ شخص فرعونوں کی طرح مغرور ہو گیا تھا اور اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہ کہہ کر مغرور بنا دیا تھا کہ محلے اور برادری کا کوئی گھرانہ تمہاری برابری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہر کسی کے سامنے اکڑ کر رہا کرو۔

مجھے اس کے سفلے پن کی ایک مثال یاد ہے۔ یہ اس کی روپوشی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس دور میں ریڈیو ابھی ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ گراموفون کا رواج تھا جو کسی روپے پیسے والے کے گھر ہی آ سکتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ جمعدار چھٹی آیا ہوا تھا۔ لوگ چھتوں پر سویا کرتے تھے۔ یہ جمعدار رات کے وقت اپنے کوٹھے پر ایک کی بجائے دو گراموفون اکٹھے بجایا کرتا تھا۔ دونوں پر مختلف ریکارڈ لگے ہوتے تھے۔ اس طرح وہ دولت اور بڑے پن کی نمائش کیا کرتا تھا۔ گاؤں اور قصبے میں بھائی چارے کی فضا ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے سلام کیا کرتے تھے یا ذرا سی دیر رک کر ایک دوسرے کی خیریت پوچھا کرتے تھے مگر یہ جمعدار چھٹی آتا تھا تو نہ کسی سے ملتا تھا نہ کسی کو سلام کرتا تھا بلکہ کہا کرتا تھا کہ میں جمعدار ہوں لوگ مجھے سلام کیا کریں۔

اسے جس دولت پر ناز تھا وہ انگریز کے سٹوروں سے چرائے ہوئے مال سے آ رہی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ سٹوروں سے اتنا مال باہر نکل گیا جسے جمعدار صاحب چھپا نہ سکے۔ چیکنگ ہوئی تو ہزاروں روپوں کی مالیت کا سامان غائب تھا۔ اس وقت کا ایک ہزار روپیہ آج کے دس ہزار کے برابر ہوتا تھا۔ اسے پکڑ لیا گیا۔ وہ کسی طرح بھاگ نکلا۔ قصبے کی پولیس کو اطلاع دی گئی جس نے پہلا چھاپہ مارا۔ پھر کئی سال چھاپوں اور تلاشیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بیوی بچوں کو ہم نے بادشاہی سے گدائی کی حالت میں دیکھا۔ پولیس آئے دن بغیر اطلاع آ دھمکتی تھی۔ گھر میں کوئی پیسہ نہ رہا۔ اس کی بیوی نے گھر کا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ دونوں گراموفون سستے داموں فروخت ہوئے۔ فرنیچر نیلام ہوا اور ہم نے شہزادوں کی طرح زندگی بسر کرنے والے بچوں کو ننگے پاؤں بھی دیکھا۔ وہ ہمارے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے۔ ایک وہ وقت کہ وہ سکول کی دکان پر بے دریغ پیسے خرچ کرتے تھے پھر ان بچوں کو باپ کے گناہ کی یہ سزا ملی کہ تفریح کے وقت ہم چنے یا ریوڑیاں کھاتے تھے تو یہ بچے ہم سے مانگ مانگ کر دو دو چار چار ریوڑیاں یا چنے کھاتے تھے۔ سردیوں میں بھی وہ ننگے پاؤں سکول

آتے تھے۔ وہ دو بھائی تھے اور ایک بڑی بہن۔ آخر انہوں نے سکول آنا چھوڑ دیا کیونکہ ان کی ماں کے پاس فیس کے چند آنے نہیں تھے۔ اس دور میں فیس روپوں کے حساب نہیں آنوں کے حساب سے لی جاتی تھی۔

ایک روز ہم نے اپنی گلی میں ایک فقیر کو دیکھا۔ اس نے جوگیا رنگ کا کھدر کا لمبا اور کھلا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اسی رنگ کی چادر باندھی ہوئی تھی۔ سر کے بال اور داڑھی بڑھی ہوئی اور چہرے پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کندھے سے آٹے سے بھرا ہوا تھیلا لٹک رہا تھا اور ایک ہاتھ میں کشکول تھا۔ وہ فقیروں اور سادھوؤں کی طرح صدائیں لگاتا گھر گھر سے آٹا مانگ رہا تھا۔ جب وہ جمعدار کے دروازے پر جا رکا تو اس نے صدا لگائی اور اندر چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ خاصی دیر بعد اندر سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جمعدار کی بیوی نے گھر گھر جا کر بتایا تھا کہ ایک فقیر اسے بتا گیا ہے کہ اس کا خاوند جلدی آ جائے گا۔

اس کے بعد یہ فقیر کئی بار کوئی ایک ایک مہینے کے وقفے کے بعد ہماری گلی میں آیا اور جمعدار کے گھر میں داخل ہوا۔ ہر بار وہ کوئی ایک گھنٹے بعد گھر سے باہر نکلا۔ ایک بار اس فقیر کے جانے کے بہت دیر بعد پولیس آ گئی۔ اس نے حسب معمول گھر کی تلاشی لی۔ تھانیدار نے محلے کے معززین کو جمع کر کے کہا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ جمعدار فقیروں کے بھیس میں یہاں آتا ہے۔ وہ آج بھی آیا تھا۔ محلے کے لوگوں میں سے کسی نے بھی نہ بتایا کہ ہاں واقعی ایک فقیر آتا ہے۔ اس دور کے لوگ اچھے تھے۔ اگر جمعدار کے غرور اور تکبر کو پیش نظر رکھتے تو اسے پکڑوا سکتے تھے لیکن میں نے بزرگوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ باپ کے گناہ کی سزا بچوں کو نہیں ملنی چاہئے۔ اب وہ فقیروں کے بھیس میں آ کر انہیں اتنے پیسے دے جاتا ہے جس سے اس کے بیوی بچے دو وقت روٹی کھا لیتے ہیں۔ بعد میں ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ وہ لوگوں کے گھروں سے مانگا ہوا آٹا اپنی بیوی کو دے جایا کرتا تھا۔

ایک روز ہمیں پتہ چلا کہ گزشتہ رات جمعدار فقیروں کے بھیس میں ریل گاڑی سے سٹیشن پر اترا تو اتفاق سے محلے کا ایک آدمی اسی گاڑی پر سوار ہو رہا تھا۔ اس نے "فقیر" کو دیکھ لیا اور اسے پرے لے جا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں تم کون ہو۔ اپنے گھر نہ جانا۔ اس روز پولیس تمہارے تعاقب میں آئی تھی۔ کسی نے تمہارا راز فاش کر دیا ہے۔ اب رات کے وقت بھی سی آئی ڈی کا سپاہی تمہارے گھر کے اردگرد گھومتا رہتا ہے۔" اس آدمی نے بتایا کہ جمعدار نے اسے چند روپے دیئے اور کہا کہ میری بیوی کو دے دینا۔ یہ روپے اس کی بیوی کو پہنچا دیئے گئے تھے۔

اس کے فرار کا پندرہواں برس تھا جب حکومت نے اس کی گرفتاری کے لئے پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان کر دیا۔ اس دور میں پانچ سو روپے آج کے دس ہزار کے برابر ہوتے تھے۔ اب اس نے اپنی بیوی سے ملنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ کہیں سے بیوی کو خط لکھ دیتا کہ فلاں گاڑی پر مجھے سٹیشن پر ملو۔ خط کی زبان خفیہ ہوتی تھی۔ بیوی سٹیشن پر چلی جاتی تھی اور اس سے مل کر کچھ پیسے لے آتی تھی۔ چونکہ پولیس بیوی پر بھی نظر رکھتی تھی اور بیوی اب پولیس اور سی آئی ڈی کے ہر ایک آدمی کو اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ اس لئے ایک بار بیوی اپنے خاوند کی اطلاع کے مطابق اسے ملنے سٹیشن پر گئی تو وہاں اسے سی آئی ڈی کے دو آدمی گھومتے نظر آئے۔ وہ وہاں سے کھسک آئی۔ گھر پہنچی تو سی آئی ڈی کے وہی دو آدمی گھر آن دھمکے۔ بیوی تھک ہار چکی تھی۔ اس نے محلے کے دو چار بزرگوں کو بلا لیا اور وہ بہت روئی۔ اس نے سی آئی ڈی کے آدمیوں کو بزرگوں کے سامنے صاف بتا دیا کہ

اس کا خاوند اسے سٹیشن پر ملتا ہے لیکن اس نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

سی آئی ڈی کے دونوں آدمی مسلمان تھے۔ ہمارے بزرگوں نے ان کی منت سماجت کی کہ وہ اس بے بس عورت کو پریشان نہ کریں۔ انہیں بھی ترس آ گیا۔ انہوں نے اس عورت کو ہدایت دی کہ آئندہ وہ سٹیشن پر نہ جائے بلکہ اسے اطلاع ملے تو وہ تھانے میں اطلاع کر دے تاکہ اسے گرفتار کر لیا جائے۔ اس سے اسے یہ فائدہ ہو گا کہ وہ چار سال سزائے قید بھگت کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گا۔ بعد میں بیوی نے لوگوں کو بتایا تھا کہ اس کا خاوند رات کے وقت اچانک آ گیا تھا۔ بیوی نے رو رو کر اسے کہا کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے لیکن وہ نہیں مانا۔

اب تو اس کے بیوی بچے فی الواقع بھکاری ہو گئے تھے۔ ایک روز مجھے والد مرحوم نے پاس بٹھا کر اس جمعدار کی ساری کہانی سنائی۔ اس کی شاہانہ زندگی اور اس کے غرور کی ایک ایک بات سنائی اور کہا۔ ''بیٹا! غرور اور تکبر کی سزا دیکھ لو۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ دولت اور عزت دے لیکن کبھی غرور نہ کرنا اور حرام کے پیسے پر لعنت بھیجنا۔ وہ بچے جو بزرگوں کا بھی ادب نہیں کرتے تھے آج پھٹے پرانے کپڑے پہنے، ننگے پاؤں، گداگری کرتے پھرتے ہیں''۔ یہ سبق مجھے آج تک یاد ہے جو میں نے اپنے بچوں کو بھی یاد کرا دیا ہے۔

ان دنوں قصبے کے ڈاک خانے میں ایک مسلمان سب پوسٹ ماسٹر لگا ہوا تھا، وہ کسی اور جگہ کا رہنے والا تھا۔ کافی عرصہ یہاں رہنے کی وجہ سے اسے بھی جمعدار کے فرار کی پوری کہانی معلوم تھی۔ ایک روز پوسٹ ماسٹر میرے والد صاحب کے پاس آیا۔ میں بھی موجود تھا۔ میرے والد صاحب کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے۔ اس نے جیب سے ایک تار نکالا اور میرے والد صاحب کے ہاتھ میں دیا۔ تار میں لکھا تھا۔ ''فلاں دن فلاں گاڑی پر مجھے ملنا''۔ پوسٹ ماسٹر نے میرے والد صاحب سے کہا کہ میں نے یہ تار اتفاق سے دیکھ لیا تھا اور اسے ریکارڈ میں درج نہیں کیا تھا۔ اس تار کو جلا ڈالئے اور اس عورت سے کہئے کہ وہ اپنے خاوند کو ضرور ملے اور اسے کہے کہ وہ تار نہ دیا کرے نہ خط لکھا کرے کیونکہ سی آئی ڈی کبھی کبھی ساری ڈاک بھی چیک کرنے کے لئے آتی ہے۔

میرے والد صاحب نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ جمعدار کو گرفتار کرانے والے کو پانچ سو روپے انعام ملے گا؟'' پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ ''اچھی طرح معلوم ہے لیکن میں اس عورت کی عزت کی خاطر پانچ سو روپیہ قربان کر رہا ہوں''۔ والد صاحب نے تار کو پرزے پرزے کر دیا اور پرزے مجھے دے کر کہا۔ ''آگ میں پھینک آؤ''۔ میں پرزے چولہے میں پھینک آیا۔

چھبیس برس یہ عورت غائب ہو گئی۔ اس کی بڑی بیٹی شادی کی عمر سے بھی آگے نکل گئی تھی اور بچے بھی جوان ہو گئے تھے۔ چند دنوں کے وقفے کے بعد سارا کنبہ لاپتہ ہو گیا۔ کسی کو معلوم نہیں وہ کہاں چلے گئے۔ بہت دنوں بعد مصدقہ اطلاع ملی کہ قصبے سے چالیس میل دور ایک گاؤں میں جمعدار مر گیا ہے۔ پولیس کو پہلی بار اس کے ٹھکانے کا پتہ چلا۔ وہ ملنگوں کا تکیہ تھا۔ پولیس نے لاش کو جا کر ''گرفتار'' کر لیا اور رپورٹ لکھی کہ مفرور مر گیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے ایک بیٹے کی اولاد کے متعلق سراغ ملا کہ وہ پڑھ لکھ کر باعزت زندگی گزار رہی ہے۔

***

اگر ہم مولوی صاحبان کو اس وقت بتا دیتے کہ لاپتہ شخص کی بیوی اپنے جذبات اور استادوں کی فریب کاریوں سے کہاں جا پہنچی ہے تو مولوی صاحبان یہ فتویٰ دیتے کہ اُسے سنگسار کر دو۔

فتویٰ

☆ ایم ایس اختر

واقعہ جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں یہ میرے والد نے سنایا تھا۔ میں انہی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ہے غالباً 1944ء کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ میں نوجوان تھا اور اپنے قصبے سے تقریباً تیس میل دور کے ایک بڑے شہر کے کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ میں تقریباً ہر ہفتے بس میں بیٹھ کر اپنے گھر آ جایا کرتا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے سارے دوست قصبے میں ہی رہتے تھے۔ صرف میں تھا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ باقی سب میٹرک پاس کر کے اپنے قصبے میں ہی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ میرے زیادہ تر دوست غیر شادی شدہ تھے اس لئے ہم سب جب مل کر بیٹھتے تھے تو نوجوانوں والی کھلنڈری اور شرارتی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں میں ایک اور قباحت بھی تھی جو اُس وقت قباحت نہیں بلکہ نعمت لگتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے اور ہندوؤں کی نوجوان کنواری، شادی شدہ اور بیوہ لڑکیاں مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دوستی کر لیا کرتی تھیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اُن کے اپنے مرد پیسے جوڑنے والے تھے۔ وہ نوجوان بیویوں کے رومانی جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ سارا سارا دن دکان پر بیٹھے رہتے اور رات کو گھر آ کر بھی پیسے کا حساب ہی کرتے رہتے تھے۔ اُن کے جسم بھدے اور مزاج مرئیل ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اُن کی لڑکیاں مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دوستیاں لگا لیتی تھیں۔

ہندوؤں میں ایک اور قباحت یہ بھی ہوتی تھی کہ اُن کی نوجوان لڑکی شادی کے چاہے اگلے روز ہی بیوہ ہو جائے وہ اُس کی شادی نہیں کرتے تھے نہ ہی اُسے خوشی کے کسی موقع پر شریک ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ یہ لڑکیاں بھی مسلمان نوجوانوں کے ساتھ تعلق قائم کر لیتی تھیں۔

مجھے اپنے اور اپنے دوستوں کے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کہ ہم شریف لوگ تھے۔ ہم ہنسنے کھیلنے اور زندگی سے لطف لینے والے لوگ تھے اور کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جایا کرتے تھے کیونکہ گمراہ ہونے کا سارا سامان موجود تھا۔ اُس زمانے میں کتابوں یا فلموں میں فحاشی تو نہیں تھی لیکن ہندو عورتیں ہماری اخلاقی تخریب کاری کرتی رہتی تھیں۔

یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں کالج سے چھٹیاں ہوتے ہی گھر بھاگ آیا کرتا تھا۔ میرے والد صاحب کا آڑھت کا کاروبار تھا۔ اس کے علاوہ دیہاتی علاقے میں ہمارا زرعی رقبہ بھی تھا۔ آڑھت کے کاروبار پر ہندو چھائے ہوئے تھے لیکن والد صاحب کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہمارا کاروبار چل رہا تھا اور ہماری زمینداری نے بھی ہمیں خوشحال لوگوں کی صف میں رکھا ہوا تھا۔ والد صاحب کو خدا جنت کرے، اُن میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مجھے پیسے دے کر وہ بھول جاتے تھے اور انہوں نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ میں نے وہ پیسے کہاں خرچ کیے ہیں۔

اُن دنوں جنگِ عظیم زوروں پر تھی ہمارے علاقے سے کئی جوان فوج میں تھے۔ ہمارے قصبے کا ایک جوان جس کا فرضی نام عظیم سمجھ لیں، وہ بھی فوج میں تھا اور برما کے محاذ پر لڑ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ کہاں تھا۔ صرف اتنا ہی سنتے تھے کہ برما فرنٹ پر ہے۔ اُن دنوں لوگ ہزاروں کے حساب سے مر رہے تھے اور انگریزوں نے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے بھرتی کا سٹینڈرڈ بھی گرا دیا تھا۔ وہ قد بت کے معاملے میں بھی اب پروا نہیں کرتے تھے۔ انہیں محاذِ جنگ پر مروانے کے لئے جوانوں کی ضرورت تھی اور وہ یہ ضرورت دھڑا دھڑ پوری کیے جا رہے تھے۔

عظیم جب برما فرنٹ پر گیا اس وقت اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم لوگ میٹرک میں پڑھتے تھے۔ عظیم خوبصورت جوان تھا۔ اس کی بیوی کو بھی ہم نے دیکھا ہوا تھا۔ وہ خاصی پُرکشش لڑکی تھی اور عظیم نے اسے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ لڑکی کا فرضی نام انوری رکھ لیں۔ اصلی نام بھی اس سے ملتا جلتا ہی تھا۔

ڈھائی سال تک عظیم کے خط آتے رہے اور ایک دن عظیم کے والد کو سرکاری طور پر اطلاع ملی کہ عظیم لاپتہ ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر ان کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ لاپتہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ یہ بات اس کے گھر والوں کے لئے روح فرسا تھی۔ اگر اس کی موت کی خبر آ جاتی تو اس کے ماں باپ رو پیٹ کر خاموش ہو جاتے لیکن لاپتہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے ساری عمر رونا تھا۔ اگر وہ زندگی میں کبھی واپس آ جاتا تو یہ معجزہ ہوتا۔ جنگ میں لاپتہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ جنگی قیدی ہو گیا ہے یا مارا گیا ہے اور اس کی لاش نہیں ملی اور اس کے کسی ساتھی نے یہ گواہی بھی نہیں دی کہ وہ مارا گیا ہے۔

انوری کا باپ اُسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ اب ایک ایسی بیوہ تھی جو بیوہ کہلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ماں باپ کو یقین تھا کہ ان کا داماد مارا گیا ہے اور وہ واپس کبھی نہیں آئے گا اس لئے وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ ان کے لئے صدمہ دہرا تھا۔ ایک تو عظیم لاپتہ ہو گیا تھا اور دوسرا صدمہ یہ تھا کہ انوری کے لئے دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ وہ اس کی دوسری شادی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب انہوں نے اپنی جوان بیٹی کو جس کی عمر مشکل سے اکیس سال ہو گی ساری زندگی کے لئے اپنے دروازے پر بٹھائے رکھنا تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ انوری ایک پُرکشش لڑکی تھی اور اس جیسی لڑکی اگر ماں باپ کے گھر بیٹھی ہو تو ماں باپ کا سکون اور چین ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ انوری کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ وہ بڑی بہنیں تھیں جو شادی شدہ تھیں۔

ہم سارے دوست کبھی کبھی انوری کا ذکر کرتے تھے، ہمیں خطرہ تھا کہ وہ ہندوؤں کی لڑکیوں کی طرح خراب ہو جائے گی۔ ہم مومن تو نہیں تھے لیکن یہ بات ہمیں بھی پسند نہیں تھی کہ مسلمانوں کی ایک لڑکی خراب ہو جائے اس لئے ہم میں سے کوئی نہ کوئی اس پر نظر رکھتا تھا کہ ان کے گھر میں کون آتا جاتا ہے اور انوری کس کس سے ملتی ملاتی ہے۔

تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر گیا اور عظیم کا کوئی پتہ نہ چلا۔ قصبے کے معززین نے انوری کے باپ کو مشورہ دیا کہ وہ انوری کی دوسری شادی کر دے۔ باپ نے ایک مولوی سے مشورہ کیا تو مولوی صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ انہوں نے کہا کہ انوری جب تک اپنے خاوند کی میت دیکھ نہ لے اور اس کی موت کے دو گواہ نہ ہوں، انوری دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ مولوی صاحب کا مشورہ سن کر جو لوگ انوری کے باپ کو اس کی دوسری شادی کا مشورہ دیتے تھے وہ خاموش ہو گئے۔

پھر امریکہ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا اور دوسری جنگ عظیم بھی ختم ہو گئی۔ اب سب لوگوں کو یقین تھا کہ عظیم واپس آ جائے گا۔ اس زمانے میں ایسے ہوا تھا کہ بہت سے لوگ جاپانیوں کی قید میں چلے گئے تھے لیکن ان کے گھر والوں کو ان کے لاپتہ ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ لوگ واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ عظیم کا انتظار کرتے رہے لیکن عظیم واپس نہ آیا۔

ایک بم ہیروشیما پر گرا تھا، ایک بم ہمارے اوپر گرا۔ ہوا یوں کہ ہمیں کسی نے بتایا کہ انوری خراب ہو گئی ہے۔ ہمارے لئے یہ بات غیر متوقع تو نہیں تھی پھر بھی

ہمیں یہ بات اچھی نہ لگی۔ تھوڑی سی دیر کے لئے افسوس سا ہوا۔ پھر ہم نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نے خراب ہونا ہی تھا۔ اس کے خاوند کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی اور اپنے مذہبی پیشواؤں نے اُس کی دوسری شادی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ وہ بیچاری دل بہلانے کے لئے کسی کے ساتھ ناجائز دوستی نہ لگاتی تو اور کیا کرتی۔ اب ہم نے یہ دیکھنا تھا کہ وہ کس کے ساتھ خراب ہوئی ہے۔ ہم نے اُس کی جاسوسی کرنی شروع کر دی۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے چوری چھپے ایک اور کام بھی کیا۔ اب میں عمر کے اُس حصے میں ہوں کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے روح کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں اور نوجوان نسل کو نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ گناہ انسان کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح کھاتے رہتے ہیں اور روح کو زخمی اور بوجھل کر دیتے ہیں۔ گناہ کا احساس انسان کے ضمیر کو تازیانے لگاتا رہتا ہے اور انسان خود اعتمادی اور یقین کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔

میں نے گناہ یہ کیا کہ انوری کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوششیں کرنے لگا۔ لڑکی آخر خوبصورت تھی اور میرے اوپر شیطان کا غلبہ بھی رہتا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ جس لڑکی کا خاوند لاپتہ ہو جائے اور جس کی دوسری شادی کا امکان نہ ہو اور پھر جسے ورغلانے والے بھی بے شمار ہوں اُس کے خراب ہونے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں لگتی۔ پھر اس کے متعلق لوگوں نے مشہور بھی کر دیا تھا کہ اُس کا کردار ناپاک ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ آسانی سے میرے جال میں آ جائے گی لیکن آپ یقین کریں کہ میرا ہر حربہ ناکام ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو لڑکی کو خواہ مخواہ بدنام کر دیا گیا ہے یا پھر کسی ایسے آدمی کے چکر میں آ گئی ہے جس نے اسے شادی کا دھوکہ دے رکھا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو قائل کر لیا کہ انوری پاک صاف ہے۔

ان دنوں کے حالات آج کل سے بہت مختلف تھے۔ اُس زمانے میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے اس لئے مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے فائدے نقصان کے بارے میں اکثر فکرمند رہا کرتے تھے۔ ہمارے قصبے میں ایک سول ہسپتال تھا۔ اس ہسپتال کا ایک ڈسپنسر کی اور علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ بڑا ملنسار اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ اُس کی باتوں سے دانائی کی بو آتی تھی۔ وہ سرکاری ملازم تھا اور لوگوں کو اُس سے کام بھی پڑتا رہتا تھا اس لئے سب لوگ اُس کی عزت کرتے تھے اور جب بھی بازار میں نکلتا تھا تو اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اُس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن اُسے ہم لوگ شیخ چاچا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ہمارے قصبے میں اکیلا رہتا تھا۔

شیخ چاچا مسلمانوں کی بڑی مدد کرتا رہتا تھا۔ مسلمانوں میں لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا تھا اور نوبت ہسپتال اور تھانے تک پہنچتی تھی۔ اگر مسلمانوں کا جھگڑا کسی ہندو یا سکھ سے ہو جاتا اور زخمی ہسپتال پہنچتا تو وہ در پردہ مسلمانوں کی ہی حمایت کرتا تھا۔

اُسے جب پتہ چلا کہ انوری کا لاپتہ خاوند ابھی تک نہیں لوٹا تو اُس نے مسلمان معززین سے بات کی کہ لڑکی جوان ہے۔ اس کی دوسری شادی کر دی جائے۔ معززین نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ وہ اس معاملے میں نہیں پڑیں گے کیونکہ مولوی نے اسے مذہب کا مسئلہ بنا دیا ہے۔

وہ انوری کے باپ سے بھی ملا۔ انوری کا باپ اُس کے آگے رو پڑا۔

"شیخ بھائی!" اس نے کہا۔ "اس بات پر میں شہر بھر کے سامنے ذلیل ہو چکا ہوں"۔

"آپ فکر نہ کریں"۔ شیخ نے کہا۔ "میں اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا"۔

"فکر کیسے نہ کروں"۔ انوری کے باپ نے کہا۔ "مولوی صاحب نے تو بڑے واضح الفاظ میں فتویٰ دے دیا ہے کہ اس لڑکی کی شادی نہیں ہو سکتی"۔

اس پر شیخ چاچا کو بڑا طیش آیا اور وہ میرے والد صاحب کے پاس آ گیا۔ میں اُس وقت والد صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

"ملک صاحب!" اُس نے والد صاحب سے کہا۔ "آپ مولوی صاحب کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کی عزت کا سوال ہے۔ انوری کی شادی نہ ہوئی تو یا تو وہ خراب ہو جائے گی اور اگر خراب نہ ہوئی تو بدنام تو ضرور ہو گی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے سامنے ہماری بہت بے عزتی ہو گی"۔

"شیخ صاحب!" والد صاحب نے کہا۔ "یہ مذہب کا معاملہ ہے اور مذہب کو مولوی صاحب مجھ سے اور آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ انوری کے باپ کا کام ہے کہ وہ اگر اس مولوی کے فتوے سے مطمئن نہیں تو کسی اچھے دینی مدرسے سے فتویٰ لے آئے۔ یہاں کے مولوی صاحب نے اگر فتویٰ دے دیا ہے کہ انوری کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی تو پھر اُن سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنی بات پر قائم رہیں گے۔ میں تو دینی معاملے میں دخل دینے سے بہت ڈرتا ہوں"۔

"مجھے ان مولویوں کا کوئی ڈر نہیں"۔ شیخ چاچا نے بھڑک کر کہا۔ "میں خود بات کروں گا"۔

"پھر بات کر دیکھو"۔ والد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ ایک فتویٰ اور بھی دے چکے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جو شخص اس شادی کے لئے زور لگائے گا وہ گنہگار ہو گا اور اُس کا اپنا نکاح ٹوٹ جائے گا"۔

"پھر تو میں ضرور بات کروں گا"۔ شیخ چاچا نے کہا۔ "مجھے تو کوئی خطرہ نہیں۔ میرا تو نکاح اُس وقت ٹوٹ گیا تھا جب میری بیوی فوت ہو گئی تھی"۔

والد صاحب نے اس معاملے میں مداخلت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن مجھے شیخ چاچا کی باتیں بہت پسند آئیں۔ میں نے اپنے دوستوں سے بھی بات کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ شیخ ٹھیک کہتا ہے۔ ہم لوگ شیخ چاچا سے ملے اور اُسے کہا کہ ہم اُس کے ساتھ ہیں۔

"چاچا!" میرے ایک دوست نے کہا۔ "تم لڑکی کے باپ سے بات کرو، ہم مولوی سے نمٹ لیں گے"۔

"یہ اتنا آسان کام نہیں ہے"۔ شیخ چاچا نے کہا۔ "اگر مولوی نے کہہ دیا کہ لڑکی کا دوسرا نکاح جائز نہیں تو پھر تم لاکھ کوشش کر دیکھو لڑکی کی شادی نہیں ہو گی"۔

"ہو گی کیوں نہیں"۔ میں نے کہا۔ "میں لاہور سے فتویٰ لے آؤں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ لڑکی کا خاوند لاپتہ ہو جائے تو وہ دوسری شادی کر سکتی ہے"۔

"اوئے بھولے بادشاہو!" شیخ چاچا نے کہا۔ "یہاں اس مولوی کا فتویٰ چلتا ہے۔ تم چاہے دیو بند سے فتویٰ لے آؤ۔ فائدہ تو جب ہو گا جب کوئی اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار بھی ہو گا۔ میری بات لکھ لو۔ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہو گا"۔

ہم لوگ خاموش ہو گئے چاچا ٹھیک کہتا تھا۔ اس قصبے کے لوگ مولوی صاحب کو خدا کے بعد کا درجہ دیتے تھے۔ مولوی کا فتویٰ اگر غلط تھا تو بھی اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے کوئی بھی آگے نہ بڑھتا۔ مولوی کا اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ یہ شادی نہیں بدکاری ہے۔ پھر لوگ ایسے شخص کا اور اس کے خاندان کا حقہ پانی ہی بند کر دیتے۔

"شیخ چاچا!" میرے ایک دوست نے سوچ سوچ

کر سوال کیا۔ "تم مولوی کے فتوے کو صحیح سمجھتے ہو؟"

"بالکل نہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "مولوی کا فتویٰ غلط ہے"۔

"پھر تم خود انوری سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟"

یہ بات سن کر شیخ چاچا بالکل چپ ہو گیا۔ ہم سمجھے کہ یہ بات اُس کو بُری لگی ہے۔ وہ بے چارہ تو جو کچھ بھی کر رہا تھا نیک نیتی سے کر رہا تھا۔ اُس کو کیا ضرورت تھی کہ ایک دوسرے شہر سے آ کر ہمارے قصبے میں ہمارے مسئلے میں پڑتا۔ یہاں تو ہسپتال میں وہ نوکری کر رہا تھا۔ یہ تو ہمارا کام تھا کہ ایک نوجوان لڑکی کے مستقبل کا صحیح فیصلہ کرتے۔

"چاچا! یہ بُری بات تو نہیں"۔ میں نے کہا۔ "آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"کوئی ہرج نہیں"۔ چاچا نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "مجھے انوری کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ مجھے قبول نہیں کرے گی"۔

"کیوں نہیں کرے گی"۔ ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "آخر تم میں کیا کمی ہے۔ سرکاری ملازم ہو، عزت کی کھاتے ہو اور پھر چھڑے ہو"۔

"وہ تو ٹھیک ہے"۔ شیخ چاچا نے کہا۔ "لیکن یہ تو سوچو کہ لڑکی کی عمر مجھ سے کتنی کم ہے"۔

"اس کی فکر نہ کرو"۔ میرے ایک دوست نے کہا۔ "ہم لڑکی کے باپ سے بات کر لیں گے"۔

ہمیں انوری کے باپ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم لڑکے تھے۔ اس موضوع پر ہم مولوی سے تو الجھ سکتے تھے لیکن انوری کے باپ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ چاچا سے تو ہم مذاق کر رہے تھے۔ وہ تو انوری کے باپ کا بڑا گہرا دوست بن گیا تھا۔ دونوں عام طور پر اکٹھے رہتے تھے۔ کئی بار انوری کے باپ کے نوکر کو ہم نے دیکھا۔ ٹرے میں کھانا رکھے شیخ چاچا کے گھر جا رہا ہوتا تھا۔ شیخ چاچا کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ وہ انوری کے باپ کی عمر کا تھا۔

"شیخ چاچا!" ہم میں سے کسی نے کہا۔ "اگر تم نہیں مانتے تو تمہارا کوئی بیٹا یا بھتیجا جوان ہو گا۔ اگر وہ بھی نہیں تو پھر ہم میں سے کسی کو حکم کرو......"

"نہ نہ نہ"۔ شیخ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔ تم سب کنوارے لڑکے ہو تمہارے لئے کنواری لڑکی کا رشتہ ہونا چاہئے"۔

ہم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ چاچا خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد بات مذاق میں ٹل گئی اور آئی گئی ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب آ گیا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے ہمارے قصبے میں بھی پہنچنے لگے۔ پھر ہمیں پتہ چلا کہ انگریزوں نے پنجاب کی وزارت ٹوانہ کے حوالے کر دی ہے۔ لاہور میں کالج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑکوں پر نکل آئے۔ میں اور میرے تین دوست بھی اپنے قصبے سے نکل کر لاہور پہنچ گئے۔ یہاں کا منظر ایمان افروز تھا۔ کالج کی لڑکیاں جلوس نکالتی تھیں اور لڑکے ان کو اپنے حصار میں رکھتے تھے۔ میں بھی ان نوجوانوں میں شامل تھا۔ ہم نے لڑکیوں کے شانہ بشانہ جلوس نکالے۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں یہ بات بالکل ہی بھول گیا کہ میں بھی ان جیسی لڑکیوں کو ناپاک نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سا انقلاب آیا اور پھر یہ لڑکیاں میری اپنی بہنوں کی طرح مقدس بن گئیں۔ میں ان کے ہمراہ اس طرح سینہ تان کر چلنے لگا جیسے کسی نے ان کی طرف ترچھی نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کی تو میں اُس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ یہ انقلاب ایسا تھا کہ میں اس کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں اب سمجھا بھی نہیں سکتا کہ میرے اندر یہ تبدیلی کس طرح آ گئی۔

لاہور تو ہم دو دن کے لئے گئے تھے لیکن ہمیں زیادہ دیر کے لئے رکنا پڑا کیونکہ ہمارا ایک ساتھی پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا اور اس کے زخم مندمل ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ یہ ایک دوسری کہانی ہے کہ وہ کس طرح زخمی ہوا تھا اور اُسے ہم کس طرح اٹھا کر لائے تھے۔ یہ کہانی پھر کبھی سناؤں گا۔

ہم اپنے قصبے میں پہنچے تو دو خبریں ہماری منتظر تھیں۔ ایک تو یہ کہ انوری غائب ہو گئی تھی۔ دوسری خبر یہ تھی کہ شیخ چاچا کا بھی کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ یہ ایک دن پہلے کا واقعہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ انوری بھاگ گئی تھی لیکن شیخ چاچا کو ادھر ہونا چاہیے تھا۔ ایک دو دوستوں نے خیال ظاہر کیا کہ چاچا ہو سکتا ہے انوری کو ڈھونڈنے کے لئے گیا ہو۔ ہم نے سول ہسپتال سے پتہ کرایا۔ معلوم ہوا کہ چاچا بغیر اطلاع کے غائب ہے۔ بات تشویشناک تھی۔

پہلے ہم نے سوچا کہ انوری کے باپ سے معلوم کرنا چاہئے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سے بات نہیں کریں گے۔ جس آدمی کی جوان لڑکی گھر سے غائب ہو جائے اُس سے یہ پوچھنا کہ اُس کی بیٹی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر ہے۔

پھر پاکستان کی تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ 1946ء کے الیکشن ہوئے اور ہم لوگ انوری کو بالکل بھول گئے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ ایک دو سال پہلے ہم لوگ کیا ہوا کرتے تھے۔ گناہگار مجاہد بن گئے تھے۔ میں بھی اس طرح مگن ہوا کہ بی اے کا امتحان بھی نہ دے سکا اور 14 اگست 1947ء کو ہمارے خوابوں نے ایک آزاد اور خودمختار ملک کی صورت اختیار کر لی۔

مجھے سرکاری ملازمت کرنے کا بہت شوق تھا۔ والد صاحب نے کہا بھی کہ زمین جائیداد بہت ہے، تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن میں نہ مانا کیونکہ

دولت اور کامیابی اپنے ساتھ ہمیشہ منفی جذبوں کا لشکر لے کر آتی ہے۔ جس کامیابی کے ساتھ انکساری نہ ہو، جس خوشحالی کے ساتھ ذہانت نہ ہو، جس محبت کے ساتھ برداشت نہ ہو، جس اختیار کے ساتھ صبر نہ ہو، جس ترقی کے ساتھ رحم نہ ہو اور جس دولت کے ساتھ ظرف نہ ہو وہ دنیا میں بحران ثابت ہوتی ہے۔

(دستگیر شہزاد)

اُس وقت سرکاری ملازمت عزت اور وقار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ کراچی دارالحکومت بن رہا تھا۔ والد صاحب کے ایک دوست کی وجہ سے مجھے وہاں ملازمت مل گئی اور میں کراچی چلا گیا۔ پھر ایک دو سال کے اندر اندر میں نے اپنے دو دوستوں کو بھی بلا لیا۔ میں اُن کے بغیر اداس ہو گیا تھا۔ ان کو بھی ملازمت مل گئی اور ہم تینوں مل کر عمر رفتہ کو آواز دینے لگے۔

ان دنوں کراچی کا عصمت فروشی کا بازار بہت مشہور تھا۔ پاکستان کے معاشرے نے ایسا رنگ اختیار کر لیا تھا کہ ہم بھول ہی گئے تھے کہ کبھی ہم تحریک پاکستان کے مجاہد ہوا کرتے تھے۔ اسے آپ میرا اقبال جرم سمجھ لیں، وہ عمر بھی بے فکری والی تھی۔ ہم تینوں دوست ایک رات کراچی کے مشہور بازار حسن نیپیئر روڈ چلے گئے۔ اس زمانے میں یہ تمام علاقہ بدکاری کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ کوئی شریف آدمی بھی اس علاقے میں داخل ہو جاتا تو عصمت فروشوں کے دلال اسے گھیر لیتے تھے اور ہر کوئی اُسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔

ایسے ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ ایک دلال ہمیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ "مال" پسند نہ آئے تو واپس آ جانا۔ وہ ہمیں گلیوں میں گھماتا پھراتا ایک فلیٹ کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔

اس فلیٹ میں خاموشی سی تھی۔ حالانکہ رات کے وقت گناہوں کے اس بازار میں بڑی رونق ہونی چاہئے تھی۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ یہ لوگ بلا لائسنس یہ کاروبار چلا رہے ہیں۔ یہ خیال مجھے ویسے ہی آ گیا تھا۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان لوگوں کے پاس لائسنس ہے یا نہیں۔ جہاں گناہ کے سوا کچھ بھی نہ تھا، وہاں قانون کی پروا کون کرتا ہے۔ دلال نے ایک لڑکی دکھائی جسے دیکھ کر میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔ وہ انوری تھی۔

میرے دوست اُسے نہیں پہچانتے تھے۔ انوری زیادہ باہر نہیں نکلا کرتی تھی۔ صرف میں تھا جو اُسے پہچانتا تھا اور انوری مجھے جانتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ انوری یہاں خود نہیں آئی بلکہ لائی گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دماغ میں اچھی سوچ آ گئی۔

میں نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ میں نے دلال کے ساتھ سودا طے کرلیا اور انوری کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ انوری کے آنسو بہنے لگے۔ میں اُسے ساڑھے تین سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے کیوں نہ پہچانتی، کسی وقت میں نے اُسے پھانسنے کی بھی کوشش کی تھی اور منہ کی کھائی تھی اور میں مان گیا تھا کہ انوری کے خلاف لوگوں نے بدچلنی کا جو پروپیگنڈہ کر رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ کم از کم میں انوری پر بدچلنی کا الزام عائد نہیں کرسکتا تھا مگر اسی انوری کو اب میں عصمت فروشی کے بازار میں دیکھ رہا تھا۔

جنگ عظیم کے دوران جب یہ اطلاع آئی تھی کہ انوری کا خاوند محاذ پر لاپتہ ہوگیا ہے تو انوری بہت مغموم ہوئی تھی لیکن اس کے چہرے پر بیویوں والی معصومیت اور شرافت قائم رہی تھی۔ اب اتنی مدت بعد اُس کے چہرے کا میک اپ اتنا گہرا تھا کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُس کے چہرے پر کیا تاثر ہے۔

"یہاں تک کیسے پہنچی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "تم گھر سے غائب ہوگئی تھیں"۔

اس نے بتایا کہ شادی شدہ ہو کر وہ تنہائی کی زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے پر بھی اُس کا خاوند واپس نہ آیا تو کئی لوگوں نے اُس کے والدین کو کہا تھا کہ انوری کا خاوند اب نہیں آئے گا۔ وہ مارا جا چکا ہوگا۔ انوری کو لوگوں نے بدنام کرنا شروع کردیا تھا۔

انوری کی اس جذباتی حالت میں وہ ڈسپنسر جو شیخ چاچا کے نام سے مشہور تھا انوری کے باپ کا دوست بن گیا اور ان کے گھر آنے جانے لگا۔ اس نے انوری کے ساتھ الگ تھلگ ایسا تعلق پیدا کرلیا کہ انوری اُسے اپنا مشفق اور ہمدرد سمجھنے لگی۔ وہ انوری کو کہتا تھا کہ مولویوں کا فتویٰ غلط ہے اور وہ شادی کرسکتی ہے۔ شیخ چاچا نے انوری کو سبز باغ دکھائے اور اُسے کہا کہ وہ اگر گھر سے نکل چلے تو اُس کی شادی اُسی جیسے جوان آدمی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔

انوری ویسے ہی کسی بیماری کا بہانہ کر کے ہسپتال چلی جاتی تھی اور شیخ کے ساتھ اُس کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ کسی وقت بھی نہ سمجھ سکی کہ شیخ اُسے دھوکہ دے رہا ہے۔ انوری پر یہ خوف سوار تھا کہ وہ ساری عمر ماں باپ کے گھر بیٹھی رہے گی اور اگر کوئی اُس کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوا بھی تو نکاح پڑھانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ یہ جذبات اور یہ خدشے انوری کی بہت بڑی کمزوری بن گئے اور وہ شیخ چاچا کی مریدنی بن گئی۔

آخر شیخ چاچا اُسے لے اڑا۔ وہ اُسے کراچی لے گیا اُس وقت تک شیخ چاچا انوری کے ساتھ بڑا ہی شریف اور مخلص آدمی بنا رہا۔ انوری کے ساتھ اُس نے کوئی بدتمیزی نہ کی اور اپنی بدنیتی کا اظہار بھی نہ ہونے دیا۔

پانچ چھ مہینوں بعد شیخ چاچا نے انوری سے کہا کہ

جو آدمی انوری کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا وہ اپنے وعدے سے پھر گیا ہے۔ اس کے بعد شیخ چاچا نے انوری سے کہا کہ اب وہی ہے جو اس کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ انوری نے فوراً قبول کرلیا۔ وہ شیخ چاچا سے بہت متاثر تھی۔

شیخ چاچا نے انوری کے ساتھ باقاعدہ نکاح پڑھوا لیا اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے لگے۔ چند مہینے گزرے تو شیخ چاچا نے اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے۔ میں انوری کے پاس ایک گاہک کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا دلال باہر میرے دوستوں کے پاس بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں زیادہ دیر اندر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے انوری بہت مختصر اگر بہت تیز تیز مجھے یہ بات سنا رہی تھی۔

انوری کو پہلی بار پتہ چلا کہ شیخ چاچا اصل میں کیا ہے۔ وہ دوستوں کو گھر لا کر انوری کے ساتھ بے تکلف کرنے لگا۔ پھر اس نے انوری کو موقعہ دیا بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اس کے دوستوں کے ساتھ بے تکلف اور بے حیا ہو جائے۔ آہستہ آہستہ انوری شیخ چاچا کے سانچے میں ڈھلتی گئی۔ شیخ چاچا نے تین چار مکان بدلے، آخر اُسے بدکاری کے اڈے پر لے آیا۔ پھر کئی چکر چلا کر انوری کو پرائیویٹ طوائف بنا دیا۔

انوری کو وہاں دو سال ہو گئے تھے۔ اُسے یہ پیشہ پسند نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ اس نے اس پنجرے میں سے نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے تھے لیکن اُسے سزا دی گئی تھی جسے وہ ساری عمر نہیں بھول سکتی تھی۔ شیخ چاچا اور اُس کے دلال نے انوری سے کہا تھا کہ جاؤ چلی جاؤ۔ انہوں نے یہ کہہ کر یہ پوچھا تھا کہ جاؤ گی کہاں؟ اب تو تمہیں اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ انوری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

"شیخ چاچا یہیں رہتا ہے؟" میں نے انوری سے پوچھا۔

"نہیں"۔ انوری نے جواب دیا۔ "وہ تیسرے چوتھے روز آتا ہے۔ یہاں بھی وہ کسی ہسپتال میں ملازم ہے"۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دلال مجھے باہر نکالنے کو آ رہا تھا۔

"انوری!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں یہاں سے نکالوں گا"۔

"اب نکال کر کہاں لے جاؤ گے"۔ انوری نے کہا۔

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھلا اور دلال ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ لئے کمرے میں آ گیا۔ میں اُسے اپنے پیسے دے چکا تھا۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ دو اور گاہک باہر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن میں دونوں دوستوں کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے ناراض ہونے لگے۔ میں نے باہر آ کر انہیں بتایا کہ میں صرف پیسے دے آیا ہوں اور جیسا اندر گیا تھا ویسا ہی نکل آیا ہوں۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ وہ بھی شیخ چاچا کو، انوری کے باپ اور انوری کے مسئلے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ دونوں شیخ چاچا کو گالیاں دینے لگے۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ پولیس کا ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر اُس کا گہرا دوست ہے اور وہ اُسے کہہ کر یہاں چھاپہ پڑوائے گا اور اس شیخ کو گرفتار کرائے گا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ انوری کو اس گندی زندگی سے نجات دلائی جائے اور شیخ کو پکڑوایا جائے۔ پھر میری جذباتی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ بدکاری کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا تھا اور میں یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے انوری کے ساتھ میرا خون کا اور روح کا رشتہ ہے اور میں اُس کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔

اگلے روز ہم تینوں دفتر بند ہونے کے بعد اس

اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے تھانے میں گئے اور اُسے ساری بات سنائی۔ اُس نے پہلے تو ٹال مٹول کی پھر وہ اپنے دوست کے زور دینے پر اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ اس علاقے کے تھانیدار کو کہہ کر چھاپہ مروائے گا۔ یہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر خود کسی دوسرے علاقے میں چھاپہ نہیں مار سکتا تھا۔ اُس نے ہمیں اگلے روز آنے کو کہا۔

دوسرے روز ہم اُس کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق اُس کے تھانے میں گئے۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم نے ٹیکسی لی اور میپر روڈ کے تھانے میں پہنچے۔ اس تھانے کا انچارج سب انسپکٹر اس اسسٹنٹ سب انسپکٹر کا دوست معلوم ہوتا تھا۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے اُسے بتایا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ سب انسپکٹر نے ہم سے پوچھا کہ وہ فلیٹ کون سا ہے؟ ہم نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا۔

"اچھا اچھا!" سب انسپکٹر نے کہا۔ "یہ کوئی ہوشیار لوگ معلوم ہوتے ہیں، جن کا مجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ میں آج ہی دیکھوں گا"۔

"دیکھنا کیا ہے بھائی؟" اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے کہا۔ "آج رات ہی چھاپہ مارو مجھے یقین ہے کہ وہ بلا لائسنس چل رہے ہیں۔ گرفتار کر کے اندر کر دو اور اس عورت کو میرے ان دوستوں کے حوالے کر دینا"۔

"کیوں میرا پیٹ کاٹتے ہو یار!" سب انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم نے مجھ پر کرم کیا ہے کہ ایک اور اسامی دکھا دی ہے۔ مجھے چار پیسوں کا فائدہ ہو جائے گا"۔

اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے اُسے منوانے کی کوشش کی لیکن سب انسپکٹر ہنستا ہی رہا۔ اس نے ہماری خاطر تواضع بھی کی اور بڑی عزت سے ہم سب کو رخصت کر دیا۔ باہر آ کر اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے ہمیں بتایا کہ اس علاقے میں زیادہ تر عصمت فروشی بلا لائسنس ہو رہی ہے اور انہیں پکڑنے والوں کو اپنے چار پیسوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔

یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ ہم بھی کر سکتے تھے لیکن جن سے یہ کام رکوانا تھا انہیں چار پیسوں کا فائدہ عزیز تھا۔ ہم ایک مجرم کی نشاندہی کر کے ایک سب انسپکٹر کی ماہوار آمدنی میں اضافہ کر آئے تھے۔ ہم ایسے ہیرو نہیں تھے کہ خود وہاں ہلہ بولتے، شیخ اور اس کے دلال کو قتل کر کے انوری کو اٹھا کر لے آتے اور اُسے اُس کے گھر پہنچا دیتے۔

مجھے یاد آیا کہ انوری نے کہا تھا کہ اب نکال کر کہاں لے جاؤ گے۔ اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ انوری اب اُسی دنیا کو قبول کر چکی تھی۔ جہاں اُسے دھوکے سے پہنچا دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں کتنی انوریاں، کیسے کیسے حسین دھوکوں میں وہاں پہنچا دی گئی تھیں اور پہنچائی جا رہی ہیں اور وہ اُسی گلشن کی مرجھائی ہوئی کلیاں بن کے رہ جاتی ہیں۔

مجھ پر اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ میرے ذہن سے بدی اور بدکاری بالکل ہی نکل گئی اور میری باقی عمر ایسی صاف ستھری گزری کہ ذہن میں گناہ کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ میں کسی گناہ گار کو پکڑ نہیں سکتا اور میں گناہوں کے کسی اڈے کو بند نہیں کر سکتا۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر لوں۔ پینتیس برس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا ہے میں نے جو توبہ کی تھی وہ بڑھاپے کی اس عمر میں بھی قائم ہے۔

البتہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر ہم مولوی صاحبان کو اس وقت بتا دیتے کہ لاپتہ شخص کی بیوی اپنے جذبات اور استادوں کی فریب کاریوں سے کہاں جا پہنچی ہے تو مولوی صاحبان یہ فتویٰ دیتے کہ اُسے سنگسار کر دو۔

شکست خوردگی

سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دفتر کا سارا حُسن جیسے اس وقت اپنی شکست خوردگی کا ماتم کرنے لگا تھا۔

☆ شازیہ حسن

کمپیوٹرز پاکستان کی شاندار عمارت کے پانچویں فلور پر ایڈمنسٹریشن کے ائرکنڈیشن ہال کا موسم ٹھنڈا اور خوشگوار تھا۔ اس کے باوجود وہاں کے سٹاف کے تمام ممبروں کے چہرے اترے ہوئے تھے، مردوں کے کم اور عورتوں بالخصوص لڑکیوں کے زیادہ۔ اس پریشانی کی کوئی خاص وجہ نہ تھی بس ایک دو افواہیں اور اس کے بعد ان لوگوں کی اپنی قیاس آرائیوں نے انہیں خوفزدہ کر رکھا تھا۔ دفتر کے تمام لوگ مینجمنٹ کے تازہ فیصلے کے بارے میں منفی انداز سے سوچ رہے تھے۔ فرم کے چیف ڈائریکٹر سیٹھ عمران خان نے سویڈن سے لوٹنے کے بعد اپنے بھانجے کاشف احمد کو اس کمپنی کا جنرل منیجر مقرر کر دیا۔

کاشف احمد دو سال پہلے جاپان سے کمپیوٹر انجینئرنگ کا کورس پورا کر کے لوٹا تھا۔ اس کے بعد اس نے مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن میں ڈپلومہ حاصل کرنے کے لئے کچھ عرصہ لاہور میں گزارا تھا اور اپنے ماموں کے

اصرار پر وہ ان کا ہاتھ بٹانے پر راضی ہو گیا تھا۔ دراصل کمپنی گزشتہ ایک سال سے خسارے میں جا رہی تھی۔

ماہرین کی سروے رپورٹوں اور انتظامیہ کی پے در پے بے قاعدگیوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ یہ سب سٹاف کی ناقص کارکردگی اور غلط پلاننگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورانہی کوتاہیوں کے انسداد کے لئے کاشف احمد کو یہاں بلایا گیا تھا لیکن کمپنی کے اس اقدام کے بارے میں سٹاف کا نظریہ بالکل برعکس تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کاشف کی شخصیت ایسی ہے کہ کاشف کے یہاں آ جانے سے کمپنی کا مستقبل اور بھی تاریک ہو سکتا ہے۔

کاشف کی شخصیت کے جو پہلو ان کے سامنے تھے سپرنٹنڈنٹ غلام نبی کی یہ اطلاع مصدقہ بھی جا رہی تھی کہ کاشف احمد ایک عیاش اور آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ اس کے کالج دنوں کے رومان فرم کے اس پرانے ملازم کے ذہن میں اب بھی محفوظ تھے۔ اس عشق بازی اور سکینڈلوں سے بچانے کے لئے وہ خود کتنی بار اس کے باپ اور ماموں کے ساتھ کالج بلکہ تھانے تک گیا تھا۔ اس کے طوائفوں کے کوٹھوں پر جانے کے چرچے بھی ان دنوں اکثر سنے جاتے تھے اور پھر جاپان جیسا ملک تو اپنی جاپانی گڑیوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے اس ترقی یافتہ امیر ترین ملک میں، اتنا عرصہ گزار آنے کے بعد کاشف کو شریف اور نیک طینت کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔ عہد شباب میں پیسے کی فراوانی جذبات کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے، اس بات کو سب لوگ جانتے تھے۔ اس کے لاہور میں لو افیئر کا ذکر بھی دفتر میں کئی بار ہوا تھا۔

سٹاف کی سب لڑکیاں ان نت نئی کہانیوں سے سہمی ہوئی تھیں۔ فرم میں زیادہ تر لڑکیاں خوبصورت تھیں بلکہ بے حد خوبصورت تھیں مگر سیٹھ عمران سب لڑکیوں کا احترام کرتے تھے اور انہیں بیٹی کہہ کر بلاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لڑکیوں کے دم سے ہی سارا دفتر باغ و بہار نظر آتا تھا لیکن یہ ساری سجاوٹ کاروباری نوعیت کی تھی۔ لڑکیوں کو وہاں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ وہ وہاں برسوں سے کام کر رہی تھیں۔ عورت ہونے کے ناطے ان کو کافی مراعات بھی حاصل تھیں لیکن اب ان کے دلوں میں خوف سا ابھر رہا تھا۔ وہ بزنس کلاس کے کمپلیکس سے بے خبر نہیں تھیں۔ اخباروں، کتابوں، فلموں اور گرد و پیش کے حالات سے یہ احساس ان کے اندر موجود تھا کہ ٹینڈرز کے حصول کے لئے، افسران اور صاحب اختیار لوگوں کی خوشنودی کے لئے حسین عورت کو آلہ کار بنانا کاروباری لوازمات میں شامل ہے لیکن سیٹھ عمران نے اس پہلو پر کبھی نہ سوچا تھا۔ خسارے کی وجہ شاید یہ بھی ہو۔

اب جبکہ کاشف احمد جنرل منیجر بن کر آ رہا تھا وہ بات ان سب کے دلوں میں یقین کی حد تک بیٹھ گئی تھی کہ وہ کمپنی کو اوپر اٹھانے کے لئے یہ حربہ ضرور استعمال کرے گا۔

عورت اپنی عصمت کے بارے میں جلد چوکنا ہو جاتی ہے اس لئے وہ سب لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں۔ نیلم، فریال اور عارفہ کا خیال تھا کہ انہیں یہ نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔ یہ تینوں کنواری تھیں اور اپنے رشتوں کی بات چیت کے دور سے گزر رہی تھیں۔ ایسے وقت میں وہ کسی خطرے میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں۔ شاہدہ اور زرین شادی شدہ ضرور تھیں مگر بے حد حسین تھیں۔ اس وقت وہ بھی اپنے حسن سے خوفزدہ ہو رہی تھیں۔ شاہدہ کے خاوند نے تو شاہدہ کو کئی بار کہا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ دے، گھر کی گزر بسر کے لئے وہ خود بھی اچھی کمائی کر رہا تھا اور اس دیکھتے ہوئے شعلے کو باہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے کہیں بھی آگ لگ سکتی ہے مگر شاہدہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھی۔

دفتر کی گاڑی لڑکیوں کو ان کے گھر سے لے جاتی اور گھر پر ہی چھوڑ جاتی تھی۔ دفتر میں خاصا ڈسپلن تھا، کسی قسم کی غلط حرکت کے ہونے کے امکانات نہ تھے مگر اب شاہدہ نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی عارفہ سے متفکر لہجے میں کہا۔ ''عارفہ! میں سمجھتی ہوں کہ اب مجھے اپنے شوہر کی بات مان لینی چاہئے''۔

''لیکن میں کیا کروں شاہدہ!'' عارفہ نے کہا۔ ''مجھے تو گھر والے نوکری چھوڑنے کے لئے کہتے ہی نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسی نوکری سے میرے لئے اچھا رشتہ ملنے کی امید بنتی ہے اور مجھے پروموشن بھی ملنے والی ہے''۔

یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ کاشف...... '' شاہدہ نے پھر ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کاشف جائے بھاڑ میں''۔ عارفہ تنک کر بولی۔ ''عورت کا اپنا کردار مضبوط ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا''۔

''آہستہ بول بھئی، وہ دیکھو! کاشف صاحب آ رہے ہیں''۔ زرین نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

سب کی نظریں ایک دم صدر دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ کاشف احمد کار سے اتر کر اپنے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سینو عمران خان اور کچھ الیکٹرانک انجینئر بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان سب کے دفتر میں داخل ہوتے ہی دفتر کا دروازہ بند ہو گیا۔ اندر کیا کچھ زیر بحث رہا اس کا کسی کو پتہ نہ چل سکا مگر رنگ سب کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنے اندر بلائے جانے کے خوف کا شکار تھا مگر بلایا کسی کو نہ گیا۔ پھر شام کو سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح کاشف دفتر میں اکیلا داخل ہوا۔ سب نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے بھی ایک لطیف مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا اور دفتر کے اندر داخل ہو گیا۔ ہر شخص اس کی مسکراہٹ کے پیچھے کسی اچھل

کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ لڑکیاں اپنی نسوانیت اور پردہ حسن کی خیر مانگ رہی تھیں مگر دفتر میں ... حسب دستور کام ہوا۔ بڑے بابو سے چند فائلوں ... غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ کسی قسم کا کوئی حکم نامہ ... گیا۔

''شکار کے لئے جال بچھانے سے پہلے پیش بندیاں اور احتیاط لازمی ہوتی ہے''۔ ... سوچ رہے تھے۔

دوپہر کو لنچ سے تھوڑی دیر پہلے البتہ ایک چھوٹی سی بات نے ہوا کے رخ کی نشاندہی کی۔ دفتر سے باہر جاتے ہوئے منیجر صاحب نے کسی قدر تشکیں نگاہوں سے نیلم کی طرف دیکھا۔ سٹینو ہونے کے ناطے اس کا شیشے کی کھڑکیوں والا کیبن کاشف کے دفتر کے پاس تھا۔ آج نہ جانے کیسے اون کا گولا، سلائیاں اور ادھ بنا سویٹر اس کے میز پر ہی رہ گیا تھا۔ وہ فارغ وقت میں سویٹر بنتی ضرور تھی مگر یہ سب چیزیں عموماً میز کی دراز میں رکھا کرتی تھی۔ لنچ کے بعد منیجر صاحب نے آفس سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا کہ ملازموں کو دفتر میں کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے، وہ کمپیوٹرز کی کمپنی میں ہوزری کا کام نہیں دیکھنا چاہتے۔

اس واقعہ کے بعد دفتر کا سارا سٹاف بالخصوص لڑکیاں خبردار ہو گئیں لیکن اب بھی کچھ کا خیال تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں پکڑ کر لڑکیوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں مگر دوسرے دن خلاف توقع ایک اور دھماکہ ہوا۔ پرچیز ڈیپارٹمنٹ کے انچارج مسٹر نبیل اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی سٹور کیپر مسز غزالہ چودھری کو (جو خانیوال سے آئی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی بدصورت عورت تھی) نوکری سے برخاستگی کا نوٹس مل گیا۔ بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا تھا کہ ان دونوں نے مل کر مال کی خریداری میں ہیرا پھیری کی ہے۔ مال سپلائی کرنے والی فرموں سے رشوت لے کر انہیں مراعات دی تھیں۔ گھٹیا کوالٹی کا مال پاس کروایا تھا۔ ان سب باتوں کے جواب موجود تھے۔ ان کے بچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا مگر دفتر والوں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ یہ سب اس دفتر کو مردوں اور بدصورت عورتوں سے خالی کرنے کے بہانے ہیں تاکہ کاشف صاحب اپنی منظور نظر حسینائیں بھرتی کر کے یہاں لا سکیں۔

اس سے افواہوں کا بازار اور گرم ہوا۔ قیاس آرائیاں شدت اختیار کرنے لگیں۔ لوگ اب بے چینی سے کاشف کے اگلے قدم کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر اس کے بعد عرصہ تک کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر افواہوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا لیکن پھر مالی سال کے آخری مہینوں کے دوران دفتر کے معمول پر آئے ہوئے ماحول میں ایک نئی چنگاری آ گری۔

شام کو دفتر بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کاشف کا چپڑاسی دفتر کی حسین ترین دوشیزہ فریال کے پاس آ کھڑا ہوا اور شرارت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "صاحب! آپ کو یاد کر رہے ہیں"۔ فریال کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اکاؤنٹس برانچ کی انچارج تھی۔

اسے شک گزرا کہ فلمی کہانیوں کی طرح کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر اسے آج شام کو اوور ٹائم کے لئے روکا جائے گا اور اس کے بعد...... اس کا جی چاہا کہ وہ اندر جانے سے انکار کر دے مگر چپڑاسی فرشتۂ اجل کی طرح اس کے سر پر کھڑا تھا اور انکار کا مطلب نوکری سے ہاتھ دھونا تھا۔ وہ اٹھ کر بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ چپڑاسی کاشف کے دفتر کا دروازہ کھول کر باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ ہمت جتا کر اندر داخل ہوئی تو خودکار دروازہ اس کے پیچھے آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔

اب سب لوگوں کے کان اس طرف لگے ہوئے تھے مگر اس ساؤنڈ پروف کمرے کے اندر سے ائر کنڈیشنر کی ہلکی سی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فریال اس دفتر سے باہر نکلی۔ سب نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

"ہو گیا اس کا کام تمام!" سب کے دلوں سے بیک وقت آواز اٹھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔ اس کے پاس سب لڑکیاں مجسم سوال بنی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا فریال؟" آخر عارفہ نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"تم سب لوگوں نے میرا بیڑا غرق کر دیا"۔ فریال نے غصہ سے کہا۔

"ہم نے...؟! بتاؤ تو سہی، کیا بات ہے، کیا ہوا؟" اب برانچ کی سب لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ذہن میں شبہات۔

"تو سنو، مجھے ابھی ابھی استعفیٰ لکھ کر دینے کو کہا گیا ہے اور کل سے کام پر نہ آنے کا حکم"۔ فریال نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "سیلز ٹیکس کے کاغذات تم سب نے مل کے

تیار کئے تھے تو ان میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ سیلز لسٹوں کے اندراج بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ محکمہ سیلز ٹیکس کی طرف سے کمپنی کو پچیس ہزار روپے جرمانہ ہو گیا ہے۔ اس کا عتاب مجھ پر ہی تو پڑنا تھا۔ اس سیکشن کی انچارج جو ہوں۔ میں نے انہیں بہت کہا، منتیں کیں، وجوہات بیان کیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ مجھے ہی اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور نوکری سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں"۔

یہ قصہ سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ لڑکیوں کے تو سوچوں کے زاویے بدلنے لگے۔ انہیں اپنے حسن اور نسوانیت پر چوٹ پڑتی محسوس ہوئی۔ انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ ایسا حسن پرست شخص جس کے بارے میں اتنی افواہیں مشہور تھیں، اس طرح بے حس مشین بن گیا کہ دفتر کی سب سے خوبصورت لڑکی کو ایک دم نوکری سے نکال دیا لیکن بہتوں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ یہ حملہ باقی لڑکیوں کو زیر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ جو کچھ بھی تھا فریال کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کا حساب صاف کر دیا گیا۔

اب باقی سٹاف بہت سنبھل کر چل رہا تھا۔ اس حادثے نے افواہوں کا اثر بھی زائل کر دیا تھا۔ دفتر کے کام میں مستعدی آ گئی تھی لیکن کچھ بہت ہی خوبصورت لڑکیاں اپنی نسوانیت اور حسن کے بارے میں اب بھی بے پروا نہیں تھیں۔ کاشف احمد کے ماضی کے کردار کو نہ بھول سکی تھیں مگر ان کی سوچوں کی سمت اب بدل رہی تھی۔ وہ اپنے حسن اور نسوانی کشش سے پہلے خوفزدہ رہتی تھیں۔ اُسے اب بوقتِ ضرورت حربے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے سوچ رہی تھیں۔ مردوں کا خیال تھا کہ کاشف نے یہ چال چلی ہے۔ اب وہ اس کے نئے حملے کا تماشا دیکھنے کے منتظر تھے۔

فریال کے چلے جانے کے بعد اکاؤنٹس برانچ کی ایک سینئر پوسٹ خالی ہو گئی تھی۔ اس کے لئے کسی دوسری لڑکی کی پروموشن کا چانس تھا۔ اس سلسلے میں اندازے لگ رہے تھے کہ اس عہدے کے لئے امیدوار لڑکیاں اب خوش مزاج اور سمارٹ ہو گئی تھیں۔ دفتر کا کام مستعدی سے کرنے کے علاوہ وہ اپنے لباس اور میک اپ کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ آخر ایک دن عارفہ کی فائل اوپر طلب کر لی گئی۔ خوبصورتی میں وہ بھی فریال سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ دفتر میں بھی اس کے حسن کا طوطی بول رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی پروموشن پہلے سے ہی زیر غور تھی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی فائل اسی مقصد کے لئے طلب کی گئی ہے اور کل اسے ضرور انٹرویو کے لئے بلایا جائے گا۔

دوسرے دن وہ ہر طرح سے تیار ہو کر دفتر پہنچی۔ اس کے حسن کے آگے سب ہیچ لگ رہے تھے۔ اس کے حسن سے سارا ہال جگمگا رہا تھا۔ اس کی گھنیری عطر بیز زلفوں سے دفتر کی فضا معطر ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی جاذبیت تھی اور ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ۔

دفتر کھلنے کے تھوڑی دیر بعد کاشف نے واقعی اسے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ اس نے اٹھنے سے پہلے ایک بار پرس میں سے اپنا چھوٹا سا پاؤڈر کا بکس نکال کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ تھوڑی نوک پلک درست کی اور اپنے بالوں کو سنوارتی ہوئی کاشف کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ دفتر میں ایک بار پھر سسپنس کا ماحول پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ اس بار کاشف کا کردار برہنہ ہونے کے منتظر تھے اور کچھ لوگ عارفہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ اسے اتنی جلدی اتنی بڑی ترقی مل رہی ہے۔ اس کے بعد رومانس کا ایک لمبا سلسلہ چلنے کے امکانات تھے اور پھر پتہ نہیں کیا ہو سکتا تھا۔

لیکن ان کے اس خواب کا طلسم بھی جلد ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی عارفہ کا بسورتا ہوا چہرہ ان سب کے سامنے

تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔ سب ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی عزیز سہیلی شاہدہ نے جلدی سے اس کے پاس آ کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا عارفہ؟''

''آفس سے چھٹی ہو گئی میری بھی''۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی۔

''ہائے، یہ کیسے ہو گیا؟'' شاہدہ نے گھبرا کر پھر سوال کیا۔

''پچھلے سال کمپنی نے جو ٹینڈر بھیجا تھا وہ ریجکٹ ہو گیا ہے''۔

''تو اس میں تمہارا کیا قصور؟'' شاہدہ نے گرم ہو کر کہا۔

''اس کے ساتھ کچھ اہم کاغذات منسلک ہونا تھے۔ نجانے کیسے وہ ادھر فائل میں پڑے رہ گئے۔ انہی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ٹینڈر پاس نہیں ہوا۔ کاغذ ذ پیچ کرنے کے لئے میرے ہی حوالے کئے گئے تھے۔ بہت بڑا ٹینڈر تھا''۔

''اوہ!'' شاہدہ اداس ہو کر بولی۔

''تم تو پروموشن کی امید لے کر گئی تھی''۔ زریں نے تعصب بھرے لہجے میں کہا۔

''پروموشن...... ارے وہ تو مسز شازمین کو مل گئی ہے''۔ دور بیٹھے ہوئے ہیڈ کلرک نے مسز شازمین کی فائل کے اوراق الٹتے ہوئے کہا جسے صاحب کا چپڑاسی ابھی ابھی اس کی میز پر رکھ کر گیا تھا۔

مسز شازمین چیچک کے داغوں والی بدصورت بڑھیا...... سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دفتر کا سارا حسن جیسے اس وقت اپنی شکست خوردگی کا ماتم کرنے لگا تھا۔

◆

پھندا

شہروز سمجھ رہا تھا کہ عریشہ کے قتل کا ثبوت مٹ گیا لیکن وہی ثبوت اس کے گلے کا پھندا بن گیا۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

30 سالہ عریشہ لاہور کے علاقہ اسلام پورہ میں رہتی تھی۔ اس کے کنبے میں باپ علی شاہد، ماں عروسہ اور دو بھائی تھے نوید اور عدیل۔ عریشہ جوان ہوئی تو 2000ء میں علی شاہد نے اُس کی شادی نزدیک ہی رہنے والے وقار چوہدری سے کر دی۔ شادی کے ابتدائی برس خوب اچھے گزرے۔ اسی دوران عریشہ ثوبیہ اور زارا نامی دو بیٹیوں کی ماں بن گئی۔ بس اسی سبب وقار چوہدری کی کھوپڑی سنک گئی۔ دراصل وقار چوہدری کو بیٹے کی آرزو تھی مگر عریشہ نے دونوں بار بیٹی جنی تھی۔ یہی بات اس کی کھوپڑی الٹنے کا باعث بنی۔ ایسا اس لئے کہ وقار چوہدری بھی ان جاہلوں میں سے ایک تھا جو بیٹی کی پیدائش ہونے پر بیوی کو ہی قصوروار مانتے ہیں۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ عورت کی کوکھ سے بیٹا جنم لے یا بیٹی اس کا براہ راست ذمہ دار باپ ہوتا ہے۔ بچے کی جنس کے لئے ماں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

ماں ایک کائنات ہوتی ہے، ماں پھول ہوتی ہے جو روٹی سینکتے ہوئے اپنے ہاتھ جلا لیتی ہے اور آنچل میں سارے دکھ درد چھپا لیتی ہے۔ ماں پاکیزہ شالہ بھی ہوتی ہے اور وجود کا حوالہ بھی۔

پتہ نہیں یہ وقار چوہدری کا دماغی فتور تھا یا کسی دوسرے نے اس کے دل میں یہ بات بھر دی تھی کہ عریشہ ایسی عورت ہے جو صرف بیٹیوں کو ہی جنم دے سکتی ہے اس سے بیٹے کی امید رکھنا بے کار ہے۔ بس وقار چوہدری کی نظروں سے اتر گئی۔ جس بیوی کو وہ چاند کا ٹکڑا کہا کرتا تھا اس کی شکل دیکھتے ہی اُس کا خون کھولنے لگتا۔ اس کی خواہش تھی کہ عریشہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ اسی لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی وہ اس سے جھگڑتا اور اُسے پریشان کرتا رہتا۔ عریشہ کی سمجھ میں یہ بات آتے ہی اُس

نے بھی شوہر سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں دونوں بیٹیوں کو لے کر میکے چلی جاؤں تو یہ کبھی نہیں ہونے والا"۔ عریشہ نے وقار سے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "یاد رکھو، رات کو تمہارا انتظار کرنے سے پہلے، صبح سے میں رات کا انتظار کرتی ہوں"۔

وقار چوہدری نے عریشہ کو بھگا کر کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو اُسے بیٹا پیدا کر کے دے سکے۔ باتوں سے جب کام نہیں چلا تو اُس نے عریشہ پر جسمانی ظلم کرنا شروع کر دیا۔ روز روز کی مار پیٹ عریشہ کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ میکے جا کر باپ اور بھائی کو اپنی چوٹیں دکھانے لگی۔ یہ دیکھ کر اور عریشہ کی چیخ سن کر علی شاہد اور نوید کا خون کھول جاتا۔ وہ وقار چوہدری کے پاس جا کر اسے شرافت سے رہنے کے لئے سمجھاتے مگر وقار چوہدری کہاں سمجھنے والا تھا۔ اُس کے دماغ میں تو ایک ہی فتور سوار تھا کہ عریشہ بیٹا پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے جتنی جلد ممکن ہو سکے اس سے نجات حاصل کر کے دوسری شادی کر لی جائے۔ اس لئے اُس نے عریشہ کو بھگانے کے لئے اُس پر ظلم توڑنا مسلسل جاری رکھے۔

ایک دن شام کے وقت علی شاہد اور نوید عریشہ کی خیر خبر لینے اس کے گھر پہنچے۔ انہوں نے دیکھا شراب کے نشے میں چور وقار چوہدری عریشہ کو بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ باپ اور بھائی سے عریشہ کی پٹائی دیکھی نہیں گئی۔ اُن دونوں نے وقار کو اپنی حرکت سے باز آنے کے لئے سمجھایا تو وہ اُن سے ہی بھڑ گیا۔ جواب میں وہ دونوں مل کر وقار چوہدری کو پیٹنے لگے۔ عرصہ سے ظلم کی بھٹی میں جھلس رہی عریشہ بھی باپ اور بھائی کی حمایت میں شوہر پر ٹوٹ پڑی۔ طیش میں کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کون وقار کو کہاں اور کتنا مار رہا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقار چوہدری کو سنگین چوٹیں آئیں اور پٹائی کے دوران ہی اُس نے دم توڑ دیا۔

قتل کا یہ معاملہ ہاؤسنگ کالونی پولیس سٹیشن میں درج ہوا۔ پولیس نے عریشہ، علی شاہد اور نوید کو گرفتار کر لیا۔ عریشہ جیل گئی تو وقار چوہدری کا بھائی فراز چوہدری عدالت کے حکم سے اُس کی دونوں بیٹیوں کو اپنے گھر لے گیا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو عدالت نے ثبوتوں کی کمی میں عریشہ کو الزام سے بری کر دیا۔ جبکہ علی شاہد اور نوید کو غیر ارادتاً قتل کا ملزم پایا لہٰذا دونوں کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

عریشہ رہا ہو کر اپنے میکے آ گئی لیکن گھر، کنبے، محلے اور رشتے داروں میں اُس کی پہلی جیسی عزت نہیں رہ گئی تھی۔ سب اُسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ علی شاہد اور نوید کے جیل جانے سے گھر میں جو تباہی آئی تھی اُس کا ذمہ دار بھی عریشہ کو ہی مانا جاتا تھا۔ عریشہ پر دو طرفہ مار پڑ رہی تھی۔ دن کو وہ ماں اور اپنے رشتے داروں کے طعنے سنتی اور رات کو اُس کا بستر انگاروں کی سیج بن جاتا۔ شوہر کے ساتھ تھی تو پُرسکون تھی۔ وقار چوہدری میں بعد میں لاکھ برائیاں آ گئی تھیں مگر وہ سچا مرد تھا۔ عریشہ سو سو جان سے اُس پر نثار ہو جاتی۔

ایک رات اپنی خواہش کی آگ میں بے حال عریشہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کوئی دوسرا شہر ہوتا تو اُس وقت سڑکوں پر آوارہ کتے بھونک رہے ہوتے لیکن یہ لاہور شہر تھا جہاں راتیں جاگتی ہیں۔ بے مقصد سڑکوں پر چلتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ ایک نوجوان اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

"اکیلی ہو؟" کچھ دیر بعد نوجوان نے ذرا قریب آ

محبت خوشبو ہوتی ہے اور خوشبو خاموش ہوتی ہے۔ خاموشی بھی ایسی جو نہ کم ہوتی ہے اور نہ زیادہ مگر یہ رقص میں رہتی ہے، محبت رقص ہوتی ہے۔

کر پوچھا۔
"میں وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے"۔ عریشہ نے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "نیند نہیں آ رہی تھی، اس لئے سڑک پر گھومنے نکل آئی"۔
"جوانی ہوتی ہی ایسی ہے"۔ نوجوان نے ہنس کر کہا۔ "کہ رات کو آنکھوں سے نیند اڑا دیتی ہے۔ تنہائی مجھے بھی ڈس رہی تھی اس لئے میں بھی گھر سے نکل آیا"۔
"کیا نام ہے تمہارا؟" عریشہ نے پوچھا۔
"وسیم حیدر"۔ نوجوان نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ "میں بھی تمہاری طرح اکیلا ہوں"۔
عریشہ سمجھ رہی تھی کہ وسیم کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ وسیم کو تنہائی کی بوریت دور کرنے کے لئے عورت کی ضرورت تھی تو عریشہ بھی وقار کے بعد تنہائی کا عذاب جھیل رہی تھی۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ وسیم ہمراہ ہو لی۔ نصف گھنٹے بعد ہی وہ وسیم کے کمرے تھے۔
وقار کے مرنے کے بعد دو سال بعد عریشہ کو مرد کے ساتھ تنہائی نصیب ہوئی تھی لیکن وہ مرد اس کا اپنا نہیں تھا، غیر تھا۔ وہ جذبات میں ایسی اندھی ہوئی کہ اس غیر مرد کی آغوش میں سمٹ گئی۔ اسی لئے دین نے بیوہ کی دوسری شادی کا حکم دیا ہے۔
اس کے وسیم اُسے اُس کے گھر تک چھوڑ گیا۔ اُس رات کے بعد عریشہ اور وسیم کے تعلقات مزید استوار ہو گئے۔ دیر شام کو عریشہ گھومنے کے بہانے گھر سے نکلتی اور وسیم کے پاس پہنچ جاتی۔ بے خوف ہو کر دونوں اپنے دل کی مراد پا لیتے۔ چند دنوں میں ہی وہ ایک دوسرے سے اتنے نزدیک ہو گئے کہ عریشہ نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور مستقل طور پر وسیم کے ساتھ رہنے لگی۔ حالانکہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی اس کے باوجود وہ خود کو میاں بیوی بتاتے تھے۔ ٹھوکر نیاز بیگ میں رہنے والوں نے بھی ان

محبت محبوب عاشق، گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ نہیں ہوتی، یہ سب انائیں ہیں، شناختیں ہیں، محبت اس سے مبرا ہے۔ شناخت مطالبہ ہوتی ہے اور محبت میں کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔ محبت دوستی بھی نہیں ہوتی۔ دوستی میں کچھ مشترک ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا دوستی مشروط ہوتی ہے، وقتی بھی ہو سکتی ہے۔

کے اس اعلان کردہ رشتے کو قبول کر لیا تھا۔
اس ناجائز رشتے سے جلد ہی عریشہ کے پاؤں بھاری ہو گئے اور اُس نے 7 جولائی 2005ء کو بیٹے کو جنم دیا جس کا نام بلال رکھا گیا۔ جس دن بلال کی پیدائش ہوئی عریشہ کو اُس دن وقار چوہدری کی بہت یاد آئی۔ وہ زندہ ہوتا تو عریشہ، بلال کو لے جا کر اُس کی گود میں ڈال دیتی۔ بہرحال بلال کی پیدائش کے بعد عریشہ اور وسیم کی زندگی خوشیوں سے بھر گئی۔
اسی دوران حالات نے پھر کروٹ بدلی۔ عریشہ کا باپ علی شاہد جیل میں سزا کاٹ رہا تھا کہ کسی بیماری کے باعث یکم اگست 2009ء کو اُس کی موت ہو گئی۔ اسی دوران اسلام پورہ کی وہ زمین جس پر علی شاہد کا گھر تھا، سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے عوض اس کے کنبے کو بسم اللہ کالونی میں پانچ مرلہ کا کوارٹر دے دیا۔
عریشہ کا کنبہ اسلام پورہ سے بسم اللہ کالونی میں منتقل ہو گیا۔ عریشہ اپنی مرضی سے وسیم کے ساتھ رہ ضرور رہی تھی مگر میکے سے اس کا تعلق قائم تھا۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار وہ اپنے میکے ضرور جاتی تھی۔ اس لئے وہاں کے حالات کا علم وسیم کو بھی ہوتا رہتا تھا۔ عریشہ کے بھائی نوید کے جیل سے رہا ہونے کا فرمان جاری ہوا تو اُس کے کنبے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
بھائی کے گھر آنے کی بات سے عریشہ بھی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ نوید کے رہا ہو کر آنے کی

خوشخبری اُس نے وسیم کو سنائی تو وسیم کا خون خشک ہو گیا کیونکہ اُسے علم تھا کہ نوید عریشہ کے شوہر کو قتل کر کے جیل گیا تھا۔ وہ نوید کی گرم مزاجی اور پُر تشدد مزاج کے بارے میں سن چکا تھا۔ وسیم کمزور دل کا نوجوان تھا، اسے وہم ہو گیا تھا کہ وہ بغیر شادی کیے عریشہ کو اپنے پاس رکھے ہوئے ہے اور اُسے ایک بچے کی ماں بھی بنا دیا ہے۔ تو یقینی طور پر نوید اُس کی جان لے لے گا۔ اسی خوف سے جس دن نوید کو جیل سے رہا ہو کر آنا تھا وہ اپنا کمرہ، عریشہ اور بچے بلال کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ کاش کہ لوگ سمجھ سکیں کہ رشتے بنانا اصل بات نہیں بلکہ اصل بات اُن رشتوں کو نبھانا ہوتا ہے۔

عریشہ کی قسمت بھی عجیب تھی۔ ایک سہارا ملا تھا تو وہ بھی کھو گیا۔ اُس کی زندگی میں پھر بھٹکاؤ شروع ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے لئے نئے ٹھکانے کی تلاش شروع کی تو پاس ہی فٹ پاتھ پر سی ڈی فروخت کرنے والے شاکر خان سے اُس کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ شاکر خان نے عریشہ کے ساتھ بلال کو بھی اپنانے کا وعدہ دیا تو عریشہ نے وسیم کے کرائے کے کمرے سے سارا سامان سمیٹا اور شاکر خان کے ساتھ چلی گئی۔

کچھ مہینے ہی عریشہ شاکر خان کے ساتھ رہی اور پھر اُس سے اکتا گئی۔ شاکر خان عریشہ اور بلال کا خیال تو رکھتا تھا مگر محبت کا کمزور ساتھی ثابت ہوا تھا۔ روکھے پھیکے ساتھی کے ساتھ رہنا عریشہ کو راس نہیں آیا۔ اس لئے اُس نے شاکر خان کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ گھر بسانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد عریشہ نے پانچ سات مردوں کی دوستی کا امتحان لیا اور ان میں سے شہروز کو اپنا شریک زندگی بنا لیا۔ شہروز آبائی طور سے مصطفیٰ آباد کا باشندہ تھا۔ چند سالوں سے وہ لاہور میں رہ کر نوکری کر رہا تھا۔ اگر شہروز میں بہت سی خوبیاں تھیں تو ایک بڑی خرابی بھی تھی کہ وہ شراب کا عادی تھا۔ اسی وجہ سے اُس کی بیوی اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

مجبور عریشہ نے شہروز کی شراب کی لت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور شاکر خان کا گھر چھوڑ کر شہروز کے ساتھ رہنے لگی۔ بلال بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بغیر شادی کیے عریشہ تیسرے مرد کے ساتھ رہ رہی تھی۔ عریشہ کے پیار میں شہروز نے شراب پینا بھی کم کر دی تھی۔ بلال کو بھی وہ بہت چاہتا تھا۔ تینوں کی زندگی نہایت خوشگوار گزر رہی تھی کہ پھر مصیبت نے اپنا سیاہ سایہ اُن پر پھیلانا شروع کر دیا۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا، تبسم جٹ نامی کسان ندی کنارے پانی سے اپنا کھیت سینچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے پانچ چھ سال کے ایک لڑکے کو پانی میں بہہ کر آتے دیکھا۔ تبسم نے فوراً بچے کو پانی سے نکالا تو وہ زندہ تھا۔ تبسم نے یہ بھی دیکھا کہ بچے کی گردن میں کالی ڈوری مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی جس کے سبب اُسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔

تبسم نے سب سے پہلے کالی ڈوری کاٹی پھر اُس کے پیٹ سے پانی نکالا تو تھوڑی ہی دیر میں بچہ ہوش میں آ گیا۔ تبسم کے پوچھنے پر اُس نے اپنا نام بلال بتایا اور کہا کہ شہروز نے پہلے اُس کی ماں کو پتھر سے کچل کر مارا اور پھر اُس کے گلے میں کالی ڈوری کس کر ندی میں پھینک دیا تھا۔ معاملہ سنگین تھا اس لئے تبسم بلال کو اپنے ساتھ تھانہ سول لائن لے گیا اور انسپکٹر قمر زمان کے سامنے پیش کر دیا۔

دو دن پہلے ہی تھانہ سول لائن میں ایک نامعلوم عورت کی لاش ملی تھی جس کی کلائی پر عریشہ گدا ہوا تھا۔ بلال بھی اپنی ماں کا نام عریشہ بتا رہا تھا۔ اس لئے قمر زمان نے لاش کا فوٹو بلال کو دکھایا تو اُس نے اُس کی شناخت اپنی ماں کے طور پر کر دی۔

عریشہ کے قتل کا مقدمہ تھانہ مصطفیٰ آباد میں پہلے

سے درج تھا۔ بلال کے معاملے کو بھی جرم ارادہ قتل کے تحت درج کر لیا گیا اور شہروز کی تلاش شروع کر دی گئی لیکن پولیس کی تمام کوششوں کے باوجود شہروز گرفت میں نہ آیا۔ آخرکار پولیس نے اس کے ایک دوست کے گھر چھاپہ مار کر اس کو پکڑ لیا۔ 14 مارچ کو اُس سے پوچھ گچھ کی گئی تو دونوں واقعات کی گتھی سلجھ گئی۔

ہوا یہ کہ عریشہ اور شہروز کی زندگی نہایت خوشگوار گزر رہی تھی کہ عریشہ کا شوہر نمبر 3 شاکر خان دلن بن کر ان کے درمیان آ گیا۔ بات اصل یہ تھی کہ شاکر خان کو عریشہ کے حسن کے جلوؤں کے سائے میں رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ تنہائی اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ عریشہ کی مدہوش کن ادائیں اُسے بہت ستاتی تھیں۔ اسی لئے شاکر چاہتا تھا کہ عریشہ واپس لوٹ آئے۔ گناہ کے گناہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے چھپ کے کرنا پڑتا ہے۔

شاکر خان نے اپنی کوششوں سے شہروز کا گھر ڈھونڈ نکالا تھا اور شہروز کی غیر موجودگی میں اُس کے گھر آ کر عریشہ سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ موبائل فون کے ذریعے مسلسل اُس سے رابطے میں تھا۔ عریشہ بھی مجبوراً اُس سے رشتہ قائم کئے ہوئے تھی۔ شہروز کو ان سب باتوں کا علم ہوا تو اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ عریشہ سمجھانے سے مان جانے والی عورت ہے اس لئے اُس نے لاہور ہی چھوڑ دیا اور عریشہ اور بلال کو لے کر مصطفیٰ آباد میں رہنے چلا گیا۔

عریشہ نے چند ماہ مصطفیٰ آباد میں گزارے اور اُس کے بعد شہروز سے لاہور چل کر رہنے کی ضد کرنے لگی۔ شہروز اُس کا یہ مطالبہ پورا کرنے کو تیار نہیں ہوا تو بلال کو لے کر وہ اکیلی ہی لاہور چلی آئی اور اپنی سہیلی ثانیہ کے گھر میں رہنے لگی۔ اِدھر شہروز کہاں پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ 20 فروری کو اُس نے لاہور میں عریشہ کو کھوج نکالا اور دونوں کو بی آر بی نہر گھمانے لے گیا۔ چلتے چلتے وہ تھک گئے تو وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ وہیں پر باتوں باتوں میں شہروز نے عریشہ سے مصطفیٰ آباد چل کر رہنے کے لئے کہا اور اُسے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ مصطفیٰ آباد پہنچتے ہی وہ اس سے بیاہ کر لے گا۔

عریشہ نہ تو مصطفیٰ آباد جانے کو تیار تھی اور نہ شہروز سے شادی کرنے پر۔ اس کا کہنا تھا۔ شادی کرنا ضروری تو نہیں بغیر شادی کئے بھی میں زندگی بھر ساتھ رہ لوں گی شرط بس اتنی ہے کہ تم لاہور میں ہی میرے ساتھ رہو۔

شہروز کا یہ خیال تھا کہ عریشہ پرانے یاروں کے ساتھ عیش اڑانے کے لئے لاہور میں رہتی ہے۔ اسی سبب وہ اُس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسی بات پر بات بڑھ گئی۔ شہروز نے غصے میں پاس پڑا ایک بھاری پتھر اٹھا کر عریشہ کے سر پر مار دیا جس کے نتیجہ میں عریشہ کا سر پھٹ گیا اور اس کی موت ہو گئی۔ شہروز بلال کا کچھ بھی بُرا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ اُسے لے کر وہاں سے چلا گیا۔

معصوم بلال کو صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ اُس کی ماں مر چکی ہے اس لئے وہ مسلسل اپنی ماں کے پاس جانے کی ضد کرتا رہا۔ دو دن میں ہی اس نے شہروز کا ناک میں دم کر دیا۔ شہروز کو لگ رہا تھا کہ بلال اگر اسی طرح اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا تو وہ پکڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا 22 فروری کو شہروز نے ایک جرم چھپانے کے لئے دوسرا جرم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بلال کو ندی کنارے لے گیا۔ پوری طاقت سے اُس کے گلے میں ڈوری کس دی اور اُسے ندی میں پھینک دیا۔ شہروز سمجھ رہا تھا کہ عریشہ کے قتل کا ثبوت مٹ گیا لیکن وہی ثبوت اس کے گلے کا پھندا بن گیا۔ تادم تحریر شہروز جیل میں تھا اور بلال کی پرورش اُس کا بھائی نوید کر رہا تھا۔

مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس بستی کے لوگ بھی دولے شاہ کے چوہے ہیں جن کے سروں پر نظر نہ آنے والی ٹوپی پہنادی گئی ہو۔ ان کے جسم کتنے توانا ہیں لیکن دماغ کتنے چھوٹے!

☆ نازیہ

میں نے زندگی کی مسلسل ناکامیوں کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ مجھے علم تھا کہ ناہموار معاشرے میں محنت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مجھے دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے، یہی بہت غنیمت ہے۔ ورنہ جس طبقے سے میں تعلق رکھتا تھا اس طبقے کے لوگ اکثر وقت سے پہلے ہی بھوک سے مرجاتے ہیں۔

میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں ان بڑے طبقے کے لوگوں سے اپنی محنت کی قدر و قیمت کی توقع بھی نہیں رکھتا جو خود اٹھ کر اپنے ہاتھوں سے پانی کا ایک گلاس بھی نہیں پی سکتے۔ جن کے ایک دستخط کی قیمت مجھ جیسے ہزاروں مزدوروں کی عمر بھر کی محنتوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

میں ایم اے پاس کرنے کے باوجود بھی اس مل میں تین ہزار روپے ماہوار پر مزدوری کر رہا ہوں جہاں آج سے بیس سال پہلے میرا باپ پرانی مشین پر کام کرتے ہوئے موت کے منہ میں جا پہنچا تھا۔ اس مل کا مالک ان پرانی مشینوں کو بدلنے کا نام نہیں لیتا تھا کیونکہ اسے اپنی تجوری ان ہزاروں مزدوروں کی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس مل میں آئے دن اس طرح کے حادثات ہوتے رہتے تھے اس لئے میرے باپ کی موت کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب میں اپنے باپ کی جگہ اس مل میں کام کرنے آیا تھا اس وقت میری عمر کوئی بارہ یا تیرہ برس ہوگی۔ میری ماں لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے میرے باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن باپ کے انتقال کے بعد مسلسل بیمار رہنے لگی اور باقاعدہ علاج نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک سرکاری ہسپتال میں دم توڑ دیا تھا۔

ماں کے انتقال کے بعد میں دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ مجھے صرف تین ہزار تنخواہ ملا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے کرائے کا مکان چھوڑنا پڑا۔ اب میں دن بھر مل میں محنت مزدوری کرتا تھا اور رات فٹ پاتھ پر گزارتا لیکن میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اپنی کتابوں کو اپنی تنہائی کا ساتھی بنالیا۔ سیاسیات میں ایم اے کرنے کے باوجود میں نے کسی جگہ نوکری کے لئے کوشش نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے کسی بڑی سفارش کی ضرورت کے ساتھ کسی

دوسرے صوبے کے ڈومیسائل کی ضرورت بھی پڑے گی۔
میں ایک حساس اور خوددار انسان ہوں۔ میرا نام ماں باپ نے عامر رکھا تھا۔ میری باغیانہ لیکن سچی باتوں کی وجہ سے لوگ مجھے سرپھرا کہتے تھے۔ میں ایک حوصلہ مند اور ذہین نوجوان تھا۔ میں نے اپنی دن رات کی محنت سے اتنی ترقی کرلی کہ آج میرے پاس غریبوں کی بستی میں اپنا ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ مجھے اپنی بستی اور وہاں کے لوگوں سے بہت محبت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ عظیم لوگ ہمیشہ چھوٹے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں۔
کتنے سچے تھے اس بستی کے لوگ، وہ اپنی ذات کی پستی کو چھپانے کے لئے بلند دیواروں میں قید نہیں تھے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے بستی رات کو تاریکی میں ڈوب جاتی لیکن یہاں کے باسی کور چشم نہیں تھے۔ انہیں اس تاریکی میں بھی ہر چیز صاف دکھائی دیتی۔ یہاں کے بوڑھے اور بچے اندھیرے میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے کیونکہ ان کے ضمیر روشن تھے۔ میں اپنی بستی کا ہردل عزیز نوجوان تھا، یہی وجہ تھی اس بستی کے سب نوجوان ہر شام میری مل سے واپسی کے منتظر رہتے تھے۔ میرے آتے ہی صداقت بابا کے چبوترے پر ایک محفل جم جایا کرتی تھی۔ یہاں سب لوگ میری عجیب وغریب باتیں سن کر حیران ہوتے۔ اس دن بھی میں ہمیشہ کی طرح عجیب وغریب باتیں کر رہا تھا، میں کہہ رہا تھا۔
''دوستو! ہمیں ایک ایسی کال کوٹھری میں بند کردیا گیا ہے جس میں ایک چھوٹا سا دریچہ ہے جو مغرب کی سمت کھلتا ہے۔ ہم ساری دنیا سے بے خبر ہیں، ہم نے کبھی سورج نکلتے نہیں دیکھا، ہماری آنکھوں نے صرف ڈوبتے سورج کو دیکھا ہے''۔
سب لوگ میری باتیں غور سے سن رہے تھے حالانکہ یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ سب باتیں سچ ہیں۔ وہ ان باتوں کو سمجھنا چاہتے تھے لیکن غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ ان کے لئے ناممکن تھا۔ میں تعلیم کے ذریعے ان سب کو لکھنا پڑھنا سکھانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جس طرح دولے شاہ کے چوہوں کی جو انسان ہونے کے باوجود چوہے کہلاتے ہیں، بچپن ہی میں سروں پر ایک لوہے کی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا سر بڑھنے کے عمل سے رک جاتا ہے اور وہ نا سمجھ رہ جاتے ہیں۔ کتنے عجیب لگتے ہیں۔
دولے شاہ کے چوہے جن کے سر تو چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں مگر وہ عام انسانوں جیسے بڑے جسم رکھتے ہیں۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس بستی کے لوگ بھی دولے شاہ کے چوہے ہیں جن کے سروں پر نظر نہ آنے والی ٹوپی پہنا دی گئی ہو۔ ان کے جسم کتنے توانا ہیں لیکن دماغ کتنے چھوٹے!
میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس بستی کے لوگوں کو لوہے کی ٹوپیاں پہنانے والے کس طبقے کے لوگ تھے جنہیں ان سے خوف تھا کہ اگر ان کا سر بڑھ گیا اور انہیں سوچنے سمجھنے کی طاقت مل گئی تو یہ لوگ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے متحد ہو جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ یہاں کا نظام ہی بدل جائے اور پھر صرف اس شخص کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہوگا جو محنت مزدوری کرتا ہو۔ مجھ کو یقین تھا کہ ایسا وقت ضرور آئے گا۔ اب اس بستی کے اکثر نوجوان چھوٹی چھوٹی باتوں کو سوچنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے لیکن اس بستی کے کئی سیدھے سادے بوڑھے ضعیف الاعتقاد لوگ ان نوجوانوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ غریبی امیری، غم و خوشی سب مقدر کا کھیل ہے۔ انسان کو تو بس ہر حال میں خوش رہنا چاہئے۔
تقدیر پر انہیں حد سے زیادہ بھروسہ تھا، وہ اپنی تمام محرومیوں کو تقدیر کا لکھا سمجھتے تھے۔ یہ تمام سوچیں انہیں

اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں ملی تھیں۔ وہ تعویذ گنڈوں سے تقدیر کے بدلنے پر بھی حد سے زیادہ یقین رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص بیمار ہوتا تو وہ ڈاکٹر سے پہلے کسی پیر کے پاس جاتے اور یہ دیکھتے کہ میں بستی کے کئی نوجوانوں کو پڑھا رہا ہوں تو ان کے دل میں میرے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا۔

ان کی نظر میں انسان پڑھ لکھ کر الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ انہوں نے اکثر پڑھے لکھے نوجوانوں کو فکرمند اور پریشان سی حالت میں دیکھا تھا۔ ان کے مقابلے ان پڑھ نوجوان اپنی ذات میں مست بچوں کی طرح ہر حال میں خوش رہتے کیونکہ میں تو پیر و فقیر نہیں تھا۔ یہاں چاچا احمد دین حاضری نہ دیتے تھے۔ جب ان کا اکلوتا بیٹا شہزاد بھی مجھ سے تعلیم حاصل کرنے لگا تو انہیں اپنی جھوٹی انا چکنا چور ہوتی نظر آئی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو سزا کے طور پر گھر سے نکال دیا۔ وہ اب اسے اپنا بیٹا کہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کو اللہ کا ایک فرماں بردار بندہ تصور کر کے جاہلانہ انداز میں اپنے بیٹے کو ناخلف انسان سمجھنے لگے جو خدا کی مصلحت سمجھتے ہوئے اپنی غریبی میں خوش نہیں تھا۔

آج ساری بستی میں رت جگا تھا اور چاچا احمد دین کے گھر تو عید کا سا سماں تھا۔ آج ساری بستی چاچا احمد دین کے گھر موجود تھی۔ پیر صاحب کسی کی پریشانی اور تباہ حال زندگی کی وجہ اس پر کسی گندے سائے کا اثر بتاتے تو کسی پر کالے جادو کا اثر۔ وہ جس پر دعا پڑھ کر پھونک دیتے وہ شخص خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا۔ جن کو تعویذ دے دیتے وہ اس یقین کے ساتھ دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوتا کہ اب اس کا مقدر کھل جائے گا۔ مجمع میں ایک شور سا اٹھا۔ میں اور شہزاد ہجوم کو چیرتے ہوئے دو چار نوجوانوں کے ساتھ سیدھے پیر صاحب تک آ پہنچے۔ چاچا احمد دین کا چہرہ کسی مردے کی طرح سفید ہو گیا۔ انہیں ڈر تھا کہ میں اور شہزاد پیر صاحب کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر دیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مطمئن ہو گئے کیونکہ میں نے اور شہزاد نے بڑے احترام سے پیر صاحب کو سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔ پیر صاحب نے شفقت سے ہم کو جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے بہت مؤدبانہ انداز میں پیر صاحب کو بتایا کہ میں بچپن سے گردش میں ہوں۔ بارہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد چند روز بعد ماں بھی مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی۔ پیر صاحب نے میرا حال سننے کے بعد ایک تعویذ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ تم پر کالا جادو کیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ پیر صاحب جادو کرنے والا کون ہے؟ پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہمیں نام بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر میرا لہجہ باغیانہ ہو گیا اور میں نے تعویذ پیر صاحب کو واپس کرتے ہوئے اعتماد سے کہا کہ پیر صاحب میں تو ابھی طالب علم ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ یہ کالا جادو صرف مجھ پر نہیں کیا گیا بلکہ اس کالے جادو کے اثر میں مجھ جیسے ہزاروں انسان مبتلا ہیں۔ وہ مزدور جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں لیکن ان کے پاس رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں۔ کسان فصلیں تیار کرتے ہیں لیکن ان کے پاس کھانے کو روٹی نہیں۔ ہزاروں مزدور ملوں میں کام کرتے ہیں لیکن ان کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں۔ ان سب پر کالا جادو کیا گیا ہے لیکن میں اب مطمئن ہوں کہ وہ اب سوچنے لگے ہیں اور انہیں اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ ان پر کالا جادو کرنے والے کون لوگ ہیں۔ عنقریب وہ سب متحد ہو کر اس کالے جادو کا توڑ کرنے والے ہیں۔

میرے خاموش ہوتے ہی محفل میں ایک سناٹا چھا گیا جیسے سب لوگ کچھ سوچ رہے ہوں۔ میں چاچا احمد دین کے گھر سے نکلا تو نئی صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

***

مکافات عمل

انہوں نے والدین کی خدمت کیا کرنی تھی، ان کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ان کے والدین کی قبریں کہاں ہیں۔

خسارے کے سودے

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروقی

چودھری آصف ڈسکہ کا ایک معروف وکیل تھا لیکن وکالت سے زیادہ اس کی شہرت ایک قبضہ گروپ کی تھی۔ وہ اس جستجو میں رہتا تھا کہ کون سے رہائشی یا کمرشل پلاٹ کا مالک خاندانی یا مالی اعتبار سے کمزور ہے یا اُس کی ملکیت کے معاملے میں کہیں جھول ہے۔ جونہی اُسے اس کا سراغ ملتا، وہ محکمہ مال کے متعلقہ اہلکاروں سے مل کر اپنے نام کے کاغذات تیار کراتا اور پھر جبراً اس پر قبضہ کر لیتا۔

محمد خاں چیمہ موترہ اڈہ (گوندلی سیالکوٹ روڈ) سے تعلق رکھتے تھے۔ نیم خواندہ آدمی تھے لیکن دین حق کے لئے گہری محبت اور قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ شاید جماعت اسلامی کے رکن بھی تھے، اُن کے اخلاص اور دین کے ساتھ ان کی گرمجوشی کا میں خود عینی شاہد ہوں۔ وہ ایک فقیر منش آدمی تھے انہیں نہ اپنے لباس کی پروا تھی، نہ جوتے، نہ خوراک کی...... بس ہر وقت ایک ہی فکر تھی کہ وہ مولانا مودودی کی نئی اور پرانی کتابیں خریدتے اور ڈسکہ کے اساتذہ، طلبہ اور وکلاء میں تقسیم کرتے رہتے۔

محمد خاں چیمہ کی موترہ اڈہ پر مین سیالکوٹ روڈ کے کنارے پانچ ایکڑ زمین تھی۔ چار کنال میں تو انہوں نے ایک دینی مدرسہ بنوا دیا اور باقی پر چودھری آصف کی نظریں جم گئیں۔ محمد خاں چیمہ تبلیغی مہمات کے سلسلے میں ڈسکہ کچہری میں بھی جاتے رہتے اور وکلاء سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ چودھری آصف کو جب پتہ چلا کہ چیمہ کی ملکیت میں ساڑھے چار ایکڑ بے حد قیمتی

کمرشل زمین ہے تو اس نے اس پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ جب بھی محمد خاں چیمہ کچہری آتے تو آصف ان کی خوب پذیرائی کرتا، خوب تواضع کرتا اور جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی تعریفوں کے پل باندھ دیتا۔ اس طرح اس نے محمد خاں چیمہ کے دل میں گھر کر لیا اور رفتہ رفتہ انہیں قائل کر لیا کہ وہ چار ایکڑ زمین چودھری آصف کو دے دیں اور اس کے بدلے میں وہ انہیں ایک قریبی گاؤں میں بیس ایکڑ زرعی زمین دے دے گا۔

مخلص آدمی سادہ دل تو ہوتا ہی ہے، چنانچہ محمد خاں چیمہ اپنی سادہ لوحی اور بے خبری کی وجہ سے اس کی باتوں میں آ گئے اور انہوں نے زمین کا تبادلہ کر لیا۔ یہ زمین بنجر تھی اور ایک دور افتادہ گاؤں میں دلدلی علاقے کے قریب واقع تھی۔ چودھری آصف نے ان کے ساتھ صریحاً دھوکا دہی کی واردات کر ڈالی تھی۔

چودھری آصف نے موتر اڈہ والی بے حد قیمتی زمین قانونی طور پر قبضہ میں لے کر جلدی ہی سیالکوٹ کے ایک صنعت کار کے ہاتھ چار کروڑ میں بیچ دی۔ رجسٹری ہو گئی، آصف نے قیمت وصول کر لی لیکن وہ صنعت کار سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ جب چند ہی روز کے بعد چودھری آصف کے بیٹے نے زمین کی خریداری کے خلاف حق شفع کا مقدمہ دائر کر دیا آصف کا بیٹا بھی وکیل تھا اور اپنے باپ کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔

متعلقہ صنعت کار چودھری آصف سے ملا اور شکایت کی کہ جب کہیں بھی کوئی شک کا پہلو موجود نہ تھا اور ہر چیز شفاف تھی، تو اس کے بیٹے نے شفع کا مقدمہ کیوں دائر کر دیا ہے۔ آصف نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”دراصل میرا بیٹا پجارو مانگتا ہے۔ اُسے پجارو لے کر دے دیجیے، وہ مقدمہ واپس لے لے گا“۔ چنانچہ مذکورہ صنعت کار کو مجبور ہو کر چالیس لاکھ روپے خرچ کر کے ایک نئے ماڈل کی زیرو میٹر پجارو آصف کے حوالے کرنی پڑی۔ اس کھلی دھاندلی پر دونوں باپ بیٹا خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

غیر معمولی دولت کے بے پناہ نشے میں سرشار ہو کر چودھری آصف نے سمبڑیال روڈ ڈسکہ پر دو کنال میں شاندار کوٹھی تعمیر کرائی اور اُس میں منتقل ہو گیا۔ اس کی کوٹھی کے عقب میں ایک غریب بیوہ کا پانچ مرلے کا پلاٹ تھا۔ آصف نے سرکاری اہلکاروں سے مل کر اُس کی ملکیت کے کاغذات تیار کرائے اور بڑی ہی آسانی سے اُس پر قبضہ کر لیا اور اُس پر چار دیواری کر کے وہاں موبائل فونز کے دو ٹاور تعمیر کرا دیئے جن کا کرایہ اُسے چالیس ہزار روپے ماہانہ وصول ہونے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ جب چودھری آصف نے غریب بیوہ عورت کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کیا، تو اس عورت نے بہت واویلا کیا اور اپنا دوپٹہ پھیلا کر بددعا دی کہ اللہ کرے اس پلاٹ میں تمہارے بیٹے کی قبر بنے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ آصف نے جی ٹی روڈ پر کاموں کے سے ذرا آگے ایک سی این جی سٹیشن کے قریب ایک پلاٹ کا سودا کیا اور وہاں سی این جی سٹیشن بنانے کا پروگرام بنا لیا۔ پڑوس کے سی این جی سٹیشن کے مالکان نے اس کا برا منایا اور آصف کو وارننگ دی کہ وہاں سی این جی سٹیشن نہ بنائے، ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا لیکن آصف نے اُن کی دھمکی کو چنداں اہمیت نہ دی اور اپنے پروگرام پر عمل کرتا رہا...... تا آنکہ تقریباً ایک سال پہلے اُس کا اکلوتا بیٹا اپنی پجارو میں سمبڑیال جا رہا تھا جب کسی دشمن نے اس پر نہر اپر چناب کے قریب اندھا دھند فائرنگ کر دی اور پجارو کے اندر ہی اُسے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور مظلوم بیوہ عورت کی بددعا انتہائی دردناک صورت میں اس طرح پوری ہوئی کہ آصف کی بیوی کے اصرار پر ان کے اکلوتے بیٹے کی قبر اسی پلاٹ میں ٹاوروں کے نیچے تیار ہوئی۔ اُس کا کہنا تھا میرا ایک ہی بیٹا تھا اُس

کی قبر میری نظروں کے سامنے بنی چاہیے۔

چودھری آصف اس قدر شقی القلب اور بے حس تھا کہ اکلوتے بیٹے کی انتہائی ہولناک موت کے بعد بھی اُس نے صورت حال سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ وہ سوگ کے دنوں میں بھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ چہلیں کرتا رہتا اور لطیفے سنتا اور سناتا رہتا تھا۔ نرمی، گداز اور خوف خدا گویا اُس کی سرشت ہی میں نہ تھے۔ اکتوبر 2009ء کی بات ہے۔ وہ زمین کے مقدمے ہی کے سلسلے میں حافظ آباد گیا تھا۔ اس نے اپنی پجارو میں سفر کیا تھا اور دو گارڈ اُس کے ساتھ تھے۔ وہ حافظ آباد کے بار روم میں براجمان تھا۔ اس کے دونوں گارڈ باہر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ بے فکری سے دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ آصف کے پاس گیا اور اس کی کنپٹی پر گولی مار کر چشم زدن میں باہر بھاگ گیا۔ گارڈ اندر آئے تو وہ خون میں لت پت تڑپ رہا تھا فوراً ہی اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مزید خوفزدہ کر دینے والی بات یہ ہے کہ آصف کی بیوی کی خواہش پر اُس کی قبر بھی بیوہ عورت والے پلاٹ میں بیٹے کے پہلو میں بنائی گئی۔ مظلوم عورت نے ایک قبر کے لئے بددعا کی تھی، اللہ کے غضب نے باپ کو بھی وہیں گاڑ دیا اور ایک کی بجائے دو قبریں بنا دیں۔ قرآن پاک کا فیصلہ کس قدر اٹل ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْد۔ بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے اور چودھری آصف کا انجام اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

☆☆☆

کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے میرے گھر کے قریب اجمل صدیقی اپنی اہلیہ کے ساتھ آ کر مقیم ہوئے۔ موصوف لاہور کے نواح میں ایک ہائی سکول کے پرنسپل تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ایک دینی جماعت کے تعلیمی شعبے کے انچارج بن کر یہاں آئے تھے۔ صدیقی صاحب بہت حلیم الطبع اور نمازوں کے سختی سے پابند تھے، اس لئے مسجد میں آتے جاتے ہمیں اکثر ایک دوسرے کی رفاقت حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ میں اُن کے ضروری احوال سے باخبر ہوتا رہا۔

پتہ چلا کہ صدیقی صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہے۔ ایک ہی بچی ہے اور وہ گجرات کے قریب ایک قصبے میں بیاہی ہوئی ہے چنانچہ آج کل موصوف اپنی اہلیہ کے ساتھ تنہا زندگی گزار رہے ہیں جبکہ اہلیہ گزشتہ آٹھ سال سے مفلوج حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اس کی حالت غیر معمولی طور پر دگرگوں ہے۔ صدیقی صاحب اپنی بیگم کی بیماریوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اکثر رو پڑتے تھے۔ فرمایا کرتے۔ اس بے چاری کی ٹانگیں جڑ گئی ہیں۔ لمبے عرصے سے چت لیٹے لیٹے اُس کی کمر زخموں سے بھر گئی ہے۔ نہ وہ کروٹ بدل سکتی ہے نہ اٹھ کر بیٹھ سکتی ہے، نہ خود کچھ کھا پی سکتی ہے۔ نالی ہی سے سیال صورت میں خوراک دینی ہوتی ہے۔ وہ گلوگیر لہجے میں نمناک آنکھوں کے ساتھ بتاتے۔

"ڈاکٹر صاحب! کسی ہسپتال میں ایک مریض کی چار افراد جو خدمت انجام دیتے ہیں، وہ اس بڑھاپے میں مجھ اکیلے کو کرنی پڑتی ہے۔ یعنی زخموں کی ڈریسنگ کرتا ہوں، نالی کے ذریعے خوراک دیتا ہوں، بول و براز ٹھکانے لگاتا ہوں اور لباس اور چادر وغیرہ تبدیل کرتا ہوں اور یہ سب کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔ ایک جز وقتی خادمہ رکھی ہوئی ہے، وہ کھانا پکا دیتی ہے، گھر کی صفائی کر دیتی ہے اور برتن دھو دیتی ہے۔ باقی سارے امور مجھے ہی انجام دینے پڑتے ہیں"۔

صدیقی صاحب چونکہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اور اس حوالے سے وہ میرے پڑوسی تھے، اس

لئے میں وقتاً فوقتاً ان کے گھر پر حاضری دیتا رہتا۔ ان کی مزاج پرسی کرتا، دلجوئی کرنے کی کوشش کرتا اور مختلف حوالوں سے تعاون کی پیش کش کرتا۔ اس سے موصوف مجھ سے بہت خوش تھے اور میرے ضمیر کو بھی اطمینان اور مسرت حاصل ہوتی تھی۔

صدیقی صاحب کو جب پتہ چلا کہ مجھے ہومیو پیتھی سے دلچسپی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے دیکھیں میں آپ کا پڑوسی ہوں اور ستم رسیدہ ہوں، اس لئے میرے ساتھ مزید تعاون کریں۔ میں بوڑھا ہوں اور کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ میں ایلو پیتھک دواؤں سے تنگ آ گیا ہوں، میری بیگم کا تو آپ کے پاس کوئی علاج نہیں لیکن میرے علاج میں آپ بہت مفید ثابت ہو سکتے تھے۔

چنانچہ ان کی خواہش پر میں انہیں مختلف وقتوں میں دوائیں فراہم کر دیا کرتا تھا جس سے وہ بہت مطمئن تھے اور ہومیو پیتھی پر ان کا اعتماد اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی بیگم کی تمام علامات لکھ کر مجھے دے دیں۔ کہنے لگے آپ سٹڈی تو کریں عین ممکن ہے کوئی معجزہ ہو جائے اور میری بیگم صحت یاب ہو جائے۔ میرے پاس علاوہ دیگر کتابوں کے ڈاکٹر کاشی رام کا تین جلدوں پر مشتمل مفصل میٹریا میڈیکا بھی موجود ہے جس میں ہر مرض کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی درج ہیں۔ چنانچہ جب میں نے علامتوں کے مطابق اصل دوا کا کھوج لگایا تو وہ دیلر یانہ دریافت ہوئی اور میں اُس کی تفصیلات پڑھ کر کانپ اٹھا۔ دوا کیا ہے سزا اور عقوبت کی مختلف صورتوں کا مجموعہ ہے، چند متعلقہ اشارات ملاحظہ فرمائیں۔

کھانے سے قبل ذائقے میں تعفن، قوائے عقلیہ کند ہو جائیں، مریض خیال کرے کہ اس کے نزدیک جانور لیٹے ہوئے ہیں۔ (گویا وہ ہر وقت خوف اور اذیت میں مبتلا ہے) سوتے وقت حلق میں دم گھٹنے کا احساس جس کی وجہ سے مریض ہڑبڑا کر جاگ جائے، بائیں کندھے سے انگلیوں تک بے حد کھینچنے والا درد، بازوؤں میں اینٹھن والے اور پھاڑنے والے درد۔

ہومیو پیتھی کا علم اور فن طبی دنیا کا ایک عجوبہ ہے جس کا کسی بھی دوسرے شعبہ طب میں کوئی جواب نہیں۔ ایک ماہر فن ہومیو پیتھ چند علامتوں سے مریض کے نہاں خانہ دل میں جھانک سکتا ہے اور اس کے باطن کے بہت اندر اتر کر اس کے مخفی عزائم اور خصائص سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا علامات نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کر دی کہ صدیقی صاحب کی بیگم کا جسم ہی خدا کی گرفت میں نہیں ہے، بلکہ اس کی روح اور احساسات کو بھی شدید قسم کی اذیت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

میں صدیقی صاحب کے سارے احوال کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا اور اس کا ذکر میں نے اپنے بڑے بیٹے حافظ بلال فاروق سے بھی کیا کہ صدیقی صاحب اور ان کی بیگم سے کوئی ایسی بڑی تقصیر ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو غیر معمولی انداز میں ناراض کر دیا ہے ورنہ وہ تو بہت ہی رحیم و کریم ہے اور بغیر کسی ٹھوس وجہ کے اپنے بندوں کو لامتناہی عرصے کے لئے معصیت اور اذیت میں مبتلا نہیں کرتا۔

اور پھر اللہ نے اپنے فضل سے سارے معاملے کو میرے سامنے اور منکشف کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز مجھے اپنے عزیز شاگرد اور دوست اشفاق بھٹی کے ساتھ شیخوپورہ روڈ پر ایک تعزیت کے لئے جانا تھا۔ وہ پروگرام کے مطابق گاڑی لے کر آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے ماموں منظور حسین بھٹی بھی تھے۔ تعارف کے بعد انہوں نے بتایا کہ میں یہاں صدیقی صاحب کی بیگم کی مزاج پرسی کے لئے آیا تھا وہ بے چاری ایک عرصے سے بیمار

ہے اور صدیقی صاحب سخت آزمائش میں مبتلا ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ صدیقی صاحب کو کیسے جانتے ہیں؟ تو بتایا کہ صدیقی صاحب جس سکول میں پرنسپل تھے وہاں میں نے دس بارہ سال ملازمت کی ہے اور اس طرح ان سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔

تب میں نے منظور حسین بھٹی صاحب سے درخواست کی کہ براہ کرم انصاف، غیر جانبداری اور دیانت کے ساتھ بتائیں کہ کیا صدیقی صاحب نے اپنے والدین کی خدمت کی تھی اور ان کی بیگم کا اپنے سسرال کے ساتھ کیسا طرز عمل تھا؟

اس پر منظور بھٹی صاحب نے برجستہ کہا۔ انہوں نے خدمت کیا کرنی تھی انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میرے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساس سے چونک کر کہا۔ حیرت اس بات پر کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بظاہر دیندار بیٹے کو والدین کی قبروں کا بھی پتہ نہیں اور مسرت اس انکشاف پر کہ میرے نقطہ نظر کو ایک ٹھوس دلیل ملنے کا وقت آ گیا تھا۔

"مطلب یہ ہے جناب!" منظور حسین بھٹی صاحب نے وضاحت کی کہ صدیقی صاحب اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ والدین گاؤں میں رہتے تھے اور اوسط درجے کا خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔ انہوں نے صدیقی صاحب کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور جب انہیں سرکاری نوکری مل گئی تو لاہور کے ایک امیر خاندان نے انہیں اچک لیا۔ لڑکی کا ایک بھائی فوج میں اور دوسرا ریلوے میں بڑا افسر تھا۔ بس صدیقی صاحب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہوں نے شادی کے بعد والدین اور خاندان سے ناطہ مکمل طور پر توڑ لیا اور سنگدلی بلکہ سفاکی کے اس مظاہرے میں صدیقی صاحب کی بیگم نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس نے صاف اعلان کر دیا کہ والدین سے ملنا ہے اور خاندان سے کوئی تعلق استوار رکھنا ہے تو میں طلاق لے لوں گی اور صدیقی صاحب اس کی دھمکی کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ وہ بیوی کے بندۂ بے دام غلام بن گئے اور انہوں نے چپ کر والدین سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔

تب خاندان میں اور گاؤں میں لوگ صدیقی صاحب سے اس قدر بدظن اور متنفر ہو گئے کہ جب ان کے والدین یکے بعد دیگرے وفات پا گئے تو کسی نے انہیں اطلاع تک دینا گوارا نہ کیا اور انہیں ماں باپ کے جنازوں میں شامل ہونے کی توفیق ہی حاصل نہ ہوئی"۔

منظور حسین بھٹی کے اس انکشاف سے واقعات کی ساری کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ صدیقی صاحب کو اللہ نے ایک ہی بیٹا کیوں عطا کیا، وہ والدین کو یک وتنہا چھوڑ کر امریکہ کیوں چلا گیا اور گزشتہ کئی سالوں سے اس نے پلٹ کر ان کی خبر گیری کیوں نہیں کی۔ پھر آٹھ دس برسوں سے بیگم صدیقی جسمانی اور ذہنی اعتبار سے شدید ترین عذاب میں کیوں مبتلا ہے اور صدیقی صاحب اس بڑھاپے میں بدترین حالات سے کیوں دوچار ہیں اور زندگی ان کے لئے کیوں سراپا اذیت بن گئی ہے۔

نبی اکرمؐ نے جہاں یہ بددعا فرمائی کہ جو شخص والدین کی بڑھاپے میں خدمت نہیں کرتا وہ ذلیل وخوار ہو جائے، وہ تباہ و برباد ہو جائے۔ وہاں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہلاک ہو گیا وہ شخص جو بیوی کا غلام بن گیا۔ صدیقی صاحب پر یہ دونوں وعیدیں بیک وقت چسپاں ہو گئیں اور دونوں نے مل کر ان کا کچومر نکال دیا۔

(مصنف کی کتاب "مکافات عمل" سے ماخوذ)

◆○◆

عمرِ رفتہ

ایک سپاہی کی یادداشتیں

حبیب اشرف صبوحی

گزشتہ دنوں تقی محمد خاں خورجوی کی کتاب "عمر رفتہ" پڑھنے کا موقع ملا یہ ایک سپاہی کی سرگزشت ہے جو 1880ء میں خورجہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ 1898ء میں ہیڈ کانسٹیبل کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوئے اور 1933ء میں سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر ریٹائر ہوئے۔ 20 نومبر 1969ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے بیٹے سمیع اللہ خاں نے جو ڈی آئی جی (سندھ) ہو کر ریٹائر ہوئے، اپنی آپ بیتی "عمر پیوستہ" لکھی لیکن "عمر رفتہ" بہت دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب کے دلچسپ اور ناقابل یقین واقعات قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ آج سے سو سال پہلے کا معاشرہ کیسا تھا؟ طرز زندگی اور طرز معاشرت کا اندازہ ان واقعات سے لگ سکے گا۔

پہلے تانگوں کی بجائے دو پہیہ اور شکرم دو سواریاں تھیں۔ دو پہیہ ایک صندوق نما سواری تھی جس میں دو پہیے لگے ہوئے تھے اور ایک گھوڑا کھینچتا تھا۔ شکرم میں چار پہیے ہوتے تھے اور دو گھوڑے کھینچتے تھے۔

ارزانی کا یہ عالم تھا کہ راج کی مزدوری چار چھ آنے اور مزدور کی چھ پیسے۔ غلہ ایک روپے من اور گھی ایک روپیہ کا دو ڈھائی سیر آتا تھا۔ کھانا پکانے والے کی تنخواہ ایک دو روپیہ ماہوار اور کھانا ہوتی تھی۔ اسی لحاظ سے کپڑا اور دیگر اجناس ارزاں تھیں۔ بوجہ ارزانی پیسے کی قیمت زیادہ تھی۔ اس لئے پیسوں کو کوڑیوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی ادھی، دمڑی، چھدام، گنڈا، دھیلا، پون پیسہ، اس کے بعد پیسہ ہوتا تھا۔ عام طور پر لباس میں سادگی تھی۔ کرتہ، انگرکھا، پاجامہ اور صافہ، عام شریفوں کا لباس تھا۔

نرمی کے چمڑے کی سلیم شاہی جوتی یا کچے چمڑے کی ادھوڑی چوڑے پنجے کی جوتی کی قیمت ایک یا ڈیڑھ روپے تھی جو سال بھر کام دیتی تھی۔

تہذیب اس زمانے میں ماں باپ سکھلاتے تھے اور اخلاق بزرگوں کی صحبت اور مکتبوں میں حاصل ہوتا تھا اور اسی قسم کی اخلاقی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ مستورات کی تعلیم صرف قرآن پاک تک ہی محدود تھی اور شرعی پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی۔ چھوٹے بڑوں کا ادب کرتے اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ مستورات کا یہ خیال تھا کہ ہم غیر محرموں کو منہ دکھلا کر خدا کو کیا منہ دکھائیں گی۔

خودداری کو پٹھان جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ عبداللہ خاں نواب بھنوارے والے ہاتھی پر سوار ہو کر خورجہ آئے۔ اُن کی زمین کا ایک کاشتکار پٹھان اپنے کھیت کے مچان پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا اور کھیت کی رکھوالی کر رہا تھا۔ عبداللہ خان اُس کے قریب سے گزرے لیکن وہ تعظیماً کھڑا ہوا اور نہ سلام کیا خان کو یہ بات ناگوار گزری اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ رات کو جب یہ گھر آ کے سو جائے تو اس کی کھیت کی چری کاٹ کر جس کو اس پر بڑا ناز ہے، اس کے مکان کے دروازے کو پاٹ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب صبح کو وہ کاشتکار اٹھا تو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ اسی روز وہ خان صاحب اپنے گاؤں کو واپس جانے والے تھے اور راستہ انہی کی بنوائی ہوئی عالی شان مسجد کے نیچے سے گزرتا تھا، کاشتکار اپنا حقہ بھر کر سڑک کے رخ مسجد کی چھت پر جا بیٹھا۔ جب خان کی سواری گزری تو بلند آواز سے کہا کہ "دیکھ! اے عبداللہ خان! ہم اب بھی خدا کے گھر میں تجھ سے اونچے ہی ہیں اور قیامت میں بھی اور زیادہ سربلند ہوں گے"۔ یہ سن کر عبداللہ خاں خدا کے خوف سے کانپ گئے اور اس کو نقصان کا دُگنا معاوضہ دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔

◆◆◆

حضرت داغ دہلوی کی خورجہ کے ایک صاحب مولوی عبدالرحمٰن سے ملاقات تھی حیدرآباد جا رہے تھے۔ دو چار روز خورجہ میں بھی قیام کیا۔ دو پٹھانوں نے صلاح کی داغ کے ساتھ کچھ مذاق کیا جائے۔ یہ دونوں شاعر بھی تھے۔ داغ نہایت موٹے اور سیاہ فام تھے۔ اُن کے پاس پہنچے۔ ایک نے ان سے یہ کہا یہ میرے ساتھی شاعر ہیں لیکن شرمیلے ہیں۔ خود نہیں پڑھتے، ان کی غزلیں میں مشاعروں میں پڑھا کرتا ہوں۔ انہوں نے تازہ غزل کہی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ تخلص اپنا ولی کرتے ہیں۔ ردیف، قافیہ وہی ہے جو آپ کی شہرہ آفاق غزل کا ہے جس کا مطلع یہ ہے

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

داغ نے کہا، ضرور سنایئے۔ کیونکہ اس بحر، ردیف اور قافیے میں کسی نے غزل نہیں کہی۔ انہوں نے ولی کی طرف سے وہ غزل سنائی جو مجھے یاد نہیں ہے البتہ اس کا مقطع یاد ہے۔

ولی خورجہ میں آنا داغ کا ایسا تعجب ہے
کہ بھینسا پھنس گیا ہو جس طرح مکڑی کے جالے میں

داغ نے غزل کے اور بعض اشعار سن کر تو واہ دی لیکن مقطع سن کر ہنسے اور خاموش ہو گئے۔

◆◆◆

بزرگوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ ایک مرتبہ میرے چچا عاشق محمد خاں نے جب کہ اُن کی عمر بیس سال کی تھی۔ اپنے ایک دوست مرتضیٰ خاں عرف گینڈے والے کے باہمی لڑائی کے سلسلے میں چاقو مارا جو کمر پر لگا اور گہرا زخم آیا۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ ہر شخص چاقو کے دستے میں چھلا ڈال کر اپنے

کر بند میں باندھ لیتا تھا۔ مرتضیٰ خاں اسی طرح خون میں نہائے ہوئے عاشق محمد کے والد عمر خان کے پاس گئے اور شکایت کی۔ انہوں نے نہایت شفقت سے اُن کو اپنے پاس بٹھایا۔ جراح کو بلا کر مرہم پٹی کرائی اور اپنے لڑکے کو طلب کیا۔ انہوں نے آن کر اپنی حماقت کا اعتراف کیا لیکن دوست سے معافی مانگنے پر راضی نہ ہوئے۔ تب اُن کے والد نے اپنے لڑکے سے وہ چاقو لے کر جس سے حملہ کیا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنے لڑکے کی پیٹھ پر سے کرتہ ہٹایا اور مرتضیٰ خان کو وہ چاقو دے کر کہا کہ اب تم اس چاقو سے اس کو زخمی کر دو۔ مرتضیٰ خان نے وہ چاقو لے لیا۔ اس کو کھولا اور مارنے کے واسطے ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ روک کر کچھ سوچا اور کہا کہ چچا میں اپنے دوست کو مجبور بنا کر اس پر حملہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ جب مجھے موقع ملے گا میں بھی بدلہ لے لوں گا۔ یہ کہہ کر چاقو زمین پر ڈال دیا اور دونوں بغلگیر ہو گئے۔

◆◆◆

خورجہ ہمیشہ سے مردم خیز رہا ہے۔ پہلوان، شاعر، عالم، بزرگ، سب ہی اعلیٰ قسم کے تھے لیکن سوائے حضرت مولانا نصر اللہ خاں صاحب کے جنہوں نے علم طب، فقہ اور تصوف پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ نہ کسی شاعر کا کوئی دیوان شائع ہوا نہ کسی نے ان اہل کمال کے حالات لکھے۔ نہ کسی نے اپنی تصنیف کی کوئی کتاب شائع کرائی۔ حضرت مولانا نصر اللہ خاں صاحب نہ صرف ایک عالم باعمل بزرگ ہی تھے بلکہ ریاست حیدرآباد دکن میں جج ہائی کورٹ تھے اور پنشن یعنی منصب نسلاً بعد نسل ان کو ملتی رہی۔ صوفی منش، عبادت گزار، خدا پرست اور عالم باعمل بزرگ تھے۔ خورجہ میں ان کا اپنا مدرسہ بھی تھا جس کو تقریباً سو سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ اس مدرسے میں علم دینیات حاصل کرنے کے واسطے اپنے بچپن میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی بھی آئے تھے اور تقریباً سال دو سال حضرت کے مکان پر جہاں باہر سے آئے ہوئے طالب علم رہتے تھے، قیام کیا تھا۔ میرے والد بھی اسی مدرسے میں ان کے ہم سبق تھے۔ نذیر احمد صاحب کی کم عمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں مذاق تھا، اکثر بچوں کو چھیڑا کرتے تھے اور بچے حضرت سے شکایت کیا کرتیں حضرت ہنس کر چپ ہو جاتے۔

ایک روز ایک بچہ اپنی تختی لکھ کر حضرت کو دکھلانے کے واسطے لے جا رہا تھا نذیر احمد نے وہ تختی اس بچے سے لے لی اور قلم دوات منگا کر کہا۔ دیکھو اس طرح خوش خط لکھتے ہیں اور یہ کہہ کر اس پر لکھ دیا ”نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر“ یہ لڑکا روتا ہوا حضرت کے پاس گیا اور شکایت کی۔ حضرت نے مسکرا کر فرمایا اپنا قلم اور دوات لا۔ جب وہ لے آیا تو حضرت نے اس عبارت کے نیچے لکھ دیا۔ ”اگر تیری بھی خواہش ہے تو ڈپٹی کلکٹر ہو گیا“۔

والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب مولوی نذیر احمد صاحب نے حضرت کے قلم کی یہ تحریر دیکھی تو لڑکے سے قیمتاً وہ تختی لینا چاہی تاکہ بطور یادگار اس کو اپنے پاس رکھیں لیکن وہ لڑکا کچھ ایسا ضدی تھا کہ کسی قیمت پر تختی دینے کے واسطے راضی نہ ہوا۔ خدا کی قدرت کہ اس واقعے کے بہت عرصے کے بعد نذیر احمد صاحب بالآخر ڈپٹی کلکٹری ہوئے۔

◆◆◆

رشتے ناطے

رشتوں کو مضبوط رکھنے کے دو سنہری اصول۔ جب آپ غلط ہوں تو اپنی غلطی تسلیم کریں اور جب آپ صحیح ہوں تو صرف خاموش رہیں۔ (نبیلہ نازش راؤ)

سلسلہ وار آپ بیتی

آکاس بیل

نہ جانے کیوں اب میرا دل بھی اس سے ملنے اور بات کرنے کو چاہنے لگا تھا۔
میں غیر ارادی طور پر اس کی طرف مائل ہورہا تھا اور یہ سب پریشان کن تھا۔

قسط: 7 ☆ ــــــــــ محمد رضوان قیوم

اُدھر نوتن کی دماغی حالت دن بدن بڑی سرعت انگیزی سے تنزلی کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ اب پاگل پن والی حرکتوں کے ساتھ نیم غنودگی کے عالم میں برملا طور پر باقاعدہ میرا نام لے کر کہتی تھی کہ اگر مجھے ستارہ نہ ملا تو میں زہر کھالوں گی۔ وہ میرا پتی ہے اور میں اس کی پتنی ہوں۔ نوتن کی اس تکرار کی وجہ سے لالہ اور ہمارے پورے خاندان کے ہر فرد کے دلوں میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ میرے اور نوتن کے درمیان اندرونِ خانہ کوئی عشق کا معاملہ چل رہا ہے۔

ایک دن لالہ جی اور سنتو تائی ہمارے گھر آئے انہوں نے مجھے ابا اور اماں کی موجودگی میں بلایا۔ میں وہاں چلا گیا۔

"بھگوان کے واسطے میرے دل سے یہ شک نکال دو کہ تمہارا نوتن کے ساتھ کوئی عشق محبت والا معاملہ ہے؟" تائی سنتو نے کہا۔

ابا نے اپنے پاؤں سے جوتا اتارا اور میری کمر میں مارتے ہوئے کہا۔ "اگر تُو نے تل برابر بھی دروغ گوئی کی تو یاد رکھ میں تجھے جان سے مار دوں گا"۔

اماں جو مجھے مار پڑتے ایک طرف سہمی ڈری کھڑی تھی انہوں نے یکدم ہمارے درمیان میں پڑتے ہوئے سب سے پہلے جوتا پکڑے ابا کے ہاتھ کو پکڑا اور کہا۔ "میں اس کی ساری حقیقت بتاتی ہوں"۔

"کیسی حقیقت؟" ابا نے انتہائی قہر آلود نگاہوں سے اماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ بات منہ سے پھوٹ؟"

اماں نے روتے ہوئے دیپا کی جانب سے میرے اور نوتن کے متعلق جو بہتان لگایا تھا اور میری صفائی کی تمام روئیداد چند سانسوں میں سنادی۔

"ہائے رام! میں یہ کیا سن رہا ہوں"۔ لالہ جی نے [illegible] پکڑ لیا

"ابا! یہ جو کچھ آپ سن رہے ہیں میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس میں ایک فیصد بھی سچائی نہیں ہے"۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بتا حقیقت کیا ہے؟" انہوں نے اپنے جوتے سے مجھے مزید زدوکوب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تُو نے نوتن کو اپنی محبت کے سبز باغ دکھا کر ورغلایا تو نہیں ہے۔ کمبخت کچھ تو منہ سے بک"۔

"مجھے اللہ معاف کرے"۔ میں نے وہاں موجود تمام بزرگوں کے سامنے گستاخی کے انداز میں چلاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا"۔

"تیری اتنی جرأت کہ تُو ہم بزرگوں کے سامنے گستاخی سے غرائے"۔ ابا نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ "کیوں بھئی تُو اپنی صفائی میں کیوں لب کشائی نہیں کرے گا"۔

"میں اس لئے آپ لوگوں کے سامنے اپنی صفائی کے لئے کچھ نہیں بولوں گا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ نے میری کسی بات کا یقین نہیں کرنا ہے"۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"اچھا تُو گنگا نہایا ہوا پاوتر ہے"۔ تائی سنتو نے کہا۔

"اور جو دیپا نے تجھے اور نوتن کو ایسی حالت میں دیکھا تھا، وہ کیا تھا؟"

"وہ......وہ......" میری زبان لڑکھڑا گئی۔ "وہ میں نے نوتن کو کہا تھا کہ میں تجھے ویری کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ وہ خود ہی اپنے طور پر مجھ سے اظہارِ محبت کر رہی تھی جس کی مجھے قطعی توقع نہیں تھی اور اتفاق سے جس وقت نوتن نے میرے کاندھے پر سر رکھا ٹھیک اسی لمحے دیپا ہماری ڈیوڑھی میں آ گئی تھی۔ میں خوامخواہ ان کی نظروں میں گر گیا"۔

"عظیم! مجھے تیرے لونڈے پر خشخاش برابر بھی وشواس نہیں ہے"۔ لالہ جی نے کہا۔ "یہ بالکل جھوٹ بک

رہا ہے"۔ ابا نے لالہ جی کی اس بات پر مجھے مزید جوتے سے مارنا شروع کر دیا۔

"ستار کے ابا! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا"۔ اماں نے ان کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تم خواہ مخواہ اپنے بچے کو دھنے جا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ بے قصور ہو۔ سنتے دیکھتے نہیں ہو سنتو کا پورا خاندان پاگل پنے اور جادوئی اثرات کا شکار ہے۔ میرے خیال میں نوتن اپنے خاندان میں اوروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی مخبوط الحواس ہے"۔

سنتو تائی نے اماں کے منہ سے یہ سنا تو فوراً چیخ پکار کر بولیں۔

"بھگوان کرے تمہارا پورا پریوار اس کٹھن عذاب سے گزرے جس سے ہم گزر رہے ہیں"۔

"سنتو! اپنے دماغ کو شانتی دے"۔ لالہ جی نے اپنی بیوی سے کہا۔ "عظیم کے خاندان کو بددعائیں نہ دے بھگوان کسی دشمن کو ان برے حالات سے نہ گزارے جن سے آج کل ہم لوگ گزر رہے ہیں"۔

اماں اور سنتو تائی آپس میں الجھنے اور دشنام طرازی کرنے لگیں تو لالہ جی نے غصہ میں ایک زوردار تھپڑ سنتو تائی کے گال پر جڑا ادھر ابا نے بھی اماں کو دھتکار کر کمرے میں دھکیل دیا۔

"ہاسو! آج تو نے میرا مان توڑ دیا ہے"۔ لالہ جی نے روتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تو تو میرے کلدیپ بیٹے کی طرح تھا۔ نوتن تیری بہن کی طرح تھی۔ یہ تو نے کیا ظلم کر دیا۔ کاش تو میرے بچپن کے ہمجولی کا پتر نہ ہوتا"۔

"یہی بات ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں تیرے ساتھ کیا کروں"۔ ابا نے چلاتے ہوئے کہا اور پھر لالہ جی سے کہا۔

"لالہ تجھے میری طرف سے اجازت ہے بے شک اس ناخلف کو گولی مار کر اسے فارغ کر دے......" پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "دور ہو جا میری نظروں سے"۔

میں سر جھکائے شکستہ دلی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

سنتو تائی اماں پر چیخ چلا اور ہمارے پورے خاندان کو بددعائیں دینے کے بعد اپنے گھر چلی گئی۔ جبکہ لالہ جی ابا کے پاس بیٹھے رہے۔ میں نہ تو کلدیپ سے ملنے گیا اور نہ ہی وہ مجھ سے ملنے آیا۔ لالہ جی نے ابا سے مکمل تعلقات خراب نہ کئے تھے۔ اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ ابا اسے حویلی کے مقدمات اور اس کے دیگر معاملات میں بڑے مخلصانہ مشورہ دینے کے ساتھ اس کے ساتھ ایسی جگہ چلے جاتے تھے جہاں وہ اکیلا جانے سے کتراتا تھا۔ ابا کے سوا اس کے ساتھ کوئی جاتا نہ تھا۔ دیکھا جائے تو اس مشکل وقت میں ابا اور رمیش کسی حد تک ساتھ دینے کے علاوہ اسے تسلی دیتے اور دلجوئی کر رہے تھے۔

ایک دن کلدیپ کو میری یاد ستائی اس نے مجھے کسی بچے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں اسے لاجرا گراؤنڈ میں ملوں۔ میں بھی دل سے اس سے ملنے کو تڑپ رہا تھا۔ بہرحال میں اڑتا ہوا اسے لاجرا گراؤنڈ ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ میری آمد سے پہلے ہی موجود تھا۔ وہ مجھ سے پہلے کی طرح گرمجوشی اور محبت سے مل کر رونے لگا۔ میری آنکھیں بھی فرط جذبات سے بھر آئیں۔ میں نے اسے نوتن کی جانب سے خلاف توقع اظہار محبت اور میرے دل میں اس کی تعظیم والی حیثیت کا سارا ذکر کیا تو اس نے مجھے کہا۔

"یار ستار! میں اتنا پاگل نہیں ہوں کہ حقیقت نہ سمجھ سکوں"۔ اس نے کہا اور مجھے چند بڑی اہم باتیں بتائیں۔

پہلی یہ کہ اس کی ماتا ایک طرف دہائی دے رہی ہیں اور اسے یہ طعنہ دے رہی ہیں کہ تیرے کالے قدم پڑنے

سے ہماری حویلی میں پہلے سے زیادہ نحوست اور مسائل کے طوفان آئے ہیں اور دوسرے وہ اسے بانجھ اور آسیب زدہ ہونے کے طعنے دے رہی ہیں تو دوسری جانب مجھے بھڑکا رہی ہیں کہ ڈوگھڑی کی چوتھائی میں اس کو طلاق دے کر دوسری شادی کرتا کہ حویلی کا کوئی وارث آئے۔

''یار! میں نے اپنی ماتا کے سامنے سختی سے کہہ دیا ہے کہ میں دیپا کو طلاق نہیں دوں گا''۔ اس نے مزید بتایا۔ ''میں کسی حالت میں دیپا سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ میری ایسی محبت ہے جسے میں نے بڑے جوکھم اور ذلیل ہونے کے بعد حاصل کیا ہے... تو ہی بتا یار! ان حالات میں میں کیا کروں؟'' پھر اس نے مجھ سے مشورہ مانگا۔

''یار! اپنے دل سے وہ فیصلہ کرنا جسے تم بہتر جانو''۔ میں نے اسے کہا۔ ''یار! تجھے دیپا جیسی خوبصورت اور تمہارے خاندان سے مخلص لڑکی کہاں ملے گی۔ اولاد کا ایک آدھ سال میں نہ ہونا یہ کوئی بڑی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ یہ تو خدائی کام ہوتے ہیں''۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ میں نے اسے کہا۔ ''یار! تجھے اپنی ماتا کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے تھی''۔

''تو نے بھی تو اپنے ماں باپ اور میرے پتا تا کے ساتھ گستاخی کی تھی''۔ اس نے مجھے طعنہ دیا۔

''یار! میرا دل مجھے بار بار ندامت کے کچوکے مار رہا ہے''۔ میں نے اسے کہا۔ ''میں ان شاء اللہ جلد ہی سنتو تائی، لالہ تایا سے معافی مانگوں گا''۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے اسے دوبارہ یقین دلایا کہ میرے اور نوتن کے درمیان محبت وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے اسی جگہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ پھر اس نے مجھے لاجپرا گراؤنڈ سے ملحقہ مارکیٹ میں لے جا کر خوب آئس کریم، دہی بھلوں، جوس وغیرہ سے عیاشی کروائی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ مجھ سے خوش تھا۔

مجھے ادرگرد سے پتا چل رہا تھا کہ نوتن اتنی لاغر ہو گئی ہے کہ وہ چل پھر بھی نہیں سکتی اور وہ مکمل طور پر بستر سے لگ گئی ہے۔ میں نہ جانے کیوں بے گناہ اپنے آپ کو اس کا مجرم محسوس کر رہا تھا اور بار بار نت نئے وسوسے، خیال مجھے کسی اژدھے کی مانند ڈس رہے تھے۔

ایک دن سننے میں آیا کہ نوتن بار بار بلا توقف تکرار کے ساتھ میرا نام پکارے جا رہی ہے۔ میں اپنے گھر والوں اور اردگرد دوستوں یاروں کے سامنے اپنے آپ کو چور اور شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنے دفتر سے چھٹی کر کے اپنا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا کرتا تھا۔

ایک دن سنتو تائی، لالہ جی اور نند پہ ہمارے گھر آئے۔ ان تینوں کو یوں بے موقع دیکھ کر ہمارے گھر والے حیران و پریشان ہو گئے۔ سنتو تائی مسلسل روئے جا رہی تھی جبکہ لالہ جی مجھے بڑے غور سے بت بنے گھورے جا رہے تھے۔ ابا اور اماں بھی ان سب کو بڑے تجسس سے دیکھنے لگے۔

''خیریت!'' ابا نے بالآخر سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

''یار عظیم! تجھے تو ہر بات کا علم ہے''۔ لالہ نے شرمندہ سے لہجے میں ابا سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ آج کل نوتن کے لبوں پر مسلسل تیرے بیٹے کا نام ہے۔ وہ ہر وقت اس کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ مگر یہ تو ناممکن ہے کہ میں نوتن کی سگائی تیرے بیٹے سے کروں اور ظاہری بات ہے یہ تو بھی نہیں چاہے گا کیونکہ تو مسلمان اور میں کٹر ہندو ہوں۔ ہاں، اگر ہم مذہب ہوتے تو میں بلا دھڑک تجھ سے اس رشتہ کی بات کرتا اور مجھے پورا وشواس ہوتا کہ تو میری اس خواہش کو ٹھوکر نہ مارتا۔ میرے عذابوں میں سے یہ بڑا عذاب ہے کہ میں نوتن کی صحت اور دماغی کیفیت سے

بڑا پریشان ہوں۔ اب ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اس کے دماغ پر کوئی جادو ٹونے کا اثر ہے یا واقعی وہ تیرے لاڈلے کے عشق کے خناس میں دیوانی ہو کر مر رہی ہے۔" پھر وہ ابا سے ہاتھ جوڑ کر استدعا کرنے لگے۔

"یار عظیم! اپنے باسو کو کہہ کہ وہ کچھ لمحوں کے لئے نوتن کے پاس آئے اور اس کی دل تسلی کے لئے جھوٹ موٹ اس سے یہ جملہ کہہ دے کہ میں بھی واقعی تم سے بہت محبت کرتا ہوں..... وہ پھر سے جی اٹھے گی۔"

"یہ تُو کیا اول فول بک رہا ہے؟" ابا نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تیرے سارے پریوار کی طرح تیرا بھی دماغ چل گیا ہے۔"

"عظیم! تُو اسے میرا پاگل پن سمجھ یا کچھ اور۔" لالہ نے جواباً کہا۔ "لیکن مجھے سر دست اپنی پتری کی زندگی اور صحت عزیز ہے۔ اچھا تو باسو کو اس جھوٹے ناٹک کے لئے بھیجے گا کہ نہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں اس کی مجال ہے کہ یہ ناٹک نہ کرے۔" ابا نے کہا۔

"میں نوتن کے سامنے اپنی محبت کا جھوٹا، سچا اظہار نہیں کروں گا۔" میں نے ایک بار پھر گستاخی سے کہا۔

"بیٹا! نوتن مر رہی ہے۔" لالہ جی نے رندھی آواز سے کہا۔ "بھگوان کے لئے میری بیٹی کو اپنی جھوٹی محبت کی مسیحائی دے دو۔ ہم بہت مجبور، پریشان ہو کر دل نہ چاہتے ہوئے یہ زہر پی رہے ہیں۔"

اماں نے بھی مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ میں نوتن کے پاس جاؤں۔

"اماں! میں اس کے دل میں اپنی محبت کی آس جگا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ جلدی چنگی ہو گئی اور اسے اس جھوٹ کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اس کا کیا حال ہو گا۔ اس کا دل دُکھے گا بلکہ وہ تو پھر واقعی مر جائے گی۔"

"بعد میں بیٹا ہم اس معاملہ کو موقع کی مناسبت کے لحاظ سے سنبھال لیں گے۔" تائی سنتو نے کہا۔ "لیکن فی الحال اس کے اندر رچے بسے زہر کو تحلیل کرنے کی ضرورت ہے۔ باسو! تُو نے وہ مثل نہیں سنی کہ زہر کو زہر مارتا ہے۔ میری نظر میں نوتن کو اس مرحلے سے نکالنے کے لئے عشق کی دوائی دینی پڑے گی۔"

الغرض مجھے اماں، ابا، لالہ جی اور تائی سنتو نے ذہنی طور پر تیار کر دیا کہ میں دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنی جھوٹی محبت کا ڈرامہ رچاؤں۔

شام کو ہم پہلے سے طے شدہ ڈرامے کے تحت حویلی پہنچے وہاں پروگرام کے مطابق لالہ جی نے مجھے نوتن کے سامنے جھوٹے اظہار کرنے کے لئے چند ضروری باتیں بتلائیں اور کہا اس کے بارے میں اُسے ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہئے۔

دیپا مجھے نوتن کے کمرے کی جانب لے گئی جہاں وہ کھاٹ پر بڑی نڈھال حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کی جسمانی کیفیت دیکھ کر میں دہل گیا۔ اس کا جسم انتہائی کمزور اور رنگت سیاہی مائل اور آنکھوں کے پپوٹے ہلکے نیلے سے ہو گئے تھے۔ اتنے میں سنتو تائی بھی وہاں آ گئی۔ انہوں نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹی! عظیم بھائی اپنے باسو کے لئے تیرا ہاتھ مانگنے آئے ہیں، بول تُو کیا کہتی ہے؟"

نوتن نے بڑی تکلیف سے اپنی پھڑ پھڑاتی آنکھوں کے پپوٹے کھولے اور میرے چہرے پر ٹکٹکی لگا کر بغور دیکھنے لگی۔

"نوتن! تم کیسی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ستارا مجھے اپنے دل پر پورا وشواس تھا۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "کہ ایک دن میری محبت کی مقناطیسی قوت تمہیں میرے پاس لازماً کھینچ لائے گی۔ تم کیا آ گئے ہو۔ لگتا ہے میری گھٹن زدہ زندگی میں ایک خوشگوار جھونکا آ گیا ہے۔"

''اری اب بھی زہر کھائے گی؟'' لالہ جو وہاں کھڑا تھا اُس نے اس سے مزاحاً مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں چاچا جی! جب امرت دھارا آ جائے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ زہر کھایا جائے''۔ اس نے ذرا جاندار آواز میں کہا۔ ''ستار! تمہیں میری محبت کا کیسے یقین آیا، میں اچانک تمہارے دل میں کیسے بس گئی؟'' اس نے یکدم دو سوالات داغے تو میں ہڑبڑا گیا۔

''بس نوتن! میں نے بعد میں تیرے بارے میں بہت سوچا''۔ میں نے بات بنائی۔ ''میں نے تیرے بارے میں اپنا پچھلا تصور یکسر بدل دیا تھا''۔

وہ بڑی ہمت کر کے نحیف سا مسکراتے ہوئے اپنی کھاٹ سے اٹھی اور اُس نے بڑی بے باکی سے اپنے ہاتھوں کا حلقہ میری گردن میں ڈال کر میری آنکھوں میں اپنی محبت بھری تھوڑ آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یوں میرے پاس چلے آنا بھگوان کرے یہ میرا سپنا نہیں حقیقت ہو۔ ستار! میری جانب قدم اٹھا ہی لیا ہے تو مڑنا نہیں۔ یاد رکھو! تم نے اگر مجھے دھوکہ دیا تو زندہ نہ رہوں گی''۔

''اچھا بیٹی! تُو اب آرام کر اور اپنے دل و دماغ کو اطمینان دے کہ اب تُو ہماری بہو ہے''۔ اماں نے اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے کہا۔ ''تجھے ستار کے ساتھ اپنی سگائی منظور ہے ناں!''

''اچھا اب ہمیں چلنا چاہئے''۔ میں نے یہ الفاظ اماں کو کہے تو نوتن کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''چاچا جی! عظیم چچا کو انکار نہ کرنا''۔ نوتن نے لالہ جی سے کہا۔ ''میری طرف سے سو بار ہاں ہے''۔

''اری شرم کر کنواری کنیا ہوتے ہوئے اپنا ہوں پر مانگ رہی ہے''۔ سنتو تائی نے چوہلی ہنستے ہوئے اسے مزاحاً کہا تھا۔

لالہ جی نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ ''بیٹا اگر تمہارے دل میں میری ذرا بھی عزت و تعظیم ہے تو میری مرتی بیٹی کی دل جوئی کرتے رہنا۔ اس سے اپنی جھوٹی محبت کا اقرار کرتے رہنا۔ میں تمہارا تاعمر شکرگزار رہوں گا''۔

''تایا جی! آپ تو ہمارے اس معاملے میں مطمئن رہیں گے''۔ میں نے کہا۔ ''لیکن اس جھوٹ موٹ کے ڈرامہ میں مَیں اور میرا پورا خاندان گنہگار ہوں گے بلکہ میرا ضمیر عمر بھر مجھے کوڑے مارے گا''۔

میں جب نوتن کے کمرے سے واپس مڑنے لگا تو وہ اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے مجھے بڑی بے بسی اور پُرامید نظروں سے دیکھنے لگی۔ سچی بات ہے اس سمے میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں ایک معصوم اور بیمار لڑکی کو اپنی محبت کا جھوٹا یقین دلا کر اسے دھوکہ دے رہا ہوں۔

''دوستی یاری، بھائی چارہ، میں گناہ ثواب کو کیا دیکھنا''۔ ابا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اور ویسے میں نے تجھے اس غیر شرعی کام پر مجبور کیا ہے۔ گناہ ہوگا تو مجھے ہوگا۔ تجھے میں حکم دیتا ہوں کہ تُو وہ کر جو میں کہتا ہوں''۔

میں انہیں اس بات کا جواب تو دینا چاہ رہا تھا لیکن اماں نے میری کمر میں ہلکا سا ٹھونکا مارتے ہوئے کچھ بولنے سے منع کر دیا۔

''یہ میرے اور نوتن کے ساتھ زیادتی ہے''۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''ارے آہستہ بولو''۔ تائی سنتو نے کہا۔ ''اندر کھاٹ پر پڑی نوتن نے تیری یہ ذرا سی بھی دل جلی بکواس سن لی تو ہم ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے''۔

***

ایک دن P.C.N.O.C آفس کا بڑا آفیسر حویلی میں ارادتاً آیا اور اس نے لالہ جی کو بتلایا کہ مجھے اب اگلے چند روز میں ہائی کورٹ کو تمہاری جانب سے پیش کئے گئے صوبائی کمرشل اجازت نامہ کے سرٹیفکیٹ کو مجبوراً یکسر جعلی

قرار دے کر رپورٹ لیگل برانچ (ہائی کورٹ) بھیجنی پڑے گی۔ لالہ جی نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''بھگوان کے واسطے مجھے زمانہ کے سامنے بربادی رسوائی سے بچالو''۔ لالہ نے آفیسر کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

''تیرا کیا خیال ہے لالہ! میں تجھ سے چند ہزار روپوں کی رشوت لے کر تیرے جعلی کاموں پر پردہ ڈال کر پکڑا جاؤں؟'' آفیسر نے کہا۔ ''اور نوکری سے ذلیل کر کے نکالا جاؤں؟ نا بابا نا، یہ مجھ سے نہ ہوگا''۔

''نوتل جی! میں آپ کو آپ کی توقع سے زیادہ معاوضہ دوں گا''۔ لالہ جی نے چارہ پھینکا۔

''ارے تُو مجھے وہ کچھ نہیں دے سکتا جو میری حیثیت کے برابر حق ہے''۔ آفیسر نوتل نے کہا۔ ''میں جسپال اور پالن کی طرح نہیں ہوں جو صرف فضلہ کھاتے ہیں۔ میں بڑے خطرے مول لے کر بڑا شکار کھاتا ہوں لیکن سونے کے چمچ میں کھاتا ہوں۔ تُو کیا اپنی ہیرے جیسی قیمتی حویلی بچانے کی خاطر مجھے تھوڑا سا سونا نہیں دے سکتا۔ سچی بات ہے اگر میں نے تمہاری جانب سے پیش کیے گئے سرٹیفکیٹ کو اصل قرار دے دیا اور اس کا دوبارہ آڈٹ ہو گیا تو لامحالہ میرا محکمے سے بستر گول ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تُو مجھے اتنا دے دے کہ اگر میں نوکری سے نکالا جاؤں تو اپنی بقیہ زندگی فقیروں کی طرح نہ گزاروں''۔

''کتنے دوں؟'' لالہ جی نے ڈرتے ڈرتے لہجہ میں پوچھا۔

''یہی چالیس ہزار روپے''۔ نوتل نے لالہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے منہ سے یہ رقم سنی تو لالہ اس طرح چونکا جیسے اس کے جسم پر کسی نے جلتا ہوا پانی پھینک دیا ہو۔

''نہیں، میں آپ کی اتنی زیادہ مٹھی گرم نہیں کر سکتا''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''پہلے ہی بے جا مقدمات، گھریلو مسائل اور مختلف محکموں کو رشوتیں دے دے کر مفلوک الحال ہو گیا ہوں''۔

''اچھا میں چلتا ہوں''۔ نوتل نے اطمینان سے کہا۔ ''تیرے پاس سوچنے کے لئے چار دن ہیں۔ تیرا اگر موڈ بنے تو مجھ سے جادا ہوٹل میں مل لینا لیکن ایک بات یاد رکھ میں نے تجھے آنے والے وقت کی جو تصویر دکھائی ہے، ہوگا وہی''۔

اگلے ہی دن لالہ جی کیشی، اور مولدر سنگھ، نوتل سے ملنے جادا ہوٹل گئے۔ وہاں اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔

''یہی لالہ جی کی حویلی کے کیس کی موجودہ صورت حال ہمارے محکمہ کا یہ سرکاری وکیل نہل بتلائے گا''۔ نوتل نے کہا۔ ''تم لوگ پہلے اس کی بات سن لو''۔

وکیل نہل نے مولدر سنگھ کی جانب اپنا منہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تجھے جانتا ہوں تُو ایک پرانا مقدمہ باز اور عدالتی کارروائیوں کو بخوبی سمجھنے والا انسان ہے۔ اسی لئے میں تجھ سے اب جو بات کروں گا تو اس کا لب لباب لالہ جی کو سمجھا دے''۔ وکیل نہل نے اپنی جیب سے ایک بڑا امتحانی شیٹ کی طرح کا کاغذ نکالا، جس پر پنسل کی مدد سے انگلش تحریر تھی۔

وکیل نہل نے وہ کاغذ مولدر سنگھ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے بغور پڑھ اور پھر اس کا اپنی زبان میں ترجمہ ان دونوں، بالخصوص لالہ کو سنا''۔

مولدر سنگھ نے چشمہ اپنی آنکھوں پر اچھی طرح سیٹ کیا اور وکیل کی جانب سے دیئے گئے کاغذ کی تحریر کو بغور حرف بہ حرف پڑھنے لگا۔ لالہ اور کیشی بت بنے لیکن بڑے انہماک سے اس کی جانب دیکھے جا رہے تھے۔ مولدر سنگھ بیس سے پچیس منٹ تک کاغذ پر اپنا سر جھکائے رہا۔

"اوہو، وکیل صاحب آپ کے اس رپورٹ بم کے پھٹنے سے تو لالہ کی عزت ریزہ ریزہ ہو جائے گی"۔ مولدر سنگھ نے وکیل سے کہا۔ "میری آپ سے استدعا ہے کہ اس رپورٹ کی حدت کو ذرا دھیما کریں"۔

"مولدر سنگھ! میں اپنے محکمے کا نہ صرف وکیل ہوں بلکہ میں اس کا لیگل ایڈوائزری آفیسر بھی ہوں۔ میں نے اس رپورٹ میں اپنی ذمہ داری اس طرح نبھائی ہے کہ میری حیثیت بھی کسی طرح پامال نہ ہو اور لالہ کی جانب سے پیش کیے جعلی سرٹیفکیٹ کو کلی طور پر جعلی نہیں بلکہ مشکوک قرار دیا ہے اور اپنی اس گول مول رپورٹ میں لکھا ہے کہ محکمہ اس سرٹیفکیٹ کی حقیقت کی مزید جانچ پرکھ کرے گا۔

مولدر سنگھ اب تُو لالہ جی کو میری طرف سے سمجھا دے کہ ان سے پہلے کہ اس کی تمام حویلی بمعہ دکانیں ڈگری ہو جائیں اور اسے جعلی دستاویزی فراڈ کے ضمن میں دس سے بارہ سال کی قید بامشقت ہو جائے وہ حویلی کے نیچے تمام دکانوں کو اونے پونے کسی دوسری تگڑی پارٹی کو فروخت کر دے۔ میری نظر میں ایسی کچھ پارٹیاں ہیں جو ایسے لڑائی جھگڑے والے جھمیلوں کو سنبھال لیتی ہیں۔ ان کا اثر و رسوخ اور بدمعاشی کی طاقت اتنی ہوتی ہے کہ وہ دھونس سے ہر کام کرا لیتی ہیں"۔

"تو وکیل صاحب! میں کیا اپنی حویلی کی تمام دکانوں کو اونے پونے فروخت کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لوں؟" لالہ جی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"اتنا ناراض نہ ہوں لالہ جی!" وکیل نے اس کے ردعمل میں بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اپنی کچھ طاقت ان دنوں کے لئے بچا کر رکھ جب تیرے بوڑھے شریر پر I.P (انویسٹی گیشن پولیس) والے اپنی لاٹھیوں اور چمڑے کے چھتروں سے ٹھکائی کریں گے اور تُو چلائے گا اور وہاں تجھے کوئی سننے اور بچانے والا نہ ہوگا..... ارے عقل کے اندھے، دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانے والے۔ تُو وشواس کر یہ تو کل اور میں تجھے یہاں بے رحم دلدلی زمین میں دھنسنے سے بچانے اور اچھا مشورہ دینے آئے ہیں۔ میری مان اب بھی کچھ نہیں بگڑا ابھی وقت کی لگام ہمارے ہاتھ میں ہے، اس وقت سے فائدہ اٹھا لے"۔

"ہاں، ہاں لالہ! ہوش کے ناخن لے"۔ درمیان میں مولدر سنگھ کہا۔ "اور آئندہ اپنے سامنے آنے والی مصیبتوں کا ادراک کر"۔

"میں تیرے ساتھ ایک نیکی کر سکتا ہوں"۔ وکیل نے کہا۔ "جب میری رپورٹ ہائی کورٹ کے متعلقہ دفتر میں پہنچے گی تو میں وہاں اسے بھی ہفتہ بھر کے لئے رکوا دوں گا..... اچھا ادھر کونے میں آ۔ ذرا لین دین کی بات کر لیں"۔ اس نے لالچی انداز میں کہا۔ "میں نے تجھے تیرے فائدے کے تین چار قیمتی مشورے دیئے ہیں"۔ وہ لالہ کو کونے میں لے گیا اور کافی دیر تک اُن کے کانوں میں کھسر پھسر کرتا رہا۔ نجانے ان کے مابین کیا طے ہوا اس کا مولدر سنگھ، مکیش کو کوئی علم نہ ہوا۔

"لالہ! اگر تو نے آج دل بڑا کر کے اور دماغ کی کھڑکیوں کو کھول کر فیصلہ نہ کیا تو عمر بھر پچھتائے گا"۔ وکیل نے کہا۔ "جھگڑے پر مشتمل دکانوں کو کسی بے وقوف کے گلے ڈال کر اپنی جان چھڑا لے تو یہ تیری عقلمندی ہو گی..... کیوں بھئی مکیش! تُو کچھ میرے مشورے کی تائید یا نفی کر کے اپنا حصہ ڈال"۔

"جی ہاں، میں بھی سمدھی جی کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں بلکہ تمہاری حویلی کی حیثیت اب چیونٹیوں بھرے کباب کی مانند ہے۔ جسے نہ کھایا جائے نہ پھینکا جائے"۔ مکیش نے کہا۔ "بہرحال ہم سب لوگوں نے اسے آئندہ آنے والے دنوں کی وہ بھیانک تصویر دکھائی ہے، جس کا اس نے خود ہی اکیلے سامنا کرنا ہے۔ باقی یہ

جہاندیدہ اور زیادہ عقل مند ہے"۔

"ہاں، بھئی لالہ تیری بدھی میں ہماری کچھ بات پڑی"۔

"جی، مجھے فی الحال کچھ سجھائی نہیں دے رہا، میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو رہا ہے"۔ لالہ نے بے بسی سے کہا۔

"لالہ جب تیرا دماغ کچھ اپنی جگہ پر ٹھکانے آ جائے تو فوری طور پر ہمارے مشورہ کو حقیقت کی نگاہ سے سوچ کر کوئی جلدی فیصلہ کرنا"۔ نوتن نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ تیرے پاس سوائے پچھتاوے کی کڑواہٹ کے سوا کچھ نہ رہے"۔

"اچھا نوتن جی! میں غور کروں گا"۔ لالہ جی نے کہا۔

"دوسرے روز لالہ سوادر سنگھ کے ہمراہ میرے ابا سے مشورہ کرنے آیا۔ اس نے انتہائی تھکی اور مایوس کن گلوگیر آواز میں کہا۔

"یار عظیم! لگتا ہے میں اب تھک گیا ہوں۔ میرے دشمنوں، حاسدوں نے اپنی چال بازیوں میں الجھا کر تھکا دیا ہے۔ واقعی آج اس مقام پر آ کر سوچتا ہوں کہ میں اور میری سوچ غلط تھی کہ میں اپنی حویلی کی ملکیت اور اپنی ساکھ کو ہمیشہ قائم رکھ سکوں گا"۔

"چل اچھا ہوا تجھے عقل تو آئی"۔ ابا نے اسے کہا۔

"اچھا تو اب تُو نے کیا سوچا؟"

"عظیم! لگتا ہے اگلے چند دنوں بعد بقیہ زندگی کے دن نہ صرف جیل کی سلاخوں میں گزریں گے بلکہ میرے پریوار کے سر سے حویلی کی چھت بھی چھن جائے گی"۔ لالہ جی نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔

"تُو میری ان دکانوں کے لئے کوئی انویسٹر ڈھونڈ"۔ لالہ نے مکیش کو اپنے پاس چپکے سے بلا کر کہا۔ "لیکن یہ کام بڑی رازداری میں ہونا چاہئے۔ اگر کسی کو یہ خبر ہو گئی کہ میں نے حویلی کی دکانیں فروخت کر دی ہیں تو میری، میرے گھر میں اور باہر ہر طرف تھو تھو ہو گی کہ میں نے اپنے دشمنوں کے خوف سے مرعوب ہو کر چند ٹکوں کے لالچ میں حویلی کی دکانیں فروخت کر دیں"۔

"لالہ! تجھے اتنی اہم بات کم از کم کلدیپ اور سنتو بھابی کو بتانی چاہئے"۔ ابا نے کہا۔

"اور عظیم! تُو پاگل تو نہیں ہے؟" لالہ جی نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "اس بات کی ذرا سی بھی بھنک اس عقل سے پیدل، چنڈال کے کانوں میں پڑ گئی تو اس نے میرے لئے ایک اور نیا عذاب پیدا کر کے کھوپڑی کھپریل کر دینی ہے۔ میں وقت آنے پر ان کو بتا دوں گا جن کو مجھے اس امر کے بارے میں مطلع کرنا ضروری ہو گا"۔

"لالہ جی! آپ چنتا نہ کریں، میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی حویلی کی دکانوں کی مناسب قیمت پر فروخت کے لئے پارٹی گھیر دوں گا"۔ مکیش نے کہا۔ "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں"۔

***

نوتن کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری جانب سے کئے گئے اظہارِ محبت کے ڈرامہ کو سچ سمجھ رہی تھی۔ بخدا مجھے اس بھونڈے ڈرامہ کا دلی طور پر بہت ملال محسوس ہو رہا تھا لیکن میں کیا کرتا۔ میرے ابا اور اماں اور دوسری جانب لالہ اور سنتو تائی مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں نوتن سے خوش خوش ملا کروں اور پیار بھری مسکراہٹ اور باتوں سے اس کا دل بہلاؤں۔ وہ ہمارے گھر انتہائی اچھے کپڑے پہن کر اور چہرے پر ہلکا پھلکا میک اپ کر کے بن سنور کر آتی۔ وہ جب ہمارے گھر آتی تو اس کی پہلی ترجیح یہ ہوتی کہ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو لیکن میں دلی طور پر اس سے کترانے کی کوشش کرتا۔ وہ اکثر میرے کمرے میں بہانے سے آ جاتی اور مجھے اپنی اداؤں اور پیار بھرے جملوں سے اکساتی کہ میں بھی اس کو محبت بھرا ردعمل دوں۔ میں اسے یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ میں

عشقیہ رموز و انداز نہیں سمجھتا بس تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اس لئے میں نے اپنی اماں سے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔

"تو کب تمہاری میری سگائی ہوگی؟" وہ اکثر پوچھتی۔

میں اس کے اس سوال کا جواب یوں دیتا کہ میں ابھی ایف اے کی تیاری کررہا ہوں۔ مجھے جب اس کی سند مل جائے گی تو میں زور دے کر اماں سے کہوں گا کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔

"ایف اے کرکے کون سا تیر مارلو گے؟"

"بھئی، اگر میں نے ایف اے کرلیا تو میرے محکمے میں میری ترقی ہو جائے گی"۔ میں نے اسے سمجھایا۔

"پھر تو تم لاٹ صاحب بن جاؤ گے"۔ اس نے پیار بھرے انداز سے کہا۔

"میں لاٹ صاحب تو نہ بن سکوں گا"۔ میں نے کہا۔ "لیکن میری تنخواہ میں پانچ دس روپے کا اضافہ ہو جائے گا"۔

"تم پانچ دس روپے کے لالچ کو چھوڑو"۔ نوتن نے کہا۔ "تمہاری میری جب سگائی ہوگی تو میں خود پتا جی کو زور دے کر تین چار دکانیں جہیز میں دلوا دوں گی اور تمہیں ان کا کم از کم کرایہ 100 روپے مل جایا کرے گا"۔

"نوتن! میں اپنے بازوؤں کی کمائی پر یقین رکھتا ہوں"۔ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں جہاں کہیں بھی شادی کروں گا میں وہاں سے جہیز نہیں لوں گا"۔

"یہ جہاں کہیں بھی سے تمہارا کیا مراد ہے؟" اس نے میری بات پکڑتے ہوئے کہا۔ "ارے تمہاری شادی تو مجھ سے ہوگی"۔

میں نے اس کی یہ بات سن کر خموشی اختیار کرلی اور اسے ٹال دیا۔

ادھر مکیش حویلی کی دکانوں کی خرید کے لئے ایک انتہائی بدمعاش قسم کا آدمی لے کر آیا۔ وہ جس کھلی جیپ میں آیا تھا اس میں اس کے چند بندوق بردار، قد آور گھنی مونچھوں والے محافظوں کے ہاتھوں میں انتہائی خطرناک نسل کے کتے پکڑے ہوئے تھے۔ محافظ بمعہ کتوں کے تو اپنی جگہ پر وہیں بیٹھے رہے جبکہ جیپ کے فرنٹ پر بیٹھا بدمعاش اتر کر سیدھا حویلی کی دکانوں کا چیدہ چیدہ سرسری جائزہ لیتا رہا۔ وہ نائی، قصائی اور پنساری کی دکانوں پر گیا۔ حویلی کے کرایہ دار دکاندار بڑے انہماک اور ششدر ہو کر اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہے تھے۔

"جی حضور! میں آپ کی کچھ خدمت کرسکتا ہوں"۔

پنساری کی دکان میں بیٹھے دکاندار نے جب اس سے یہ جملہ کہا تو اس بدمعاش نے بڑے ملائم لہجے میں لیکن بدمعاشی کے انداز میں اس کی گردن کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں تجھ سے وقت آنے پر خدمت لیں گے بھی اور دیں گے بھی"۔

لالہ جی اس بدمعاش اور مکیش کو لے کر ہمارے گھر لے آیا۔ اس سے پہلے کہ مکیش اس کا کچھ تعارف کرواتا۔ اس بدمعاش نے خود بڑے اعتماد سے کہا۔

"جی، مجھے میری دنیا میں چیف کہتے ہیں لیکن میرا اصل نام نکھال ہے"۔

چیف بدمعاش کا نام سن کر لالہ جی اور ابا ٹھٹک گئے۔

"گھبرائیں نہیں میں ان لوگوں کے لئے بے رحم بدمعاش ہوں جو میرے سامنے بدمعاشی کرتے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "اور میں آپ جیسے شریف، بے ضرر انسانوں کے لئے صرف نکھال ہوں۔ مجھے مکیش نے آپ کی حویلی کی مختلف جھگڑوں سے جڑی دکانوں کی فروختگی کا ذکر کیا تھا"۔

"جی ہاں، نکھال جی!" لالہ جی نے کہا۔ "میری حویلی اور دکانوں پر میرے حاسدوں کی لالچی لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ بالخصوص میرے بھائی شنکر دیال اس

کے بیٹوں اور خواہ مخواہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ بھی اس کو اینٹھنے
کے چکر میں ہے اور دوسرے میرے یہ سارے دکاندار
کرایہ دار مجھے بہت توڑ توڑ کر نہ ہونے کے برابر کرایہ
دیتے ہیں"۔

"لالہ جی! باقی باتیں بعد میں کرنا"۔ نکھیال نے
کہا۔ "لیکن پہلے یہ بتلائیں کہ آپ نے جو جعلی
PCNOC حویلی کی ان دکانوں کو تجارتی مقاصد کے لئے
کھولنے کے لئے ہائی کورٹ میں دیا۔ میں تو واقعی آپ
کے لئے نہ صرف عذاب عظیم ہے بلکہ جو خریدار بھی اسے
اگر خریدے گا تو اس کا کیا بنے گا۔ یہ تو آپ نے اور آئندہ
اس حویلی کے مالکان کے لئے بہت بڑی جلتی ندیا کھڑی
کردی ہے"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہو جی!" لالہ جی نے ٹوٹے
ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسی خوف اور اپنی بھیانک غلطی اور
اپنے چند مخلص جہاں دیدہ دوستوں کے مشورہ کی وجہ سے
دل کو نہ مانتے ہوئے میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے
پر راضی ہوا ہوں"۔

"لالہ جی! تمہاری حویلی کی ان دکانوں کو خریدنا
بڑے جوکھم کا کام ہے"۔ نکھیال نے کہا۔ "سیدھا سیدھا
اپنی رقم کو تقریباً ڈبونے کے مترادف ہے لیکن آپ اس کی
چنتا نہ کریں۔ میں آپ کی تمام پریشانیاں، الجھنیں اپنے
گلے ڈالنے کو تیار ہوں..... اچھا یہ بتلائیں میں آپ کو آپ
کی تمام دکانوں کا کیا پیش کروں؟" لالہ کیدار ناتھ نے ابا
کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ابا نے اس کی سوالیہ
نظروں کو بھانپتے ہوئے اسے کہا۔

"نکھیال جی! آپ کو تو اس کا بخوبی علم ہے حویلی کی
یہ تمام دکانیں بے شک جھگڑے کی ہیں لیکن سر دست ان
کی قیمت خدا جھوٹ نہ بلوائے دو اڑھائی لاکھ تو ہو گی"۔

"نہیں، آپ کا اندازہ انتہائی غلط ہے"۔ نکھیال
نے ابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میری نظر میں اس ٹوٹل
جائیداد کی قیمت 4 لاکھ ہے لیکن....." اس نے بات
ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن کیا؟" مکیش نے اسے پوچھا۔

نکھیال نے اپنی جیب سے بیڑی نکالی اور اپنے
لبوں کے درمیان اسے لٹ کر کے سلگاتے ہوئے کہا۔

"میری لیکن سے مراد یہ ہے کہ آپ کو بھی تو یہ
بخوبی معلوم ہے کہ ہو سکتا ہے آپ لوگ اس حویلی کی
ملکیت کا کیس ہار جائیں اور یہی نہیں لالہ جی نے جو ہائی
کورٹ میں جعلی PCNOC پیش کی ہے اس کی بنیاد پر
یہ تمام دکانیں سرکاری طور پر بمعہ جرمانہ بند ہو جائیں تو
کیا اس حویلی کی دکانوں کو میں خرید کر اس کا اچار ڈالوں
گا؟ عظیم صاحب! آپ یا لالہ جی اور مکیش جی میرے اس
سوال کا جواب دے دیں..... یہی نہیں یہ بھی تو آپ
سوچیں کہ ان دکانوں میں برسوں پرانے دکاندار بطور
کرایہ دار بیٹھے ہیں وہ کیا آسانی سے چلے جائیں گے۔
ان کو بھی شرافت، غنڈہ گردی، اپنے اور ان کے سر پھاڑ
کر، ٹانگیں تڑوانے کے علاوہ انہیں تھانوں اور کچہریوں
میں روپے پیسوں کے بے دریغ بہاؤ وغیرہ کا سامنا کرنا
پڑے گا، یہ کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ میری نظر میں
لالہ جی! آپ کی یہ حویلی چوں چوں کے مربہ سے کم نہیں
ہے"۔

"اچھا اب آپ کیا کہتے ہیں؟" لالہ جی نے ٹھنڈی
آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں فی الحال تو اتنا کہتا ہوں"۔ نکھیال نے کچھ
چنتے ہوئے کہا۔ "کہ پہلے ہمیں کچھ دوا دارو کا دور چلا لینا
چاہئے"۔

"معاف کرنا میں مسلمان ہوں"۔ ابا نے اسے کہا۔
"میں شراب، بیئر تو نہیں پیتا۔ ہاں، میں نے اندر چائے
پانی کا کہہ دیا ہے، وہ آتی ہو گی"۔

"اوہو، سارا موڈ ہی خراب کر دیا"۔ نکھیال نے

کہا۔

مکیش نے اپنی جیب سے میں روپے نکالے اور مجھے کہا۔" جاباسو! کلومنی (Colemni) وسکی کی بوتل پکڑ لا"۔

ان دنوں میں شراب عام مل جاتی تھی۔ میں بازار گیا اور بوتل لا دی۔ لالہ جی، مکیش اور نکھال نے شراب پینا شروع کر دی۔

"میں اس جھگڑے والی جائیداد سے منسلک تمام خرافات کے باوجود آپ کے ساتھ بالکل بھی زیادتی نہ کروں گا"۔ نکھال نے شراب پیتے ہوئے کہا۔"میں آپ کو اس کی مناسب قیمت دوں گا۔ اگر آپ کو منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی بات نہیں۔ ہمارے معاملات ادھر ہی ختم ہو جائیں گے۔ جہاں تک رہا ان دکانوں کی قیمت کا تو میں آپ کو اس کی ایک پیٹی (لاکھ روپے) دے دوں گا"۔

"ایک پیٹی؟ یہ تو بہت کم ہے"۔ ابا نے روایتی انداز میں اس سے مول تول والی باتیں شروع کر دیں۔

"نہیں نہیں، بس میں اتنا ہی کر سکتا ہوں"۔ نکھال نے کہا۔"آپ میری آفر پر اچھی طرح سوچ و بچار کر لیں اور جو آپ کا فیصلہ ہو مجھے مکیش کے ذریعہ مطلع کر دیں"۔

نکھال کے جانے کے بعد تھوڑی دیر میں مکیش بھی چلا گیا تو لالہ جی کافی دیر تک ابا کے پاس بیٹھ کر حویلی کی دکانوں کی فروختگی کے بارے میں مشاورت کرتا رہا۔ اس مشاورت کے دوران ایک مقام پر آ کر لالہ دکانوں کی فروختگی کے بارے میں ڈانواں ڈول ہو گیا۔

"مجھے چاہے جیل جانا پڑے یا حویلی کی دکانوں کو تجارتی حیثیت سے بند کرنا پڑے"۔ اس نے جذباتی انداز میں کہا۔"میں اب کسی قیمت پر نکھال کے آگے اپنی دکانیں نہ فروخت کروں گا"۔

دوسرے روز لالہ جی کی حویلی میں متعلقہ محکمہ سے سرکاری نوٹس ملا کہ وہ فلاں تاریخ کو متعلقہ برانچ میں اپنی جانب سے دیئے گئے PCNOC اجازت نامہ کے سلسلہ میں انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش ہو۔

لالہ اس طلبی نوٹس کو دیکھ کر اتنا ذہنی خوف زدہ اور تذبذب کا شکار ہوا کہ اسے پاخانے لگ گئے۔ اس نے فوری طور پر مولدر سنگھ، مکیش کو لیا اور سیدھا نوشہ کمل وکیل کے پاس مشورہ کے لئے پہنچا۔

نوشہ کمل نے اسے کہا کہ وہ کسی صورت میں بھی انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش نہ ہو۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ اگر انکوائری کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں صرف دکانوں یا مکمل طور پر وکیل حویلی کا ہائی کورٹ میں کیس ہار بھی گیا تو ہم سپریم کورٹ میں اس کے خلاف اپیل کر سکتے ہیں لیکن اس نے اسے یہ بھی مشورہ بڑے زور دے کر دیا کہ وہ ہر ممکن اور فوری طور پر مکمل حویلی نہیں تو اس سے ملحقہ دکانوں کو اونے پونے فروخت کر کے اس سے کچھ رقم حاصل کرے۔ تقریباً 90% خطرہ ہے کہ اس کے ہاتھوں اس کی کل حویلی کی ڈگری نہ ہو جائے۔

نوشہ کمل وکیل کی اس دلخراش تنبیہ کے بعد لالہ جی کے خوف و اضطراب کے گراف میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کا دماغ فوری طور پر حویلی کی دکانوں کو فروخت کرنے پر راضی ہو گیا۔ وہ مولدر سنگھ اور مکیش کو لے کر سیدھا نکھال کے پاس گیا۔ وہاں جوڈیشل اہتمام میں حویلی کی 11 دکانوں کا سودا ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے میں طے ہوا۔ اس میں مکیش اور مولدر سنگھ نے بطور گواہ دستخط کئے۔ 15000 روپے مکیش نے نکھال کو مول تول کروا کر بڑھا دیئے تھے۔

نکھال نے طے شدہ سودے کا 25000 روپے بطور ایڈوانس دے دیئے۔ بقیہ رقم رجسٹری ہونے کے بعد کا وعدہ ہوا تھا۔

***

ایک دن نوتن میرے لئے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کڑھی لائی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہلکا پھلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں دلکش نظر ضرور آ رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان ایک حد کے لئے لڑکھڑاتی ہے اور وہ چند سیکنڈ کے لئے گم صم ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کی اس حالت پر تشویش ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تمہیں باتیں کرتے ہوئے اچانک کیا ہو جاتا ہے۔

''مجھے بعض دفعہ ایسا لگتا ہے جیسے میرے دماغ کے ساتھ کوئی غیر مرئی مخلوق جڑی ہے اور وہ اچانک میرے سامنے آ کر مجھے کچھ اچھا کرنے یا کہنے پر روکتی ہے''۔ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میرا ذہن، جسم دن بدن لاغر، تھکاوٹ، مفلوج زدہ ہوتا جا رہا ہے۔ بھگوان کے واسطے تم مجھ سے جلد سگائی کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تم سے اپنی سگائی کی حسرت لئے چتا کی نذر ہو جاؤں''۔

''پریشان نہ ہو نوتی!'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تو پہلے کی طرح بھلی چنگی ہو جائے گی''۔

میں نے اسے یہ سب کہہ تو دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اب میرا دل بھی اس سے ملنے اور بات کرنے کو چاہنے لگا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر اس کی طرف مائل ہو رہا تھا اور یہ سب پریشان کن تھا۔

میں عجیب مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگی۔ ''یا اللہ، تُو دلوں کے حال جانتا ہے، اس معاملے میں میرے لئے آسانی پیدا فرما دے''۔

دعا مانگ کر مجھے سکون ہو گیا اور میں نے خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔

(جاری ہے)

رُوبرُو

مجھے لگتا ہے کہ ہر طرف سناٹا ہے اور میرے اطراف کے تمام لوگ مر چکے ہیں۔ جب اپنے اطراف کے سارے کے سارے لوگ مر جائیں تو انسان کس قدر اکیلا ہو جاتا ہے۔

☆ نسیم سکینہ صدف

اپنے پہلے قتل کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی۔ کس طرح میں نے گردن کاٹی اور پھر کس طرح وہ کانپ اٹھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ سامنے والے کی گردن ڈھلک گئی تھی، آنکھوں کی پتلیاں پھر گئی ہیں۔ سانس میں نشیب ہے نہ فراز اور تمام حسیات کے تار تو اس طرح ٹوٹ گئے ہیں جیسے یکلخت شیشہ گرے اور ریزہ ریزہ ہو جائے اور پھر اپنی شکل میں کبھی نہ آئے۔

ایک ثانیہ میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ادھ کھلے منہ سے میرے پارٹنر کی زبان لٹکی پڑ رہی تھی۔ اگر مرتے مرتے اس کے اندر تھوڑی سی بھی بولنے کی طاقت ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر گندی گالیاں ضرور دیتا اور گالی کا ڈنک کچھ اس طرح میرے اندر پیوست ہوتا کہ کسی کروٹ سکون نہیں لینے دیتا لیکن شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہی وہ ختم ہو گیا۔ آتی روز دھوپ کے بعد اتنا تیز زہر ملا تھا۔ مرتے مرتے بھی وہ میری نظر میں دوست ہی بنا رہا۔

یہ سوچتے ہوئے مجھے بہت سکون ملا۔

پھر میرے خیال نے جست لگائی اور میں زندگی کی رنگین تصویر دیکھنے میں گم ہو گیا۔ تصویر کا یہ رخ مجھے لذتوں سے ہمکنار کرنے لگا۔ بزنس کا سارا پرافٹ اب میرے پاس آئے گا۔ پارٹنرشپ ختم ہو گئی۔ پارٹنر موت کی نیند سو گیا لیکن...... لیکن، روپیہ ڈھیرے ڈھیرے میرے پاس بھی بہت ہو جاتا۔ آدھا پرافٹ بھی کم تو نہ تھا۔ خاموشی کی تہوں میں میرا مجرمانہ احساس ایک دم میری طرف جھپٹا۔ اس سے بچتے ہوئے میں زیرلب بڑبڑایا۔

''انتظار!'' انتظار کے معنی ہیں وقت اور وقت ہے کہاں؟ کسی پل بھی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ سوتے میں یا جاگتے میں، چلتے میں یا بیٹھا رہنے میں۔ دھماکے، میزائل، ایٹمی تجربے و دورنگے فساد، جلے ہوئے مکانات، جھلسے ہوئے گلی کوچے، کٹی پھٹی لاشیں اور پھر مسموم ہوائیں۔ فضا بھی لااعتبار ہو گئی ہے۔ اب نرم مٹی پر کھلتے ہوئے گلاب

ایک دم سیاہ ہو جاتے ہیں اور پھر میں اکیلا تو نہیں۔ چاروں سمت ہی ایسا ہو رہا ہے۔ انسان ایک دوسرے کو تہ تیغ کرنے میں مصروف ہے۔ بھری پُری سڑکوں پر خوبصورت چوراہوں پر گھروں کی دہلیز پر، سیاست کی کرسیوں پر، بزنس کی منڈیوں میں، ہر طرف یہ کھیل جاری ہے اور جو لوگ قتل نہیں کر پاتے وہ اپنے خیالوں ہی میں صبح شام کتنوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ بغیر تھکے اور بغیر کسی آواز کے پھر میں اکیلا کیسے ہوا؟

یہ سوچتے ہی اطمینان کی ایک لہر میرے اندر دوڑنے لگی۔ میں نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کی۔ اب میرے پارٹنر میں اتنی بھی سکت نہیں ہے کہ وہ کوٹ کا بٹن جو کاج میں اٹک گیا ہے اُسے کھول لے یا بند کر دے۔ شاید وہ اُسے کھولنا چاہتا ہو یا پھر بند کرنا چاہتا ہو لیکن اب وہ اپنی مرضی کا مالک نہیں رہا۔ دوسروں کے کندھوں کا محتاج اپنی آخری آرام گاہ تک جانے کے لئے۔ میں زیر لب مسکرایا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگا۔ ”کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور سب کام بخیر وخوبی ہو گیا، نہ گواہ نہ شہادت“۔

میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں کوئی نہ تھا۔ سکون اور طمانیت کے ساتھ میں آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لینے لگا۔ خوشی کے دائرے میں چکر لگاتے ہوئے اچانک میرا دل زوروں سے دھڑکا، میری دھڑکن نے میری خوشی پہ اس زور کا جھپٹا مارا کہ ایک بار تو میرا سارا وجود جھنجھنا اٹھا۔ میں نے سوچا کہیں کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑی ہو۔ خوف کا حصار چاروں طرف سے مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لئے بڑھا۔ ہو سکتا ہے کہیں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ کسی بھی نگاہ نے۔ آج جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا تو سیڑھیاں چڑھتے اور دروازہ کھولتے ہوئے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو۔

جیسے ہی یہ خیال آیا اعصاب چٹخنے لگے۔ میں اٹھا اور کمرے کا طواف کرنے لگا۔ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا لیکن حلق کے کانٹوں میں کمی نہ آئی۔ اپنے اندر سے اٹھنے والے مدوجزر سے بے چین ہو کر پھر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ ایک ایک کونے پر میری نگاہ پڑنے لگی۔ آنکھیں ابلنے لگیں لیکن میرے کمرے میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا یا پھر میرے پارٹنر کی سرد لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی ایک بار پھر طمانیت کی لہر میرے اندر دوڑ گئی۔

کہیں درز میں سے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو۔ اس سوچ نے چند لمحوں بعد پھر سے بے چین کر دیا۔ خوف زدہ آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں اور اوپر نیچے گردش کرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا میں کھڑکی تک گیا، ایک ذرا کھول کر اس میں سے جھانکا خاموش رات دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک اونگھ رہی تھی۔ نہ موٹر گاڑیاں، نہ لوگوں کا ہجوم، کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سڑکیں صدیوں سے یونہی ویران پڑی ہیں جیسے ان پر کوئی چلتا ہی نہ ہو، کوئی بھی تعاقب میں نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر بڑے شہروں میں کون کسے پوچھتا ہے۔ اپنے آپ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ خواہشات کے چکر نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ اسی گلی سے کتوں کے لڑنے کی آواز آئی، میرے کان کھڑے ہو گئے لیکن وہ تو آپس میں لڑ رہے تھے، بالکل انسانوں کی طرح۔ یوٹیلٹی سٹور اور دوسری بلڈنگیں سکوت کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھڑکیوں کے پٹ ادھ کھلے تھے اور زیرو پاور کے بلب جلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لوگ اپنے آپ سے راہِ فرار اختیار کر کے نیند میں نہ جانے کن جہانوں کے سفر میں بھٹک رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا کسی کو کیا پڑی ہے کہ میرے دروازے تک آئے۔

لیکن رات کہیں خوابوں کے چکر میں ذعلق ہے تو کہیں خواب نہ دیکھنے کی ضد میں آنکھوں ہی آنکھوں میں تحقی ہے۔ اگر کوئی سویا ہی نہ ہو جاگ رہا ہو یا سو کر بھی بیدار ہو؟ کچھ لوگ سو سکتے ہیں نہ جاگ سکتے ہیں۔ خوشی اور غم سے بے تعلق ہو کے اندھیرے اجالے میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے شاید کوئی ایسا شخص...

کسی کے دیکھے جانے کے خوف سے۔ میں پھر کانپ اٹھا، کپکپی آ گئی مجھے۔ اندیشے ایک بار پھر سانپ بن کر چاروں طرف پھنکارنے لگے۔ احساس کا الاؤ جو دہکا تو ہتھکڑی جیل اور پھانسی کا پھندہ گلے میں کسنے لگا۔ میں خود اپنے خیالوں سے ٹکرانے لگا۔ اس ساعت میں اپنے آپ میں نہ رہنا چاہتا تھا۔ کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ماضی کی کوئی حسین یاد، کوئی پُرمسرت لمحہ، عورت کا قرب، نیوں کی پنکھڑیاں، کمر کا لوچ، بازوؤں کی ملائمت، کہیں نرم نرم جذبات حقیقت کی بھٹی میں بھاپ بن کر اڑنے لگے۔ موجودہ لمحے نے مجھ کو اپنے میں گھسیٹ لیا۔ اپنے خوبصورت آرام دہ ڈرائنگ روم میں ہوتے ہوئے بھی مجھے یوں لگا جیسے میں چلچلاتی دھوپ میں آبلہ پا کھڑا ہوں اور نس نس سے خون بہہ رہا ہو۔ ہر لمحہ میرے احساس کو ڈوب ڈوب کرنے لگا۔

میں پھر اٹھا اور دروازے میں لگے تالے کو گھما کر دیکھا کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر ایک بار پھر برابر کیے۔ کہیں کوئی روزن نہ رہ گیا ہو۔ میں آہستہ آہستہ قدموں سے کھڑکی کے پاس گیا۔ پٹ کھول کر باہر کی جانب دیکھا تھوڑا سا جھکا سرد ہوا کے جھونکے سے میرا جسم کپکپا اٹھا لیکن حال کے اندر کی تپش بڑھنے لگی۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر اوپر نظر ڈالی آسمان پر تارے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی اور کچھ چہل پہل نظر آئی۔ دودھ سے بھری موٹریں سڑک سے گزریں۔ روشنی دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

تحمل

تحمل طاقت کی سب سے بڑی علامت ہے۔ بدلہ لینے کی آرزو کمزوری کی پہلی نشانی ہے اور معاف کر دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔

(نبیلہ نازش راؤ)

''ہاں ہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کسی نے نہیں دیکھا مجھے''۔ میں نے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ ہر کام بخیر و خوبی ہو گیا لیکن کھڑکی کے پٹ سے باہر دیکھتے جیسے ہی میری نگاہ پلٹی تو کمرے میں کوئی مجھے کھڑا نظر آیا خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

''کون؟'' بڑی مشکل سے میرے نرخرے سے آواز نکلی۔ خشک گلے سے میں نے بمشکل آواز نکالی۔ ''کون؟'' لیکن پھر بھی کوئی آواز جواب میں نہیں ابھری۔ خوف کی لہر میرے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ دہشت سے میری آنکھیں پھٹنے لگیں۔ پھر ان پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور پتھر کے مجسمہ کی طرح دم بخود رہ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ میں خود تھا لیکن آج میں ہزاروں کی بھیڑ میں بھرے پرے بازار میں جیتی جاگتی شاہراہوں پر کھلے آسمان کے نیچے بارونق بستیوں کے بیچ جس کو جب چاہتا ہوں قتل کر دیتا ہوں اور کوئی مجھے نہیں دیکھتا، میں روشن دان کھول کر کھڑکیوں کے پٹ ہٹا کر۔ پردے سرکا کر تلاش کرتا ہوں کہ کوئی تو ایسا مل جائے جس نے مجھے قتل کرتے دیکھا ہو۔

مگر کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر طرف سناٹا ہے اور میرے اطراف کے تمام لوگ مر چکے ہیں۔ جب اپنے اطراف کے سارے کے سارے لوگ مر جائیں تو انسان کس قدر اکیلا ہو جاتا ہے۔

OOO

جگ بیتی

ہمارے معاشرے کے مہذب ڈاکوؤں کی شرمناک داستان

"بابا آنکھیں بند کر لے اگر اپنی غریبی کا انجام آنکھوں سے دیکھے گا تو کلیجہ پھٹ جائے گا"۔

0314-4652230

قسط:2

ستارہ نے چہرہ نقاب کر لیا۔ اس کے شوہر نے میری طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ میرے چہرے پر تحسین اور آسودگی نے ڈیرے جما لئے تھے۔ چند ساعتیں اسی طرح گزر گئیں۔ پھر میں نے لب کشائی کی اور خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے ستارہ سے پوچھا۔

"ستارہ پھر تمہاری ماما کا کیا بنا؟"

"ہاں، بھائی جان! میں نے ماما سے کہا اب آپ بہت جلد اپنے گھر ہوں گی"۔

"نہیں بیٹا! ابھی تمہارے پاپا ایسا نہیں چاہتے"۔

"لیکن ماما! میں ایسا چاہتی ہوں"۔ میں نے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔ "بس آپ فالفٹ ہیڈ لائنز سنا دیں تاکہ میں مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکوں ... ماما نے جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا:

ایک کاروباری میٹنگ میں شہر کے صنعتکار جمع تھے حکومت کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گئے تھے۔ اس میٹنگ میں میں بھی شامل تھی وہاں میں نے تمہارے پاپا وقار عظیم کو دیکھا، وجیہہ شخصیت کے مالک، کھلتا رنگ، منہ پر خوبصورت داڑھی، ٹھوڑی پر سفید بالوں کی دو باریک قطاریں، ناک کی بین سیدھ میں سر کی مانگ، سفید براق شلوار قمیص میں ملبوس جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو لہجے کی شیرینی سے سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنے مطالبات حکومت کو پیش کئے جو متفقہ طور پر سب نے منظور کر لئے۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم باہر نکل آئے۔

"ذرا سنئے، محترمہ!" میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے والی تھی کہ ایک مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات کروں؟"

"جی، ضرور کریں"۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اس میں برا منانے والی کون سی بات ہے؟"

"محترمہ! اگر آپ کی اجازت ہو تو آپ کا نام لے کر آپ کو پکار سکتا ہوں؟"

"آپ میرا نام جانتے ہیں؟"

"جی، آپ کا نام حنا ہے؟" انہوں نے کہا۔ "آپ کے والد قتل ہو گئے تھے اور آپ گینگ ریپ کا شکار ہوئی تھیں، اسی وجہ سے آپ کے منگیتر نے منگنی توڑ دی ہے"۔

"جی، آپ نے ٹھیک کہا ہے"۔ میں نے کہا۔

"اگر آپ کی خواہش ہو تو میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ انہوں نے کہا۔ "میرا نام وقار عظیم ہے میری اہلیہ فوت ہو گئی ہیں اور میری ایک جوان بیٹی ہے ستارہ۔ اگر آپ نہ چاہیں تو آپ کو مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر دوسری صورت ہو تو میں بھی آپ سے بے وفائی نہیں کروں گا۔ یہ ہے میرا کارڈ آپ اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہاں یا نہ میں جواب دے دیجئے۔ اچھا خدا حافظ۔ ادھر زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں ہے"۔

ستارہ بیٹا! تمہارے پاپا سے پہلے ہی کافی متاثر ہو چکی تھی ان کی پیشکش نے میرے دل کے تار ہلا دیئے، مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شک وہ مجھ سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے لیکن ادھر مجھے جو داغ لگ چکا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کسی مرد کا مجھے قبول کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ میں گھر آ گئی، میرے دل میں تمہارے پاپا کی محبت سما گئی تھی۔ میں نے محبت کی نہیں تھی مجھے محبت ہو گئی تھی۔ ماما نے تھوڑا سا مسکراتے ہوئے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"بس پھر چل سو چل میں نے تمہارے پاپا کا نمبر ڈائل کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ وعلیکم السلام، تمہارے پاپا کی خوشی سے بھرپور آواز میری سماعت سے ٹکرائی حنا کیسی ہو؟

"بالکل ٹھیک"۔ میں نے بڑی ہی اپنائیت سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم نے میری پیشکش کو قبول کر لیا ہے"۔ انہوں نے باوثوق لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیوں یقین ہے؟"

"اس لئے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"۔

ماما نے ایک مرتبہ پھر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"نہیں، وقار صاحب!" میں نے انہیں کہا۔ "میں نے آپ کو اس لئے فون کیا ہے کہ میرا شادی کا کوئی پروگرام نہیں ہے، خصوصاً آپ سے"۔

"دیکھو حنا میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی وجہ؟"

"میرا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے"۔ میں نے بتایا۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے"۔ انہوں نے انتہائی مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "یہ ڈر میرے ذہن میں تھا کہ میں عمر رسیدہ اور ایک جوان بچی کا باپ ہوں"۔

"نہیں وقار صاحب! جوان بچی اور عمر کا مسئلہ نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ "میں کون سی سولہ سالہ نوجوان لڑکی ہوں، میری عمر پینتیس سال ہے"۔

"پھر کون سا مسئلہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ ایک معزز، دیندار، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور خوف خدا رکھنے والے انسان ہیں"۔ میں نے صاف گوئی کی۔ "مگر میں گنہگار، معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی ایسی لڑکی ہوں جس کی عزت وعصمت کا آبدار موتی لٹ چکا ہے"۔ یہ کہتے کہتے میری ہچکیاں بندھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

"میری آنکھوں کے سامنے وہ رات گھوم گئی ایک کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی اور دوسرے کمرے میں ظالم وحشی درندے سے میرے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کر رہے تھے میں اعصابی طور پر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی میں بُری طرح چونک گئی ریسیور کو کان سے لگایا تو میری توقع کے عین مطابق تمہارے پاپا ہی کا فون تھا۔

"دیکھو حنا! جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ نہایت ہی قابل افسوس ہے"۔ انہوں نے کہا۔ "لیکن تم تو پاک ہو فرشتوں کی طرح تم جیسی لٹی ہوئی عزت والی لڑکی پر سینکڑوں باعزت وعصمت لڑکیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ مجھے قسم ہے رب جلیل کے تقدس کی، میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں کہ تم گنہگار ہو۔ رہا معاشرے کے ٹھکرانے کا سوال تو پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ہاں البتہ اگر تمہیں مجھ میں کوئی کمی محسوس ہوئی ہے تو پھر تم حق بجانب ہو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں"۔ اور پھر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں نے بار بار نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کیا لیکن کوئی غیر مرئی طاقت مجھے روک دیتی تھی مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ آخر میں نے قلم سنبھالا اور ایک طویل محبت نامہ انہیں لکھا۔ میں نے وہ باتیں بھی لکھ دیں جو میرا انہیں خیال میں فون پر ان سے کرپاتی۔ یوں کئی ماہ تک ہماری خط وکتابت جاری رہی، بالمشافہ بھی ایک دو ملاقاتیں ہوئیں اور پھر ہم نے اس شرط پر نکاح کر لیا کہ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی رخصتی کو موخر کر دیا جائے گا۔

میں جذباتی ہو گئی تھی، میں نے ماما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرط جذبات سے آنکھوں سے لگا کر چوم لیا اور پھر وثوق سے کہا ماما پہلے آپ کی رخصتی ہو گی پھر میری شادی۔

"لیکن بیٹا تمہارے پاپا یہ فیصلہ کر چکے ہیں"۔

"پاپا سے میں خود منت لوں گی"۔ میں نے کہا۔ "یہ

آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے"۔

چھپے رستم

میں واپس گھر آ گئی، عشا کی نماز اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے پاپا کے دروازے پر دستک دی۔

"بیٹا! اندر آ جائیں"۔ پاپا کی آواز آئی۔

میں اندر داخل ہوئی تو پاپا حسب معمول پلنگ سے نیچے اتر آئے اور دونوں بازوؤں میں بھر کر کہنے لگے، بیٹا پارٹی کیسی رہی؟

"پاپا! ایک دم شاندار"۔

"میری بات یاد ہے ناں؟"

"پاپا! کون سی؟"

"بھول گئی، میں نے تمہیں کہا تھا کہ اپنی سہیلیوں کو جوابی پارٹی بھی دینی ہو گی"۔

"ہاں، پاپا! کیوں نہیں میں بہت جلد ایک خوبصورت فنکشن کا اہتمام کروں گی"۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ایک دو دن پہلے مجھے بتا دینا"۔

"ایسا ہی کروں گی پاپا!"

"تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں ہماری بیٹی کے تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟"

"وہ پاپا! دراصل میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں"۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں آئیں تشریف رکھیں"۔

پاپا! محبت پدری سے بچھے جا رہے تھے لیکن میری طبیعت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ میں جو اپنے کمرے سے ایک مصمم ارادہ لے کر چلی تھی۔ پاپا کے رعب اور فطری حیا نے متزلزل کر دیا تھا پھر میں نے ایک آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا۔ جس کی برکت سے میرے ارادے میں پختگی پیدا ہو گئی اور پھر میری زبان پر الفاظ بکھرنے لگے۔

"پاپا! آپ شادی کر لیں"۔ میں نے نظریں جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔ میرے اندازے کے برعکس پاپا نے زور کا قہقہہ لگایا اور میری ٹھوڑی پکڑ کر میرا منہ اوپر اٹھایا، میں نے شدت حیا سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ستارہ بیٹا! یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟"

"پاپا! آپ کی تنہائی سے"۔

"لیکن میں تنہا نہیں ہوں، میری ستارہ میرے پاس موجود ہے"۔

"لیکن پاپا! میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی جب تک آپ شادی نہ کر لیں اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے"۔

"اچھا، بیٹا! ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں شادی کر لوں گا لیکن میری شرط یہ ہے کہ پہلے تمہاری شادی ہو گی..... مجھے یاد آیا اس لڑکے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"پاپا میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا"۔

"دیکھو، ستارہ! میرے خیال میں وہ لڑکا تمہیں سوٹ کرتا ہے بڑے باپ کا بیٹا ہے، اپنے باپ کی جائداد کا واحد وارث، ہینڈسم خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے"۔

"ٹھیک ہے، پاپا! اس پر بعد میں بات ہو گی میری ضد کو تو آپ جانتے ہی ہیں میں نے کہہ دیا ناں پہلے آپ کی شادی ہو گی بعد میں میری"۔

"لیکن مجھ سے شادی کون کرے گی بیٹا! میں عمر رسیدہ ہو گیا ہوں"۔

"نہیں، پاپا! آپ بوڑھے تو نہیں ہوئے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے لئے ایک ہمدرد کی تلاش کر سکتی ہوں بلکہ سچ پوچھیں تو میں نے تلاش کر لی ہے"۔

کون ہے وہ اور کہاں ہے؟" پاپا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ایک سرمایہ دار باپ کی بیٹی ہے اور اسی شہر میں

رہتی ہے"۔ میں نے کہا۔ "اس کا نام حنا ہے، وہ ایک ناقابل بیان اذیت سے گزر چکی ہے اور ابھی صرف پینتیس سال کی ہے تعلیم یافتہ اور خوبصورت بھی ہیں"۔

میرے پاپا یکدم چونکے لیکن پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگے۔

"کیا وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گی؟"

"ہاں، پاپا! سو فیصد اس کی میں گارنٹی دیتی ہوں"۔

"کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"ہاں، پاپا! وہ میری اچھی دوست ہیں"۔

"کبھی ملاقات ہوئی؟"

"ہاں، پاپا! ابھی آج ہی مجھ سے ملی ہیں"۔

"لیکن ہم نے تو یہ بات صیغہ راز میں.... میرا مطلب ہے وہ تم سے کیسے ملی کہاں ملی؟" پاپا بے خیالی میں بہک چلے تھے کہ اچانک بات کا رخ بدل دیا۔

میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا میں بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

"پاپا! کون سی بات صیغہ راز میں....."

"دیکھو ستارہ! دراصل بات یہ ہے کہ میرا خیال کہیں اور چلا گیا تھا"۔

"چلو، کوئی بات نہیں پاپا اصل بات یہ ہے کہ آپ تو چھپے رستم نکلے۔"

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟" پاپا بدحواس ہو گئے تھے۔

"لیکن پاپا! اگر اس راز میں مجھے بھی شامل کر لیتے تو واللہ قسم مزہ آ جاتا"۔

پاپا مزید سٹپٹا گئے۔ "کون سا راز ستارہ بیٹا؟"

"بتادوں گی اتنی بھی کیا جلدی ہے"۔ اور میں پاپا کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

مجھے پتہ تھا اب کیا ہو گا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن میرے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کافی دیر بعد پاپا کا دروازہ کھلا پھر مجھے قدموں کی آواز آئی پاپا میرے کمرے تک آئے ہاتھوں سے دروازے کو دھکیل کر پوری طرح تسلی کی دروازہ اندر سے بند تھا۔ پھر دبے قدموں واپس اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے آہستگی اور احتیاط سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں پاپا کے کمرے تک پہنچ گئی اور کواڑ سے کان لگا دیئے۔ پاپا نے نمبر ڈائل کیا اور پھر مجھے پاپا کی دھیمی آواز آئی۔

"ہیلو حنا! میں وقار عظیم بول رہا ہوں"۔ پاپا نے رازدارانہ آواز میں کہا۔ "حنا! میرا خیال ہے ستارہ کو ہماری شادی کا علم ہو گیا ہے"۔ دوسری طرف سے کافی لمبی بات چلتی رہی پھر پاپا کی آواز آئی۔

"ہاں، حنا! میرا اسٹل اور تمہارے خطوط اور تمہاری دو عدد فوٹو میری الماری میں تھے۔ اس دن میں دروازہ لاک کرنا بھول گیا تھا اس کا مطلب ہے کہ ستارہ نے ہماری چوری پکڑ لی ہے"۔ پاپا پھر کچھ دیر خاموش رہے۔ شاید ماما انہیں مزید تفصیل بتا رہی تھیں۔ پھر پاپا کی آواز آئی ٹھیک ہے حنا اب ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا ویسے تم چھوٹی موٹی تیاری کر لو، اچھا خدا حافظ!"

میں جلدی اور احتیاط سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ میرے خیال سے ماما نے پوری بات تفصیل سے پاپا کو بتادی ہو گی۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر تلاوت قرآن میں مصروف تھی کہ پاپا نے میرے دروازے پر دستک دی، میں نے جلدی سے قرآن حکیم کو بند کیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پاپا! تشریف لائیں میں آپ کی ہی منتظر تھی"۔

پاپا مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

"او شرارتی لڑکی تمہیں انٹیلی جنس میں ہونا چاہیے تھا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہم شام سے پہلے تمہاری ماما کو لے آنا چاہتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے پاپا! میں تیار ہوں"۔ میں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

ستارہ کی بات جاری تھی کہ میری بیگم نے مجھے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ دسترخوان لگا دیا گیا۔ کدو گوشت کے ساتھ تندور کی پیلے پور کی روٹیاں، پوٹوں کی بنی سویاں اور چاٹی کی ٹھنڈی لسی ان دنوں گاؤں میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی اور فریج وغیرہ ابھی شہروں میں بھی زیادہ متعارف نہیں ہوئے تھے لیکن میں قریبی قصبے سے برف منگا کر کولر میں محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ ستارہ اور صاحب بہادر نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ستارہ کہنے لگی بھائی جان مکھن لسی کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔ بھابی سے کہہ دینا کہ میں ذرا ٹھہر کر اور لسی پیوں گی۔ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مشورہ دیا کہ صاحب بہادر کو بھی ساتھ شامل کر لو۔

خطرناک دورہ

ظہر کی نماز پڑھ کر میں گھر واپس آیا تو کمرے میں خوفناک منظر دیکھ کر میں ٹھٹک سا گیا۔ صاحب بہادر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے اور چارپائی سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ ان کے پورے جسم پر تشنج تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے ابلے ہوئے تھے اور ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا، ستارہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ستارہ! انہیں کیا ہوا؟" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بھائی جان! اسی وجہ سے میں ان کو لے کر آپ کے پاس آئی ہوں"۔ ستارہ نے کہا۔ "انہیں اسی قسم کے شدید دورے پڑتے ہیں، یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ کی موجودگی میں انہیں دورہ پڑ گیا، آپ اچھی طرح سے چیک کر سکیں گے"۔

"آپ پیچھے ہٹ جائیں"۔ میں نے ستارہ سے کہا اور پھر اپنے انداز میں قرآن مجید کی مختلف آیات اور مسنون دعائیں پڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد انہیں کچھ افاقہ ہوا اور پھر نصف گھنٹے بعد ان کی طبیعت بحال ہو گئی۔ میں نے ان سے مختلف سوال کئے اور پھر ستارہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو ستارہ انہیں آسیب وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ دراصل یہ مرگی کے مریض ہیں۔

"بھائی جان! مجھے آپ پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ ہے لیکن پھر بھی آپ مزید تسلی کر لیں"۔

"میں نے پوری تسلی کر لی ہے"۔ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

چند انتہائی ضروری باتیں

یاد رہے کہ دورے کئی طرح کے اور کئی اسباب سے پڑتے ہیں میڈیکل سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر بعض دفعہ زبردست الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کو جو دورے پڑتے ہیں حکیم لوگ اس بیماری کو "اُم الصبیان" کہتے ہیں۔ بعض مریضوں کو سوتے میں دورہ پڑ جاتا ہے، اسے کابوس کا نام دیا گیا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو جو دورے پڑتے ہیں انہیں اختناق الرحم کا مرض کہا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں میں بعض دفعہ پیٹ کے کیڑوں کی وجہ سے بھی دورے پڑ سکتے ہیں اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان اور حکماء اس پر مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔ میں جو بات آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دوروں کے مذکورہ مریضوں کو عام لوگ زیادہ تر عاملوں کے پاس ہی لے جاتے ہیں ان کے خیال میں انہیں آسیب کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کیونکہ ان دوروں میں عموماً مریض ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو آسیب زدہ سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ خصوصاً مرگی اور

اختناق الرحم کے دورہ میں۔ مثلاً اختناق الرحم (ہسٹریا) کی مریضہ لڑکیاں کپڑے پھاڑ دیتی ہیں، شور و غل مچاتی ہیں، بعض دفعہ گھر کے لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتی ہیں، کبھی رونے لگتی ہیں، کبھی ہنسنے لگتی ہیں وغیرہ۔ ظاہری علامات دیکھ کر گھر والے سمجھتے ہیں کہ اسے جن لگ گیا ہے اور پھر وہ عاملوں سے رجوع کرتے ہیں جن میں بیشتر نوے فیصد مکار، جھوٹے، ان پڑھ، بے سمجھ، فراڈیے اور اپنے فن سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ اس طرح پیسہ بھی برباد کرتے ہیں اور بعض دفعہ عزت بھی اور بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

کئی عامل حضرات مریضہ مظلومہ پر بلاوجہ تشدد کرتے ہیں وہ بیماری مزید پریشان ہو جاتی ہے۔ مزید معلومات کے لئے میری کہانی "کالے شاہ" ضرور پڑھیں۔ خوف خدا رکھنے والے عامل حضرات سے میری گزارش ہو گی کہ خدارا! پہلے تشخیص تو صحیح کریں کہ آیا مریض واقعی آسیب زدہ ہے یا کسی بیماری میں مبتلا ہے ورنہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس دن سخت بازپرس ہو گی اور کوئی بدلہ، رشوت اور سفارش کام نہیں آئے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (سورۃ البقرہ)

جہالت کی مثال

ہمارے قریبی گاؤں کے ایک دس بارہ سالہ لڑکے کو بخار کی شدت کی وجہ سے دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عام لوگ ایسے حالات میں یہی سمجھتے ہیں کہ آسیب کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے چنانچہ وہ اسے میرے پاس لے کر آئے۔ میں اس دن کسی ضروری کام سے گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔ انہیں کسی نے ایک عامل کا پتہ بتایا جو گوجرانوالہ میں رہتا تھا، وہ بچے کو لے کر گوجرانوالہ چلے گئے۔ لاری اڈا پر میری اور ان کی ملاقات ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے بلکہ بعض نے یہ بھی کہا کہ ہماری قسمت اچھی ہے جو آپ مل گئے ہیں ہم تو آپ کے گاؤں بھی گئے تھے لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے کہا بتائیں کیا مسئلہ ہے؟ کہنے لگے بچے کو سایہ ہو گیا ہے آئیں اور اسے دم کریں۔ میں نے بچے کو دیکھا تو وہ بخار سے جل رہا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ بچے کو سایہ وغیرہ نہیں ہے اسے تیز بخار ہے اور اسی وجہ سے اسے دورے پڑ رہے ہیں۔ آپ اسے جلدی سے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔

ایک عورت بولی۔ "نہیں جی اسے سائے کی وجہ سے بخار ہے"۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور بلند آواز سے کہا۔

"کیا تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو؟"

"توبہ جی آپ سے زیادہ تو میں نہیں جانتی پر..."

"پھر جو میں کہتا ہوں وہ کرو، پر کو چھوڑو"۔

دوسری نے اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور پھر اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "قاری صاحب یہ پکڑیں اور ہمارے بیٹے کو دیکھیں ہم مزید روپے بھی آپ کو دیں گے"۔

مجھے قوم کی جاہلیت پر رونا آ گیا۔ وقت کم تھا بچے کی جان کو خطرہ تھا۔ میں نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور خدائے پاک کی قسم اٹھا کے کہا۔ اسے جنات وغیرہ کی کوئی پکڑ نہیں ہے ٹھیک ہے۔

"قاری صاحب! جیسے آپ کی مرضی"۔ ایک مرد نے ان میں سے کہا۔

"دیکھو بھائی صاحب! اسے کسی عامل کے پاس لے کر مت جانا سیدھے ہسپتال چلے جاؤ"۔

"ٹھیک ہے قاری صاحب!" انہوں نے کہا۔ میں ذرا مطمئن ہو کر اپنے کام پر چلا گیا جب میں کام سے فارغ ہو کر دوبارہ اڈے پر آیا تو یہ جان کر سخت افسوس ہوا کہ لڑکا مر چکا تھا۔ دراصل انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا

اور وہ بجائے ڈاکٹر کے عامل کے پاس ہی گئے تھے، میرے پوچھنے پر ان میں سے ایک آدمی نے بتایا کہ عامل نے انہیں کہا تھا جس قاری نے تمہیں کہا ہے کہ اسے آسیب نہیں ہے وہ جھوٹا ہے اور پھر اس نے کاغذ کی بتیاں بنا کر ان پر دعا کر کے لپیٹ کر بچے کے ناک میں دھونی دی اور پھر اسی کے ذریعے پر ہی بچہ مرگیا۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جھوٹے عامل نے ان سے لی ہوئی بھاری فیس بھی واپس نہیں کی۔ دوسرا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ وہ لوگ چونکہ ہمارے قریب کے رہنے والے تھے وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گئے کہ قاری صاحب نے جان بوجھ کر ہمارے لڑکے کو دم وغیرہ نہیں کیا ورنہ ہمارا بچہ بچ جاتا۔

جناتی دورہ اور مرگی

چونکہ اکثر دورے کسی جسمانی مرض کی وجہ سے ہی پڑتے ہیں لیکن بعض دورے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق آسیب سے ہوتا ہے جن کی وضاحت میں کسی کہانی میں کر چکا ہوں۔ آج میں مختصر طور پر جناتی دورے اور مرگی وغیرہ کے دورے کی پہچان بتاتا ہوں جو عام لوگوں کے لئے بھی فائدہ مند ہوگی اور عامل حضرات کے لئے بھی۔

مرگی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ کا قول

یہ ایک ایسا مرض ہے جو اعضائے رئیسہ کو اپنی فطرتی حرکات پوری طرح ادا کرنے سے روک دیتی ہے اور اس کا سبب وہ غلیظ بخارات بنتے ہیں جو معدہ سے نکل کر دماغ کی نالیوں کو آلودہ کر دیتے ہیں جن کے نتیجے میں اعضاء میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے پھر متاثرہ انسان نہ تو اپنی مرضی سے کھڑا ہو سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے بلکہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور رطوبات غلیظہ کی وجہ سے منہ سے جھاگ بہاتا ہے۔

جناتی مرگی

نقل وعقل کے ذریعہ جناتی مرگی کا وجود ایک حقیقت ثابت ہو چکا ہے اس کا انکار صرف ہٹ دھرم اور جاہل لوگ ہی کرتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے۔

(سورۃ البقرہ: 275)

امام القرطبی آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس آیت میں جنوں کے ذریعے آسیب زدگی کا انکار کرنے والوں کا رد بھی موجود ہے اور ان لوگوں کے انکار کی دلیل بھی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سب طبیعتوں کا فعل ہے، شیطان نہ انسان میں ہاتھ ڈالتا ہے نہ ہی اس کے چھونے سے کوئی آسیب زدہ ہوتا ہے۔

(تفسیر قرطبی جلد 3 صفحہ 355)

امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح جنون زدہ اپنے جنون اور شیطان کے خبطی بنا دینے کی حالت میں کھڑا ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد دوم صفحہ 326)

امام طبری اس آیت کی مراد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کے ذریعہ دنیا میں شیطان اس کو دیوانہ بنا دیتا ہے پس وہ اس کے چھونے سے جنون زدہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح قاضی بدرالدین شبلیؒ، امام ابن حزمؒ، امام ابن قیمؒ، عمرو بن عبیدؒ وغیرہ کبار علماء تفسیر اس آیت مبارکہ کا یہی معنی کرتے ہیں۔

لہٰذا اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جناتی مرگی کا وجود بھی ضرور ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے بخوف طوالت ان کو نوٹ کرنے سے قاصر ہوں سوائے چند معتزلہ کے مسلمانوں سے کوئی

بھی اس بات کا انکار نہیں کرتا اور اب تو جدید سائنس بھی اس کو ماننے پر مجبور ہے چنانچہ۔

امریکی سائنس دان کارنگٹن جو امریکہ میں ماہرین نفسیات کمیٹی کے اہم رکن ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''ظواہر الروحیہ الحدیثہ'' میں جناتی وجود کے متعلق لکھا ہے۔

کم از کم جناتی مرگی کو مان لیتے ہیں کوئی حرج نہیں کوئی عالم اس کے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ بڑے عجیب و غریب اور وحشت ناک نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جب معاملے کی اہمیت اتنی زیادہ ہو تو علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں صرف پیشہ وارانہ مہارت ہی اس چیز کی متقاضی نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مریض اس مرض کی گواہی دیتے ہیں ان کو شفایاب کرنے کے لئے اور ان کی صحیح اور فوری تشخیص کے لئے بھی یہ تحقیق ضروری ہے نیز جب ہم جنات کے انسانوں کے اندر جانے کی سہولت ثابت کر چکے ہیں تو ہمارے سامنے تحقیق کا بہت وسیع میدان موجود ہے۔

ڈاکٹر جیمس کہتے ہیں:

یہ حالت خلاف عادت ہے کوئی بیرونی نادیدہ شخصیت بیمار انسان کی عقل اور جسم پر کنٹرول کر لیتی ہے۔ لہٰذا جناتی مداخلت سے انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر کارل ویکلانڈ اور بعض دیگر ڈاکٹر یہ رائے رکھتے ہیں:

جناتی مرگی مریض پر کسی خبیث روح کے غلبے سے ظاہر ہوتی ہے جس سے اس کے دماغی اشارات و احکامات میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جریزے مینا پولس یونیورسٹی امریکہ میں اعصابی امراض کے استاد کہتے ہیں:

طب جدید جناتی مرگی کے علاج سے عاجز آ گئی

ہے جو ارواح خبیثہ کی مداخلت سے ظاہر ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر پیریز کو طب و جراحت کے شعبہ میں نوبل انعام مل چکا ہے۔

ڈاکٹر کیسس کاریل بھی ڈاکٹر پیریز کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد صباحی اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

جناتی مرگی زمینی ارواح خبیثہ کی کارستانی ہے لہٰذا اس کا علاج عالم علوی کی ارواح شریفہ کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے تاکہ وہ توفیق الٰہی سے ارواح خبیثہ کی ایذا کو مٹائیں اور ان کے اعمال باطلہ کو رد کریں۔

ڈاکٹر بل اپنی کتاب "تحلیل الحالات فی علاج العقول المریضہ" میں لکھتے ہیں:

ہمارے سامنے بے شمار مسائل ایسے پڑے ہیں جن پر تحقیق ضروری ہے اور وہ ہمارے ماتھے پر کلنک کا دھبہ ہیں۔ خصوصاً جناتی مرگی، کیونکہ یہی چیز نفسیاتی اور اعصابی امراض پیدا کرنے کا سبب ہے۔ گزشتہ زمانے میں جناتی مرگی کو معمولی مرض سمجھا جاتا تھا لیکن جدید تحقیق سے یہ سامنے آیا ہے یہ مرض غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہے اور مریض غیر مرئی مخلوق کے ساتھ عقلی اور ارادی طور پر ہی نہیں بلکہ بے شمار صفات میں مالوف ہو جاتا ہے اور وہ روحانی شخصیت جو ابتدا میں مریض انسان کے ساتھ ٹکراتی ہے عام طور پر دوسروں کے اشارات کا بہت کم مقابلہ کرتی ہے۔ اسی لئے ان لوگوں کے لئے یہی روحانی شخصیت جلدی معمول بن جاتی ہے جو کسی بھی انسان کے قریب ہونا چاہتے ہیں گو ابتدا میں محسوس نہیں ہوتا لیکن کچھ عرصے کے بعد مریض کی شخصیت کلی طور پر فنا ہو جاتی ہے تاہم جب روحانی مریض عجیب و غریب اقوال و افعال کے ساتھ جسمانی اطباء کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اسی لئے وہ اسے صرف حقارت اور استہزاء کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد صباحی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: مرگی عموماً دماغ کے اعصابی نظام میں اچانک گڑبڑ پیدا کرنے سے ظاہر ہوتی ہے جس سے دماغ کا احکام جاری کرنے والا سلسلہ ٹھپ ہو جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(1) عضوی تشنج: جب دماغ میں موجود کسی خاص عضو کو کنٹرول کرنے والا خلیہ متاثر ہو جائے تو مریض کا وہ عضو کلی طور پر شعور و احساس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا علاج طب جدید کے پاس ہے اور ڈاکٹر مختلف طریقوں سے اس کا علاج کر سکتے ہیں۔

(2) نفسیاتی تشنج: وقفہ وقفہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا مرکزی خلیات احساس میں گڑبڑ سے ہوتی ہے تاہم مریض کلی طور پر شعور و احساس گم نہیں کرتا اور ابتدا میں صرف جسم میں تبدیلی کا معمولی احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کی مرگی کا علاج قرآن و حدیث میں مذکور دعاؤں اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی مرگی کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔

غرضیکہ امام ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"بالجملہ جس کو علم، عقل اور معرفت میں سے تھوڑا سا حصہ بھی ملا ہے ان میں سے کوئی بھی جناتی مرگی اور اس کے علاج کا انکار نہیں کرتا، خبیث ارواح کا اکثر تسلط ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کے اندر دینداری کم ہو یا ان کے دل اور زبانیں حقائق ذکر، تعوذات، ایمانی اور نبوی تحصنات میں خراب واضح ہوئی ہوں۔

جناتی مرگی کی چند علامات

مریض کی آنکھوں کا بند ہو جانا، پتلیوں کا کسی طرف حد درجہ گھوم جانا، نگاہوں کا کسی ایک نکتہ پر جم جانا، سختی کے ساتھ ہاتھوں سے آنکھوں کو بند کرنا، آنکھوں کا انگاروں کی طرح سرخ ہو جانا، جسم میں شدید رعشہ اور کپکپاہٹ کی کیفیت پیدا ہونا، چیخنا، چلانا، پکارنا، رونا،

جنوں کا اپنا نام بتانا، شدید جھٹکے کھانا، منہ سے تھوک و رال اور ناک سے غلاظت کا نکلنا، بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے دورے پڑنا، ڈر کر چھپنا، اجنبی زبان میں باتیں کرنا، قدم سیدھے نہ پڑنا، ٹکریں مارنا، بالوں کو نوچنا، کپڑے پھاڑنا، مرد مریض کا عورت کی طرح بولنا اسی طرح اگر مریضہ عورت ہو تو مرد کی طرح بولنا، بچہ یا جانور کی زبان میں بولنا اور بدن کا غیر متوازن ہو جانا وغیرہ۔

میرا تجزیہ

میرے خیال میں مندرجہ بالا علامات میں سے بعض مرگی کے عضوی تشنج والے مریض کو بھی ہو سکتی ہیں لہٰذا محض ان علامات سے جناتی مرگی کا فتویٰ نہیں لگا دینا چاہئے چونکہ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے اس لئے عامل حضرات کو خوب غور و خوض کے بعد ہی کوئی رائے دینی چاہئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اپنی زندگی میں چند ہی ایسے مریض میں نے دیکھے ہیں جو جناتی مرگی میں مبتلا تھے اور اللہ کے فضل سے عملیات کے ذریعے بالکل ٹھیک ہو گئے تھے لیکن اکثر مریض کسی طبی بیماری میں ہی مبتلا ہوتے تھے جنہیں میں ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جانے کا مشورہ دے دیا کرتا تھا۔ بعض ڈاکٹر صاحبان جناتی مرگی کے بالکل ہی قائل نہیں انہیں بھی یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہئے کہ جدید سائنس اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ میڈیکل سائنس سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر صاحبان کو تو کوئی مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن عامل حضرات کو ضرور عرض کروں گا کہ ہر دورے کو جناتی دورہ ہی تصور نہ کر لیا کریں بلکہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کئی بیماریاں ایسی ہیں جن سے دورے پڑ سکتے ہیں۔

پہچان کیسے کی جائے

اب مسئلہ یہ ہے کہ پہچان کیسے کی جائے کہ جناتی دورہ ہے یا کسی طبی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے؟ یوں تو کئی وجوہات سے پتہ چلایا جا سکتا ہے لیکن ایک حتمی پہچان بتا دیتا ہوں۔ اگر کسی مریض کو اس قسم کا دورہ آپ کے سامنے پڑ جائے تو مریض کے کان میں اذان پڑھیں اور قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کریں۔ خصوصاً سورہ بقرہ کا پہلا اور آخری رکوع اور چند دوسری آیات جو پیچھے کہیں میں نوٹ کر چکا ہوں۔ اگر دورہ تیز ہو جائے اور آسیب بولنا شروع کر دے تو سمجھ لیں کہ جناتی مرگی ہے اور اگر کوئی ردعمل نہ ہو تو سمجھ لیں کہ بیماری ہے یہ ایک سادہ سی بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی خداداد صلاحیت سے بھی کام لیں اگر آپ کی نیت ٹھیک ہو گی تو خدا تعالیٰ بھی سیدھا راستہ دکھا دیں گے لیکن اس کے باوجود بھی اگر مریض کوئی دوائی استعمال کر رہا ہے تو اسے دوائی سے مت روکیں اور یہ میں ان عامل حضرات سے عرض کر رہا ہوں جو اس بارے میں سوجھ بوجھ رکھتے ہیں جعلی عامل کے تو پاس پھٹکنا بھی نہیں چاہئے۔

ستارہ پریشان ہو گئی

ستارہ نے صاحب بہادر کے لباس کو ٹھیک کیا اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی کہ بھائی جان اب کیا ہو گا؟

"دیکھو ستارہ! یہ کام میرے متعلقہ نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ "لیکن میرے پاس آنے کا ایک فائدہ تو تمہیں ہو گیا کہ تمہارا وہم نکل گیا"۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے"۔ اس نے میرے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"باقی رہا علاج کا معاملہ تو وہ بھی ہو جائے گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرما دیں گے"۔ میں نے کہا۔ "ہم ابھی ایک حکیم صاحب کے پاس جائیں گے میرے اچھے دوست ہیں اور امراض دماغی کے ماہر ہیں۔

ویسے ان کو یہ بیماری کتنے عرصے سے ہے؟"
"تقریباً چار سال ہوگئے ہیں"۔
"کوئی علاج وغیرہ؟"
"ہاں، جی بہت بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھا چکی ہوں"۔ ستارہ نے بتایا۔"اب امریکہ جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ حضرت صاحب کے مشورے سے آپ کو دکھانے لے آئی ہوں"۔

صاحب بہادر کی طبیعت اب کافی بہتر ہو چکی تھی اور ستارہ بھی اپنے آپ پر کنٹرول کر چکی تھی ویسے بھی وہ کافی مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ ہم گاڑی میں سوار ہوئے اور ایک گھنٹہ بعد حکیم صاحب کے مطب پہنچ گئے۔ چار بج چکے تھے۔ حکیم صاحب مطب بند کر کے گھر چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں پیغام بھیجا تو وہ تشریف لے آئے علیک سلیک کے بعد میں نے تفصیل سے مریض کے متعلق بتایا انہوں نے مختلف سوال کیے جن کے جوابات کچھ میں نے اور کچھ ستارہ نے دیے۔ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا کہ ان شاء اللہ آج کے بعد دورہ نہیں ہوگا لیکن علاج کم از کم تین سے چھ ماہ تک کرانا ہوگا۔

ٹھیک ہے ستارہ نے بڑے اعتماد لہجے میں کہا۔

پہلے مرحلے میں پندرہ دن کی دوائی دی گئی اور پھر حکیم صاحب نے پوچھا آپ کا ان سے کیا تعلق ہے۔
میں نے کہا یہ میرے بہنوئی ہیں۔
"لیکن آپ کی تو کوئی بہن نہیں ہے"۔
"ہاں یہ میری منہ بولی بہن ہیں"۔ میں نے ستارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حکیم صاحب دوائی کا ہدیہ کیا ہے"۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہنس کر کہنے لگے کہ قاری صاحب اگر برابر برابر میں بھی چھوٹ جائیں تو بڑی بات ہے۔

"حکیم صاحب! یہ غلط بات ہے اس کا مطلب ہے کہ آئندہ کوئی مریض آپ کے پاس لے کر نہ آیا کروں"۔
"چلو! ایک بات پر اتفاق کر لیتے ہیں"۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "آئندہ ہدیہ لے لیا کروں گا اور اس دفعہ آپ ضد نہ کریں۔ ہاں ایک ضروری بات آج رات ختم نبوت کانفرنس ہو رہی تھی"۔
"اچھا، کون صاحب تشریف لا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ مقررین میں ایک صاحب میرے پسندیدہ خطباء میں سے تھے لیکن مہمانوں کی مجبوری کی وجہ سے میں انہیں سن نہ سکا۔ ستارہ کہنے لگی۔ بھائی صاحب! اگر اجازت دیں تو ہم واپس چلے جائیں۔
نہیں ابھی نہیں اجازت نہیں دوں گا"۔ میں نے کہا۔ کیونکہ ان کا سفر کم از کم چار گھنٹے کا تھا اور شام ہو رہی تھی ان دنوں میں شام کے بعد ٹریفک کا سلسلہ ختم ہو جایا کرتا تھا ہم واپس گاؤں پہنچ گئے۔

دیہاتی ماحول

ان دنوں دیہات اور شہر کے ماحول میں کافی فرق تھا آج کل یہ فرق اگر بالکل نہیں مٹا تب بھی بہت کم ہو گیا ہے اور اب تو پنڈوں میں بھی پینڈو نہیں ملتے اُس وقت پنڈوں میں پینڈو اور شہروں میں شہری بابو ہوا کرتے تھے لیکن آج پینڈو اور شہری کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔ کچے مکانوں کی جگہ سربفلک عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ پکی رابطہ سڑکیں اور پختہ گلیاں بن چکی ہیں۔ بجلی اور بعض دیہات میں گیس کی سہولت بھی موجود ہے۔ بچوں اور بچیوں میں تعلیم کا ذوق بھی ہے۔ ٹی وی نیٹ وغیرہ بھی چل رہے ہیں۔ دیہات کا کسان اب بجائے ہاتھوں کے زیادہ تر کام جدید مشینری سے لے رہا ہے اور جفاکشی چھوڑ کر تن آسانی اپنا چکا ہے یہی وجہ ہے کہ تبخیر معدہ اور دل کے

امراض دیہاتیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ کبڈی اور کشتی کی جگہ کرکٹ نے لے لی ہے اور اب لونگ کے لشکارے سے ہالی ہل نہیں چھوڑتے اور نہ کوئی مٹیار سر پر بھتہ رکھ کر کھیتوں میں دیوی داور شن اور نہ دنیوں کا بیوپار کرتی ہے۔ نہ کسی کو کانٹا چبھتا ہے نہ کوئی نکالنے کے بہانے پاؤں کو اپنے گھٹنے پر رکھتا ہے، نہ کوئی کپاس چننے جاتی ہے نہ کسی کو سانپ ڈستا ہے۔ چھنے اور چوری بھی قصہ پارینہ بن چکے ہیں، نہ لکن میٹی ہوتی ہے نہ شکوہ کرنے کا بہانہ، نہ دوہڑے نہ ماہیا، نہ مرزے کی نیلی کی داستان، نہ ہیر ڈولی چڑھتی ہے نہ ٹیکی ہے، سسی کا تھل اور پنوں کا اونٹ بھی عنقا ہے، مگر یہ نہ سمجھنا کہ اب کچھ ہوتا ہی نہیں، سب کچھ ہوتا ہے بس ذرا انداز بدل گیا ہے۔ "ککلی کلیر دی پگ میرے ویر دی" کی جگہ "چج بتا بن بچ" نے لے لی ہے اور یہ تبدیلی صرف پچیس تیس سال میں آئی ہے البتہ ابھی کافی دیہات جدید سہولیات سے بہرہ مند نہیں ہوئے ان کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت دیہاتی زندگی اور شہری زندگی میں کافی فرق تھا۔ رات کو مکانوں کی چھت کے اوپر چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ کیونکہ نیچے صحن میں کافی گرمی ہوتی تھی۔ مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے اور تمام لوگ چھتوں پر خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تھے، ستارہ اور صاحب بہادر نے جب یہ منظر دیکھا تو ان پر ایک طلسماتی کیفیت طاری ہوگئی۔ مکمل چاند کی روشنی نے ماحول کو چاندی کی چادر لپٹا دی تھی اور پرے کی ٹھنڈی ہوا جسم سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گیدڑ اپنی آواز میں بولتا تو کتے جواباً بھونکنے لگتے، قریبی مکانوں کی چھتوں سے خوش باش اور ٹینشن سے ناواقف لوگوں کے قہقہے سنائی دیتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس بستی کے باسیوں کا غم واندوہ سے کوئی ناطہ نہیں ہے۔

"ہائے اللہ، بھائی جان! چاند کی روشنی اتنی مسحور کن بھی ہوسکتی ہے"۔ ستارہ بے اختیار بول اٹھی"۔ شہر میں تو ہمیں چاند کی روشنی کبھی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی اور مصنوعی ہوا سے یہ قدرتی ہوا اور کھلا ماحول تو عجیب نعمت ہے"۔ ستارہ نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

کھانے سے پہلے دیہات کے خاص مشروب مکھی لسی سے ان کی تواضع کی گئی جو چینی سے میٹھی کی گئی تھی۔ کھانے میں دیسی مرغ اور باسمتی کے چاول جن کا آج تو نام و نشان ہی مٹ گیا ہے۔ سائنسدانوں نے فی ایکڑ پیداوار میں تو اضافہ کرلیا جو خوش آئند ہے لیکن وہ ذائقہ اور خوشبو چھن گئی جو خالص چیزوں سے ہی مل سکتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے تک ستارہ اور صاحب بہادر ماحول میں کچھ ایڈجسٹ ہوگئے تھے۔ پھر صاحب بہادر تو سو گئے میں اور ستارہ باتوں میں مشغول ہوگئے۔ میں نے اپنی بیگم کو بھی گفتگو میں شامل کرلیا تھا۔ ستارہ نے جہاں سے بات چھوڑی تھی وہیں سے آگے بڑھائی۔

مہذب ڈاکو

ماما کو ہم شام سے پہلے ہی گھر لے آئے ماما کیا تھیں پرستان کی کوئی پری یا بہشت بریں کی حور، پنک کلر کے سوٹ کے ساتھ انہوں نے سینڈل بھی اسی رنگ کے پہنے ہوئے تھے۔ ناخنوں پر بھی پنک رنگ کی پالش کی ہوئی تھی۔ مرمریں کلائی پر کارٹر کلر سٹریپ کی گھڑی بندھی تھی۔ ہتھیلیاں اتنی گلابی تھیں گویا رنگ لگایا ہو۔ گورے، گلابی اور نرم و نازک ہاتھ۔ گوری گوری مخروطی انگلیاں جن میں ہیروں جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں میں نے ماما کا ہاتھ پکڑا، اف خدایا! ایسا لگا جیسے خالص ریشم میری مٹھی میں سما گیا ہے۔ اندرونی خوشی اور احساس تفاخر پاپا کے چہرے سے صاف نظر آرہا تھا۔ میں تو جیسے ہواؤں میں اڑی چلی جا رہی تھی اور پھر پاپا کا جیون ستاروں سے بھر

گیا۔ اب میں سمجھی کہ میری خیر نہیں ہے میں نے اپنی شرط منوالی تھی اور اب میری باری آنے والی تھی پاپا کو ایک مشورہ کرنے والی مخلص ساتھی مل گئی تھی۔

موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا ہم لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے کہ پاپا نے ایک ضروری کام کا بہانہ بنایا اور کھسک گئے ان کے جانے کے بعد ماما نے کرسی میرے قریب کی اور میرا سر اپنے کندھے سے لگا کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں میں سمجھ گئی کہ آج بازپرس ضرور ہوگی۔

"دیکھو ستارہ! تمہارے پاپا نے تمہیں ایک لڑکے کے کوائف اور فوٹو دکھائے تھے"۔ ماما نے بات شروع کر دی۔ "کیا وہ لڑکا تمہیں پسند ہے؟"

"ماما! آپ بتائیں آپ کے خیال میں وہ کیسا ہے؟"

"دیکھو بیٹا! میرے خیال میں تو ٹھیک ہے"۔ ماما نے کہا۔ "خوبصورت بھی ہے، تعلیم یافتہ بھی ہے، ماں باپ کا اکلوتا بھی ہے اور ماشاء اللہ ایک بڑی مل کا مالک بھی ہے"۔

"لیکن ماما! مجھے صرف ایک اعتراض ہے"۔

"ہاں بیٹا! ضرور بتاؤ"۔ ماما ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"ماما! سب کچھ ٹھیک ہے لیکن دیندار نہیں ہے اس کی آنکھوں میں کوئی چیز ہے جو مجھے کھٹکتی ہے"۔ میں نے کھل کر کہا۔ "شاید...... وہ احساس برتری کا مریض ہے"۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! بڑے لوگوں کی اولاد میں یہ بات ہوتی ہے"۔ ماما نے کہا۔ "باقی رہی دینداری تو تم ماشاء اللہ دین کو سمجھتی ہو تم اسے مفید مشورے دے سکو گی۔ دیکھو تمہارے پاپا نے مجھے سمجھایا کہ ناخن پالش لگانے سے وضو نہیں ہوتا تو میں نے اس دن سے بالکل نہیں لگائی اور پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتی ہوں اور نقاب اوڑھنا بھی شروع کر دیا ہے قرآن حمید کی تلاوت بھی باقاعدگی سے کرتی ہوں تم بھی اسے احسن طریقے سے سمجھا سکتی ہو، اس کے علاوہ تو کوئی اعتراض نہیں"۔

"نہیں، ماما! پاپا کی کیا رائے ہے؟"

"انہیں تو یہ رشتہ پسند ہے"۔

"تو پھر ٹھیک ہے پاپا کی پسند ہی میری پسند ہے"۔

پھر پاپا کے کہنے پر میری ہونے والی ساس اور سسر آئے اور ہمارا رشتہ پکا ہو گیا۔ چند ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی اور پھر دو جہازوں پر بارات ہوائی اڈے پر اتری اور وہاں سے گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارے گھر پہنچ گئی۔ پروگرام کے مطابق کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہر ایک باراتی کو کیش ایک ایک ہزار روپیہ دینے کا پروگرام تھا اس زمانے میں پچاس روپے سے ایک آدمی اچھا کھانا بازار سے کھا سکتا تھا زیادہ عیاشی کرے تو سو روپے کافی ہوتے تھے۔ جہیز کی مد میں پچاس لاکھ روپیہ لڑکے کے اکاؤنٹ میں جمع ہونا تھا جو آج کل کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی اس کے علاوہ پاپا کے وسیع کاروبار میں شرعا جو حصہ مجھے ملنا چاہئے تھا اس کی میں حقدار ٹھہری جو اصل میں سسرال والوں کا ہی تھا۔

بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا پاپا بہت مالدار تھے، نکاح کا مرحلہ آیا تو شیخ بنفس نفیس خود نکاح پڑھانے کے لئے آئے۔ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے رعب اور جلالت علمی سے میں نروس سی ہو گئی۔ پھر وہ میرے قریب بیٹھ گئے اور فرمانے لگے بیٹا میں تمہارا نکاح پچاس تولے سونے کے حق مہر پر اور دس لاکھ نقد رقم پر فلاں لڑکے سے پڑھا دوں تمہاری طرف سے اجازت ہے؟ میں خاموش رہی آپ نے پھر پوچھا میں خاموش رہی، تیسری بار پوچھنے پر بھی میں خاموش رہی، وہ ہلکا سا مسکرائے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ پھر وہ سٹیج پر گئے تاکہ ایجاب و قبول اور خطبہ نکاح پڑھیں، ابھی

آپ تیاری کر رہے تھے۔

"ذرا رک جائیں مولانا صاحب!" اچانک لڑکے نے بلند آواز کہا۔ "میں اس وقت تک نکاح پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک لڑکی کو دیکھ نہ لوں"۔ سب لوگ دم بخود رہ گئے۔

"کیا تمہارے والدین نے لڑکی کو پسند نہیں کیا تھا؟" شیخ اپنی بھاری اور گرجدار آواز میں بولے۔

"زندگی میں نے گزارنی ہے یا والدین نے؟" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

میرے پاپا انتہائی پریشان ہو گئے لڑکے کے والد نے مداخلت کی اور شیخ سے کہا۔ حضرت آپ نکاح پڑھیں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

"نہیں، پاپا! میں یہاں سے واپس چلا جاؤں گا"۔ لڑکے نے اٹل لہجے میں کہا۔ "میری یہ شرط ہے کہ پہلے لڑکی کو دیکھوں گا پھر نکاح پڑھنے کی اجازت دوں گا"۔

اس گفتگو سے تقریب میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جلد ہی یہ بات ادھر گھر کی عورتوں میں بھی پھیل گئی اور پھر کئی قسم کے تبصرے شروع ہو گئے۔ میری ماما نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بھرے مجمعے میں میرے معزز پاپا کی عزت داغدار ہو چکی تھی، میں نے ماما کو بلایا اور ان کے سینے سے چمٹ گئی اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ماما کو تسلی تشفی دی اور انہیں کہا ماما ذرا پاپا کو بلائیں۔ پاپا آئے تو ان کی حالت دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔ میں نے پاپا سے پوچھا۔ پاپا کیا معاملہ ہے؟

"بیٹا! آپ نے سن ہی لیا ہو گا"۔ پاپا نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں آ رہی کہ اب کیا کیا جائے"۔

"پاپا یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں جو آپ لوگ اس قدر پریشان ہو گئے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "اسلام نے یہ اجازت دی ہے ہونے والی بیوی کو دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے"۔

"لیکن بیٹا! یہ مطالبہ تو وہ اس سے پہلے بھی کر سکتا تھا"۔ پاپا نے کہا۔ "آج اتنے لوگوں کے سامنے اسے ہماری عزت سے نہیں کھیلنا چاہئے تھا"۔

"پاپا! آپ لوگ خواہ مخواہ ایک معمولی بات کو کیوں اتنا محسوس کر رہے ہیں؟"۔

"لیکن بیٹا! اگر ہم اسے اجازت دے دیں کہ وہ تمہیں دیکھ لے اور پھر وہ تمہیں پسند نہ کرے تو پورے شہر میں ہماری رسوائی اور جگ ہنسائی ہو گی"۔ پاپا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس سے بہتر ہے کہ ہم انہیں یہاں سے چلتا کرتے ہیں"۔

"نہیں پاپا! آپ اسے بلا لیں"۔ میں نے اعتماد سے کہا۔ "مجھ میں کون سی کمی ہے کچھ نہیں ہو گا"۔

مجبور و بے کس باپ کیا کر سکتا تھا کہنے لگے ٹھیک ہے بیٹا! حنا تمہارا کیا خیال ہے؟"

"دیکھیں عظیم! میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں"۔ ماما نے کہا۔ "مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے"۔ ماما ایک مرتبہ پھر جذباتی ہو گئیں۔

"دیکھو حنا! یہ رونے دھونے کا وقت نہیں ہے، میرے خیال میں ستارہ ٹھیک کہتی ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا"۔ پاپا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

چنانچہ لڑکے کو بلایا گیا اس کی والدہ ایک شان بے نیازی سے اس کے ساتھ آئی میں نے سب لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کا کہا۔ لڑکا میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی شیطنت مجھے نظر آئی جو اس کا فوٹو دیکھ کر آئی تھی۔ اس نے مجھ سے میری تعلیم اور عمر کے بارے میں چند باتیں کیں اور پھر اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے ماما! ستارہ تو میرے آئیڈیل سے بھی کہیں بہتر ہے"۔

میں نے زہر خند سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھی طرح دیکھ لو پھر......"
"پہلی نظر میں ہی گھائل ہو گیا ہوں"۔ اس نے میری بات بھی پوری نہ ہونے دی اور کہنے لگا۔ "مزید پھر دیکھیں گے، چلیں ماما میری طرف سے نکاح کی اجازت ہے"۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور واپس دروازے کی طرف چل پڑا۔
میں نے اسے آواز دی۔ "مسٹر ذرا میری ایک بات سنتے جانا"۔
"غلام حاضر ہے"۔ اس نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
میں نے دوپٹے سے چہرے کو ڈھانپ لیا اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کہنے میں تمہیں پسند ہوں لیکن تم مجھے پسند نہیں ہو اور ابھی لاؤ لشکر سمیت یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ، خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے لڑکیوں کی بھی پسند ناپسند ہوتی ہے تم مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئے۔ میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں آنکھوں دیکھ کر کوئی بھی زہر نہیں کھاتا میں اپنے پاپا کی پسند پر بھی اعتراض نہ کرتی لیکن اب معاملہ والدین سے نکل کر ہمارے ہاتھوں میں آ گیا ہے اور اب میرے اس فیصلے کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی اور یہ حق مجھے ایک ایسی ہستی نے دیا ہے جس کا ثانی روئے زمین پر خدا نے پیدا ہی نہیں کیا جو محمد بھی ہے اور احمد بھی"۔
شیخ کو صورت حال کا پتہ چلا تو وہ میرے پاس تشریف لائے۔ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کچھ کہنے کے لئے جوں ہی بولنے لگے میں نے جھٹ سے کہا۔
"محترم شیخ! اگر ولی کو لڑکی کی مرضی کے بغیر کسی ایسے لڑکے کے ساتھ نکاح کرنے کا اختیار ہے جسے وہ لڑکی ناپسند کرتی ہو تو بے شک آپ مجھے حکم دیں لیکن اگر ایسا نہیں تو آپ مجھے مجبور نہ کریں"۔ شیخ خاموش ہی رہے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔
ماما اور پاپا نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ پاپا کی نظروں میں میرے لئے ستائشی جذبات صاف نظر آ رہے تھے۔ جب شیخ اٹھ کر باہر چلے گئے تو وہ لڑکا دوبارہ اندر آیا اور مجھے منانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "مہذب ڈاکو بھلے مانسوں کی طرح چلا جاؤ ورنہ تم جیسے اکڑ خانوں کو بھگانا مجھے آتا ہے۔ تم نے مجھے بکاؤ مال سمجھا کہ اچھا لگے تو خرید لو اور پسند نہ آئے تو انکار کر دو لیکن اب غور سے سن لو سورج مغرب سے تو طلوع ہو سکتا ہے لیکن میں تم پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کروں گی"۔

ستارہ سے ستارہ شہزاد

کئی لوگوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں اپنی ضد پر اڑی رہی، یوں بھی اتنی بدحرکی کے بعد اب اس لڑکے کے ساتھ زندگی نبھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ انتقامی کارروائی بھی کر سکتا تھا۔ میاں بیوی کا رشتہ باہمی اعتماد پر قائم ہوتا ہے جو بالکل ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ماما کو اندر بلایا۔ ماما اندر آ گئیں پاپا بھی ان کے ساتھ آ گئے۔
"ستارہ بیٹا! کہیں تم نے غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا؟" پاپا نے پوچھا۔
"نہیں پاپا! آپ میری ایک بات مانیں"۔
"ہاں بتائیں"۔
"پاپا! بھولے کو بلائیں اور ابھی میرا نکاح اس سے کر دیں۔
"کون بھولا؟" پاپا حیرانگی سے بولے۔
"وہی دودھ دہی والا"۔ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔
"لیکن بیٹا! وہ تو......"
"بس پاپا کوئی بات نہ کرنا وہ میرے چچا اور آپ

کے بھائی کا بیٹا ہے اس سے بڑھ کر ہمیں اور کون ہوسکتا ہے"۔

"لیکن بیٹا....."

"بس پاپا! میں نے کہا ناں بھولے سے میرا نکاح کردو"۔

"دیکھو ستارہ!"

"پاپا! مجھے پتہ ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں یہی ناں کہ بھولا، ان پڑھ اور غریب ہے ہمارے پائے کا نہیں، اس کی کوئی شخصیت نہیں، خوبصورت بھی نہیں پاپا اس میں دو کمالات ایسے ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں پہلا کمال تو یہ ہے کہ وہ ہمارا اپنا ہے اور دوسرا کمال ماما آپ کو بتا دیں گی"۔ میں نے معنی خیز انداز سے ماما کی طرف دیکھا اور پھر گرے پڑوں کو اٹھانا حکم رسول بھی ہے اور کسی کا دل توڑنا خدا تعالیٰ نے بھی منع فرمایا ہے"۔

پاپا نے ماما کی طرف دیکھا جتا کیا خیال ہے؟

"عظیم ہمیں ستارہ کی بات مان لینی چاہئے"۔ ماما نے کہا۔

یوں شہزادہ عرف بھولا دودھ دہی والا میرا مجازی خدا بن گیا۔

مہذب ڈاکو بمقابلہ صنفِ نازک

اس سے تقریباً ملتا جلتا واقعہ ہمارے علاقے میں پیش آیا۔ لڑکے والوں کی ڈیمانڈ پر لڑکی والوں نے جہیز میں کار دینے کی شرط مان لی اور سوزوکی کار دولہا کے سٹیج کے پاس کھڑی کردی۔ جب دولہا نے دیکھا کہ کار چھوٹی ہے تو اس نے نکاح پڑھانے سے انکار کردیا اور کہا کہ جب تک بڑی گاڑی نہیں دیں گے مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ لڑکی والے سب لوگ پریشان ہوگئے اب فوری طور پر بڑی گاڑی کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔ لڑکی کے چچا نے ابھی چند دن پہلے ہی اپنے لئے بڑی گاڑی خریدی تھی اس نے جب بھائی کو پریشان دیکھا تو لڑکی کے والد کو کہنے لگا بھائی جی اس کتے کے آگے اب کچھ ڈالنا ہی پڑے گا۔ میرے والی گاڑی اسے دے دو، یوں اس کی ڈیمانڈ پوری کردی گئی۔ سب لوگوں میں یہ بات پھیل گئی لوگوں نے جی بھر کر مہذب ڈاکو کو گالیاں دیں اور برا بھلا کہا۔ ظاہر ہے لڑکی سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی وہ خاموش رہی نکاح ہوگیا۔ اسی گاڑی میں دولہا اور دلہن واپس اپنے سسرال پہنچے وہ ڈاکو ابن ڈاکو بہت خوش تھا کہ میں نے خوب معرکہ سر کرلیا ہے۔ جب گاؤں پہنچے تو دلہن کو گاڑی سے نیچے آنے کو کہا تو وہ کہنے لگی جب تک میرے سسر نہیں آئیں گے میں نیچے نہیں آؤں گی۔ سسر صاحب کو بلایا گیا وہ خوشی سے بھاگتے بھاگتے آئے اور کہنے لگے بیٹی اتر آؤ میں آگیا ہوں۔

کہنے لگی۔ "بزرگوار! میں ایک شرط پر گاڑی سے نیچے اتروں گی"۔

"کیوں نہیں بیٹی، بتاؤ تمہاری کیا شرط ہے؟"

لڑکی نے کہا جب تک سونے کی جوتی مجھے نہیں پہناؤ گے میں نیچے نہیں آؤں گی۔

"لیکن بیٹی! سونے کی جوتی تو آج تک نہیں سنی"۔

"ٹھیک ہے پھر مجھے واپس گھر چھوڑ آؤ"۔ لڑکی نے حتمی انداز میں کہا۔

انہوں نے بہت منت سماجت کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی، اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ میرے والد نے تمہاری ڈیمانڈ پوری کردی ہے اب جب تک تم میری ڈیمانڈ پوری نہیں کرو گے، میرے ٹکڑے کرکے گاڑی سے نکال سکتے ہو تو نکال لو میں زندہ سلامت گاڑی سے باہر نہیں آؤں گی اور ہاں یہ یاد رکھنا میری ڈیمانڈ ابھی پوری ہونی چاہئے کل یا پرسوں تک مجھے یہ بات منظور نہیں ہوگی۔ بالآخر مجبور ہوکر لڑکی کو بمعہ گاڑی واپس گاؤں چھوڑنا

پڑا۔ لڑکی کو بہت سمجھایا بجھایا گیا لیکن لڑکی کا صرف ایک ہی سوال تھا کہ اگر اس دن چاچو کی گاڑی نہ ہوتی تو میرے ابو کی عزت کا جنازہ نکل گیا ہوتا۔ بالآخر طلاق حاصل کی گئی اور اسی چچا کے بیٹے سے نکاح کر دیا گیا جس نے اس دن اپنی گودی دے دی تھی۔

مہذب ڈاکو کی سنگ دلی کا سچا واقعہ

یہ واقعہ میرے ایک رشتہ دار نے مجھے سنایا تھا جو ان کے دور کے رشتہ داروں میں پیش آیا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک غریب لڑکی جس کا والد اپنی انتہائی غربت کی وجہ سے جہیز نہیں دے سکتا تھا، ایک غریب، بے روزگار لڑکے کے گھر والوں کی خواہش پر بچی کا رشتہ انہیں دے دیا۔ چند دن تک تو خیر رہی لیکن پھر لڑکی کو جہیز نہ لانے پر طعن و تشنیع شروع ہو گئی ایک رات ایک اندوہناک واقعہ پیش ہوا کہ اس لڑکی کے خاوند نے پہلے تو لڑکی پر تشدد کیا اور پھر اس کے تمام کپڑے اتار کر بالکل الف ننگی لڑکی کو دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ اس سے سخت بدزبانی بھی کی کہ تم گھر سے کیا لے کر آئی ہو تمہارے بدن پر جو کپڑے ہیں یہ بھی ہمارے ہیں۔ سردیوں کی رات تھی لڑکی دیوار کے ساتھ چمٹ کر کھڑی ہو گئی اور دبی گھٹی آواز میں آہ و زاری کرتی رہی کہ خدا کے لئے دروازہ کھول دو میں صبح والد کے گھر چلی جاؤں گی اور جہیز لے کر واپس آؤں گی لیکن اس کے سنگ دل خاوند نے دروازہ نہ کھولا وہ ساری رات دیوار سے لگی کھڑی رہی اور سردی سے ٹھٹھرتی رہی۔ اس کا گھر بھی اسی شہر میں تھا لیکن ذرا دور تھا جب فجر کی اذانیں شروع ہوئیں تو وہ مایوس ہو گئی اور دیواروں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی طرف کھسکنا شروع ہو گئی۔ بالآخر اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دی۔ باپ نے دروازہ کھولا تو وہ چیخ کر کہنے لگی۔ "بابا آنکھیں بند کر لے اگر اپنی غریبی کا انجام آنکھوں سے دیکھے گا تو کلیجہ پھٹ جائے گا"۔

بابا نے بیٹی کو اس حالت میں دیکھا تو منہ دوسری طرف پھیر لیا اس کی چیخیں نکل گئیں خاوند کی چیخیں سن کر بیوی جاگ گئی بیٹی بھاگ کر ماں کی چارپائی پر گری اور ماں کے سینے سے چمٹ گئی۔

"اماں غریب تو تم تھیں مجھے تمہاری غریبی کی سزا کیوں دی گئی ہے میں نے تو تمہیں غریب نہیں کیا تھا۔ میں نے تمہیں کبھی تنگ نہیں کیا تھا میں تو پیوند لگے کپڑے پہن کر گزارا کر لیا کرتی تھی۔ روکھی سوکھی کھا کر خدا کا شکر ادا کیا کرتی تھی"۔

ماں نے بیٹی کو اوڑھنے کے لئے چادر دی اس کی المناک داستان سنی پھر اس کو کلاوے میں لیا اور ایسی دلدوز چیخ ماری کہ عرش خدا بھی لرز گیا ہو گا۔ باپ قریب آیا بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دینے لگا۔

"بیٹی! غریب ضرور ہوں بے غیرت نہیں ہوں"۔

اس نے قہر بھری آواز میں کہا پھر اندر گیا، گنڈاسہ چادر میں چھپایا اور بیٹی کے سسرال کے گھر کی طرف چلا۔ دروازہ کھٹکھٹایا لڑکے کی والدہ نے دروازہ کھولا۔ اس کا داماد ابھی سویا ہوا تھا اس کی چارپائی کے پاس پہنچا، گنڈاسہ نکالا اور پھر پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے اچھی طرح تسلی کی اور قریبی تھانے میں پہنچ گیا۔ ایس ایچ او ابھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا اسے گھر سے بلایا گیا اقرار جرم کرنے کے بعد حوالات میں بند کر دیا گیا۔ کیس چلا، مجسٹریٹ کے سامنے من و عن سارا واقعہ سنایا کر آخر میں سوال کیا۔

"مجھے بتایئے صاحب بہادر، اگر خدانخواستہ آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا تو آپ کیا کرتے؟"

مجسٹریٹ نے قلم منہ میں لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس کا قلم کاغذ پہ چلنے لگا فوری اشتعال اور مخصوص صورت حال کے پیش نظر مجسٹریٹ نے بری کر دیا۔

(مہذب ڈاکوؤں کی شرمناک داستان جاری ہے)

نام نہاد ادبی تنظیموں اور تنقید نگاروں سے معذرت کے بغیر!

تنقیدی نشست

☆ خادم حسین مجاہد

تخیل سینٹر کے خوبصورت ہال میں انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک نام نہاد ادبی تنظیم ادب کی خدمت کی خوش فہمی میں ایک تنقیدی نشست کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے سوئیاں مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ آگے پھسل چکی ہیں وقت پر آنے والے شعراء ادباء بڑی بے چینی سے مہمان خصوصی اور سامعین کی آمد کے منتظر ہیں کچھ دیر بعد اکا دکا سامعین پھنسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مہمان خصوصی کی آمد کے بعد فوری طور پر گیٹ بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی سامع حقیقت جان کر فرار نہ ہو سکے حالانکہ ابھی ہال کی بیشتر کرسیاں خالی ہیں۔ اچانک ایک مجہلی قسم کے صاحب روسٹرم کی طرف جھپٹتے ہیں افواہ ہے کہ وہی آج کی تنقیدی نشست کے کمپیئر ہوں گے وہ مائیک سے زبان لگا کر چیک کرتے ہیں کہ کہیں اس میں کرنٹ تو نہیں پھر آواز چیک کرنے کے لئے زور سے پھونک مارتے ہیں ایک اژدھے کی پھنکار سی ہال میں گونجتی ہے اور شور میں مصروف سامعین ڈر کر خاموش ہو جاتے جبکہ اونگھتے ہوئے شعراء ادباء ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں کمپیئر ایک استہزائیہ ہنسی کے ساتھ کہنا شروع کرتا ہے:

کمپیئر:۔ خواتین و حضرات مجلس فنکار ادب کی طرف سے احمق صحرائی آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ آپ کے ادب کی سرپرستی کرنے سے ہمیں پیٹ پرستی کے سنہری مواقع فراہم ہوتے ہیں جس کے لئے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ میں دعوت دوں گا مرجان خان سنگدل صدر بھٹہ خشت ایسوسی ایشن اور غضبناک قارونی وزیر سمگلنگ کو کہ وہ بالترتیب صدر اور مہمان خصوصی کی نشست پر تشریف رکھیں اگر کسی انقلابی کو اس پر اعتراض ہو تو وہ اس تقریب کے اخراجات برداشت کرنے کی ہامی بھر لے ہم اسے کرسی صدارت پر بٹھا دیں گے امید ہے کہ پیسے اور ادب کا درمیانی تعلق

آپ کی سمجھ میں بخوبی آ گیا ہو گا لہٰذا اب تقریب کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں سب سے پہلے میں اپنی علامتی غزل پیش کروں گا اس کے بعد آپ کو اس پر تنقید کی اجازت ہو گی۔

روتے رہنا دیر تک
بھونکتے رہنا دیر تک
ہماری قومی عادت ہے
سوتے رہنا دیر تک
لڑکیو! اچھا نہیں ہے
بولتے رہنا دیر تک
ہمیشہ پرائے گریبانوں میں
جھانکتے رہنا دیر تک
روز شہر کی لڑکیاں
تاکتے رہنا دیر تک
نوکریوں چھوکریوں کے پیچھے
بھاگتے رہنا دیر تک
کار احمق ہے الٹی سیدھی
ہانکتے رہنا دیر تک

علامتی غزل آپ کے کانوں میں نہیں نے گھسیڑی کوئی ادب دشمن اس پر تنقیدی گند اچھالنا چاہے تو اسے کھلی چھٹی ہے۔

آوارہ گردشی:۔ یہ غزل صرف علامتی ہی نہیں مادر پدر آزاد اور وارداتی بھی ہے شاعر نے کس دیدہ دلیری سے چھٹے اور ساتویں شعر میں قابل دست اندازی پولیس اقدامات کا اعتراف کیا ہے۔ ایسے لوگ ادب کے نام پر ایک بدنما داغ ہیں جن کو ختم کرنے کے لئے مہنگے سے مہنگا پاؤڈر چھڑکنا چاہیے۔

شریر سازشی:۔ آپ کس کس داغ کو ختم کریں گے اور کیا آپ کو علم نہیں کہ شاعر جو کچھ کر نہیں پاتے وہ لکھ کر ہی خوش

کرتے ہیں۔ پہلے اور آخری شعر میں شاعر نے اپنے مشاغل کا واضح اظہار کیا ہے۔

آفت دریائی:۔ شاعر نے نہایت باریکی سے دوسرے اور چوتھے شعر میں ہماری دو قومی خرابیوں پر طنز کرتے ہوئے ایک مصلح کا رول ادا کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے کہ باتوں سے کبھی کوئی قوم ٹھیک ہوئی ہے اس کے لئے تو ہمیشہ سے "لاتیں" ہی تیر بہدف رہی ہیں۔ بہرحال ہم پھر بھی شاعر کو مایوس نہیں کرنا چاہتے، اس کی کوشش اچھی ہے۔

بیکار مچلتی:۔ میرے خیال میں تیسرا شعر حاصل غزل ہے جس میں لڑکیوں کو زود گوئی سے منع کیا گیا ہے لیکن شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ وہ دیر تک بولیں نہیں تو پھر اور کیا کریں؟

عاشق باتونی:۔ جی نہیں، پانچواں شعر حاصل غزل ہے لیکن لگتا ہے کہ شاعر یا تو نشے میں ہے کہ دل کا دروازہ کھل نہیں رہا یا پھر اس کی چابیاں بدل گئی ہیں۔

کمپیئر:۔ احمقو! تم تو مجھ سے بھی بڑے احمق نکلے اگر تنقید کی چٹانوں پر آپ جیسے شکاری تشریف فرما رہے تو شاعری کے پرندے بہت جلد نایاب ہو جائیں گے۔ اب میں دعوت دوں گا ضمیر لاشعوری کو کہ وہ اپنے علامتی افسانے "خوابوں کا چور" سے آپ کے مزاج درست کریں۔

ضمیر لاشعوری:۔ میں جب اس سے پہلی بار ملا تو وہ مجبوریوں کے پیراہن میں لپٹا ہوا تھا، اس کے پاؤں میں مسافت کے جوتے تھے، آنکھوں پر حسرت کا چشمہ تھا اور اس نے غم کی بکل ماری ہوئی تھی۔ اس بکل میں کہیں کہیں خوشی کے چھوٹے چھوٹے پیوند لگے ہوئے تھے جو بہت

بعد سے معلوم ہو رہے تھے۔ جب وہ بولا تو میری جھولی لفظوں کے کانٹوں سے بھر گئی۔ میں نے اس کی شکل اتارنا چاہی مگر وہ سفید پوشی کے جال میں بے بس تھا۔ دوسری بار جب میں نے اسے ملنے کی کوشش کی تو وہ تمناؤں کی دھوپ سے جھلستا ہوا کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں مکان اوڑھ کر جا چکا تھا۔ گری ہوئی آنسوؤں کی اینٹوں پر پاؤں رکھتا جب میں اس تک پہنچا تو اس کے خواب چوری ہو چکے تھے۔ ہم اس کی رپورٹ درج کرانے گئے تو تھانیدار نے پتھر آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس وقت اجلی چھاؤں اوڑھ رکھی تھی میرے سر پر طاقت کا سورج تھا اور میرے پاؤں میں تعلقات کے جوتے تھے۔ تھانیدار نے یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اس کے خوابوں کا چور مجھے قرار دیا اور خود اسٹیلے کے تجربت خودکشی کر لی لیکن اس کے زمین اوڑھنے سے قبل ہی میرے سینے پر انسانیت کے ہمدرد کا تمغہ لگ چکا تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ تمغہ میرے ضمیر کو آج بھی بہت چبھتا ہے۔

(سامعین کی اکثریت پر افسانے کے اثرات خواب آور گولیوں کے سے تھے کمپیئر نے جانوروں کی آوازیں نکال کر ان کو جگایا)

کمپیئر:۔ اگر کوئی بدقسمت پورا افسانہ سننے کے باوجود نہ سو سکا ہو تو اس سے گزارش ہے کہ وہ اس افسانے پر تنقیدی آرے چلائے۔

ضمیر ناطقی:۔ مصنف نے بڑے خوبصورت انداز میں اس حقیقت کو علامت کے کپڑے پہنا کر واضح کیا ہے کہ کتنے لوگوں کو سواری سے محروم کر کے ایک شخص بیجارو کا مالک بنتا ہے۔ کتنے گھروں کے دیپ بجھا کر ایک محل روشن ہوتا ہے۔ کتنے لوگوں کو بے گھر کر کے ایک شخص صاحب جائیداد بنتا ہے، کتنے بچوں کے نوالے چھین کر کتوں کو امپورٹڈ خوراک کھلائی جاتی ہے کتنے.....

کمپیئر:۔ شعور صاحب اتنے بھی جذباتی نہ ہوں یہ تنقیدی نشست ہے کوئی سیاسی اجلاس نہیں۔ بہرحال اسی مفصل تبصرے پر اکتفا کرتے ہوئے میں جدت کے علمبردار زرالا جدیدی کو دعوت سخن دیتا ہوں۔

زرالا جدیدی:۔

گدھے

منہ زور گدھے

ہواؤں کے منہ زور گدھے

خلاؤں، ہواؤں کے منہ زور گدھے

فضاؤں، خلاؤں، ہواؤں کے منہ زور گدھے

دشاؤں، فضاؤں، خلاؤں، ہواؤں کے منہ زور گدھے

بلاؤں، دشاؤں، فضاؤں، خلاؤں، ہواؤں کے منہ زور گدھے

(اس سے پہلے کہ زرالا جدیدی گدھوں کو گھٹاؤں تک لے جاتا کمپیئر نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے یک لتی مار کر اسے سٹیج سے نیچے پھینک دیا)

کمپیئر:۔ زرالا جدیدی نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر اردو شاعری میں جو منہ زور گدھے دوڑانے کی خطرناک سازش کی ہے اس پر میں عملی تنقید کا مظاہرہ کر چکا ہوں اگر کوئی اس سے بہتر تنقید کر سکتا ہے تو اسے دعوت عام ہے۔

دلیل منطقی:۔ شاعر کے ایک قابل قدر تجربے کو آپ جیسے رجعت پسندوں نے رد کر کے اردو ادب کی کوئی خدمت نہیں کی حالانکہ گدھے کی اس علامت کے پیچھے جو حقائق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس کی طرف آپ کی توجہ بالکل نہیں گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ شاعر کے تخیل کو پہنچ ہی نہیں سکے ورنہ یہ نظم تو آب زر سے لکھوا کے رکھنے کے قابل ہے جس میں گدھوں اور فطرت کے مظاہر کا عظیم الشان ملاپ نہایت منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

بدتمیز لنگوٹیا:۔ اس پوری نظم میں تخیل نامی گدھا سرے سے موجود ہی نہیں تو اس تک کوئی پہنچے کیسے؟ حقیقت یہ ہے کہ نرالا جدیدی نے کسی فارسٹ آفیسر کے تنہائی میں لکھے گئے اوراق پراگندہ میں سے یہ نظم "ایجاد" کی ہے جس کی ہم بھرپور مذمت کرتے ہیں۔

(کچھ منچلوں نے گدھے کی طرح رینک کر بدتمیز لنگوٹیا کی تائید کی تو دلیل منطقی اور نرالا جدید ناراض ہو کر باہر چلے گئے جس پر ضمیر لاشعوری انہیں "چارہ" کھلا کر واپس لے آئے)

کمپیئر:۔ کچھ گدھوں کی وجہ سے محفل میں بدمزگی پیدا ہو گئی تھی جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہمارے مستقل ممبر جناب مرثیہ خان شاعر نے میر کی زمین میں ایک سیاسی غزل اگانے کا ہولناک تجربہ کیا ہے، آیئے اب ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔

مرثیہ خان شاعر:۔

ابتدائے الیکشن ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
جلوس میں لیڈر کے اک شور ہے
ابھی ووٹر کوئی پڑا سوتا ہے کیا
پر سبز ہوتا نہیں کبھی یہ شجرا
تخم ایمان ارض سیاست میں بوتا ہے کیا
اس میں غرق ہوا نہیں کوئی کبھی
بحر احتساب میں تو ڈبتا ہے کیا
یہ نشان الیکشن کے جاتے نہیں
داغ دیواروں کے عبث دھوتا ہے کیا
غنیمت ہیں ووٹر کے لئے دن الیکشن کے
مرثیہ ان کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

کمپیئر:۔ جس بے دردی سے مرثیہ نے میر کی غزل کا تیا پانچہ کیا ہے اس پر ان کی روح عالم بالا میں ضرور تڑپ اٹھی ہو گی۔ آپ میں سے کوئی مرثیہ خان کو اس جسارت پر کوئی تنقیدی سزا دینا چاہے تو ہمیں ہرگز اعتراض نہ ہو گا۔

فارغ البال ناقدی:۔ مرثیہ خان نے میر کی زمین میں غزل نہیں اگائی بلکہ پراگندہ خیالات کا سیم و تھور پیدا کر کے اس زمین کو بنجر کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ میں مرثیہ خان کے لئے اس جرأت پر فی شعر دس گندے انڈوں کی سفارش کرتا ہوں۔

حقیر فخری:۔ میں اس کی پرزور مخالفت کرتا ہوں کیونکہ یہ نئے ٹیلنٹ کو دبانے کی ایک سازش ہے۔ اگر نئے لوگوں کی غلطیوں سے چشم پوشی کر کے انہیں آگے آنے کا موقع نہ دیا گیا تو اردو ادب میں کئی نئے غنچے کھلنے سے پہلے مرجھا جائیں گے۔

کمپیئر:۔ الیکشی غزل کیا سنی تنقیدی اجلاس کو اسمبلی کا اجلاس سمجھ لیا، فوراً ہوش میں آئیں اور سیاسی طرز عمل سے اجتناب کریں کیونکہ میرے خیال میں اس موضوع پر آپ کو گھنٹوں بور کیا جا سکتا ہے مگر میں آپ پر ترس کھاتے ہوئے اس موضوع کی گردن یہیں مروڑتا ہوں اور دعوت دیتا ہوں جناب دھواں چولہا پوری صاحب کو کہ وہ اپنی آزاد نظم "راز" سے آپ کے صبر کا امتحان لیں۔

دھواں چولہا پوری:۔

کچھ عرصے سے
مجھے بھوک زیادہ لگنے لگی ہے
میں جو تارے گننے کا ماہر تھا
اب گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں
خواب جو کب کے روٹھ چکے تھے
اب طویل دورانئے پر مشتمل

روز دکھائی دیتے ہیں
اور میرے دوستوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے
کہ انہیں میرے چہرے پہ چمک
آنکھ میں بجلی
اور چال میں مستی نظر آ رہی ہے
ہاں تمہارا اندازہ درست ہے
میری بیوی روٹھ کر
میکے چلی گئی ہے

کمپیئر:۔ دھواں چولہاپوری نے اپنے خانگی راز سے پردہ سرکایا ہے گو اس کے لئے وہ شاعری کی تمام حدود قیود پھلانگ گئے ہیں مگر فرط مسرت میں انسان پابندیاں کم ہی دیکھتا ہے آپ کا کیا خیال ہے۔

آتش برفی:۔ دھواں چولہاپوری نے صحت و مسرت کا ایسا انمول راز بتایا ہے جو ہزاروں روپے خرچ کر کے کسی ستیاناسی بادے سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا میں آج ہی اپنی بیوی سے جھگڑا کر کے اسے میکے بھیجتا ہوں۔

نازک دریا:۔ میں دھواں چولہاپوری صاحب پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ بیوی کے میکے جانے سے جہاں ان کی صحت بہتر ہوتی ہے وہیں کام کا بوجھ کم ہونے سے بیوی کا حال بھی بہتر ہو جاتا ہے اور سال میں چار بار بیوی کو اپنی Fitness برقرار رکھنے کے لئے ضرور روٹھ کر یا صلح صفائی سے میکے جانا چاہئے۔

کمپیئر:۔ یہ تو چکر ہی الٹا چل گیا۔ خیر اس وقت میرے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "آواز سگاں" دنیا کے دیگر فضول ادب کی طرح یہ کتاب بھی دوستوں کے پرزور اصرار پر شائع ہوئی ہے کاش میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوتا جو اس قسم کے فضول ادب کی اشاعت کا محرک ہو تو بلا تاخیر "شہاب نامہ" مار کر اسے قتل کر دیتا۔

اس کتاب میں کچھ مشکوک کردار شاعروں کا وہ کلام جمع کیا گیا ہے جسے چھاپنے پر کسی بھی رسالے پر فحاشی و عریانی کے مقدمات قائم ہو سکتے تھے۔ مؤلف نے امید ظاہر کی ہے کہ یہ کلام قبول عام کی سند حاصل کرے گا اور نجی محفلوں میں سینہ بہ سینہ سفر کرتا ہوا سمندر پار تک پہنچ جائے گا۔ نمونے کے طور پر چند "بے ضرر" ٹکڑے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو ذرا "شریفانہ" قسم کے ہیں باقی کا اندازہ آپ خود کر لیجئے گا۔

تم میرے پاس ہوتی ہو گویا
جب کوئی تیسری نہیں ہوتی

زمانہ تو اپنی روش سے مجبور ہے
کیوں نہ طوفاں کے آگے تن جائیں ہم دونوں!
جذبات سرد ہوتے ہی عاشق بولا
"چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں"

روشندان آوازیں دیتے ہیں
کھڑکیاں راہیں تکتی ہیں
لڑکے جشن مناتے ہیں
لڑکیاں راہیں تکتی ہیں

امید ہے کہ اس تعارف کے بعد یہ کتاب دھڑا دھڑ بکنا شروع ہو جائے گی اور کئی اعلیٰ پائے کی کتابیں فٹ پاتھوں پر پہنچ جائیں گی۔ اب میں دعوت دوں گا معروف مضمونچہ نگار مزاحیہ شرارتی کو کہ وہ آپ کے سامنے اپنا تازہ مضمونچہ "پردہ در پردہ" پیش کریں۔

مزاحیہ شرارتی:۔ پردے کا سب سے زیادہ استعمال حقائق پر ڈالنے کے سلسلے میں ہوتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ حقائق سے پردہ سرکانے کی جب بھی کسی سرپھرے نے کوشش کی تو اس کو سر عام بے پردہ کر دیا گیا۔ پردہ

صرف ظاہری ہی نہیں ہوتا بلکہ دراصل نظر اور دل کا بھی ہوتا ہے۔ بعض عورتیں ظاہری پردے میں بھی بے پردہ ہوتی ہیں کیونکہ ان کے دل و نظر بے پردہ ہوتے ہیں اس قسم کا ایک پردہ نصف پردہ ہوتا ہے جو بے پردگی سے زیادہ خطرناک ہے کہ بدصورت سے بدصورت عورت بھی اپنی کھلی آنکھوں کے باعث دعوت نظارہ دیتی محسوس ہوتی ہے۔ اس معروف پردے کے علاوہ بھی ہمہ اقسام کے پردے پائے جاتے ہیں جن میں آج کل سیاسی، فرقہ دارانہ تعصبانہ، لسانی، علاقائی اور مفاداتی پردوں کی بڑی دھوم ہے۔ کھڑکیوں پر ڈالے جانے والے پردے اس کے علاوہ ہیں لیکن اکبر الٰہ آبادی کا دریافت کردہ "مردوں کی عقل پر پڑنے والا پردہ" سرفہرست ہے۔ اکبر الٰہ آبادی ہی کے ایجاد کردہ ایک منفرد پردے کی پردہ نمائی کے بعد اس موضوع پر پردہ ڈالتا ہوں۔

سب کے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کر دیا

کمپیئر:۔ بک گیا جنوں میں کیا کچھ، خیر کوئی اس مضمونچے کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے؟

گل لالہ شبنمی:۔ یہ مضمونچہ چونکہ ایک مرد کا لکھا ہوا ہے اس لئے جانبدارانہ سوچ کا حامل ہے۔ اگر ہم پردہ نہ کریں تو یہ مرد نظروں سے ہمارا ایکسرے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پردہ کر بیٹھیں تو متجسس ہو کر گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ آخر ہم کہاں جائیں؟ جب تک مساوات کے اصولوں کے تحت مردوں کو بھی پردے کا پابند نہیں کیا جائے گا مسئلہ جوں کا توں رہے گا۔

چنچل رومانی:۔ تم فکر نہ کرو بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب پوری دنیا پر عورتوں کا راج ہو گا پھر جو چند مرد دن مریدی کی دبا سے محفوظ بھی رہ جائیں گے۔ بے بس ہو جائیں گے اور بالآخر ان کو پردے میں بٹھا دیا جائے گا۔

کمپیئر:۔ یہ آپ کا ایک اور خواب پریشان ہے جو کبھی تعبیر سے معانقہ نہ کر سکے گا۔ وہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ کتوں کی بددعاؤں سے ڈھور ڈنگر نہیں مرتے قدرت کے قانون میں مرد کو جو بالادستی دی گئی ہے وہ آپ کو تسلیم کرنا ہی پڑے گی، چاہے خوشی سے کریں چاہے مجبور ہو کر۔ اس سے پہلے کہ میں سنجیدگی کے گٹر میں غوطے کھانے لگوں آپ کو یہ خوشخبری سنا دوں کہ اب صرف ایک آئٹم رہ گیا ہے جس کے بعد چائے سنیکس اور آپ کے درمیان حائل تمام حجابات دور کر دیئے جائیں گے۔ تقاریب میں کھانوں پر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پابندی لگی ہوئی ہے۔ گو ہمیں ایسے قانون پسند بھی نہیں پھر بھی ایک فائدہ مند قانون پر عمل کر کے اچھے شہری ہونے کا ثبوت دے دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ تو سامعین! آخر میں آپ کو غزل سنائیں گے "فارغ خان خیالی" جو بطور خاص اس تقریب میں شرکت کے لئے برطانیہ سے آئے ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی کو برطانیہ جا کر مشاعرے اٹینڈ کرنے کا شوق ہو تو اسی مقدار سے ان کی داد و تحسین کرے۔ تو سامعین! استقبال کیجئے:

فارغ خان خیالی:۔

امیر ہو تو وفا لو
کنگلے ہو تو جفا لو
محبت اس مہنگائی میں
ذرا ہوش کی دوا لو
ویزا لو لندن کا
ذرا باہر کی ہوا لو
ایک شاپنگ کی مار ہے
میاں جی جو بھی کما لو
گوشت آٹا ملتا نہیں
بھوک میں کلیجہ چبا لو

شاعری چھوڑ دو فارغ
سامعین کی دعا لو

(سامعین نے ہر شعر سے بچھے بغیر اتنی داد دی کہ انتظامیہ کو خطرے کا الارم بجا کر انہیں خاموش کرانا پڑا)

لٹھ مار:۔ یہ غزل تو معروف شاعر مجروح خان شکستہ کی ہے جو ان کی کتاب ''اندھے سورج کی گھاتیں'' میں شامل ہے۔ فارغ خان خیالی نے یہ غزل سرقہ کی ہے۔

چاپلوس خوشامدی:۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مجروح خان شکستہ تو ان کے شاگرد ہیں شروع میں یہ ہی ان کو غزلیں لکھ لکھ کر دیتے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ غزل اپنی کتاب میں شامل کر لی ہو۔ بہر حال ان کی یہ غزل کئی ایسے ماہناموں میں لگ چکی ہے جن کے یہ سالانہ خریدار ہیں یا جن کو یہ اشتہارات دلواتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ یہ غزل ان کی اپنی ہے۔

(سامعین کی اکثریت نے چاپلوس خوشامدی کی تائید کی۔ لٹھ مار اپنے مؤقف سے دستبردار نہیں ہوا نتیجتاً اسے ڈنڈا ڈولی کر کے ہال سے باہر پھنکوا دیا گیا جس کے بعد چائے کی محفل پر فارغ خان خیالی نے پچاس آٹوگراف دیئے اور تیس دعوتیں قبول کیں کمپیئر نے جوش میں آ کر اعلان کیا)

کمپیئر:۔ سامعین آثار بتاتے ہیں کہ بہت جلد ہماری بزم کا اگلا پروگرام لندن میں منعقد ہوگا جس میں لٹھ مار جیسے بے وقوفوں کے علاوہ آپ سب شریک ہو سکیں گے۔

فارغ خان خیالی نے اثبات میں سر ہلایا اور حاضرین نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔

(1998ء)

تاریخ کے اوراق سے کشید کیے ہوئے دلچسپ اور عجیب واقعات

دلچسپ تاریخی حقائق

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

قدرت کا انصاف

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا ایک خاص انداز ہے۔ اُس میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ اس انصاف سے کوئی بچ نہیں سکتا چاہے بادشاہ ہو یا غلام، امیر ہو یا فقیر۔ یہی کچھ اودھ کے پہلے مسلمان گورنر سعادت خان کے ساتھ ہوا۔ سعادت خان دراصل ایران کا رہنے والا تھا۔ اُس دور میں ہندوستان پر مغل حکمران تھے اور ہندوستان بڑا پُرسکون اور امیر ملک گنا جاتا تھا۔ پورے ایشیا اور حتیٰ کہ یورپ سے بھی خواہشات کے غلام لوگ اپنی قسمت بنانے کے لئے ہندوستان ہی کا رُخ کرتے تھے۔

1705ء میں ایک ایرانی نوجوان سید محمد امین بہتر رزق کی تلاش میں ہندوستان آیا۔ اُس کا والد اور بڑا بھائی

پہلے ہی اسی مقصد کے لئے ہندوستان میں تھے۔ اس نوجوان کو اپنے والد اور بھائی سے کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکا تو اُس نے خود اپنی قسمت آزمانے اور قسمت بنانے کا فیصلہ کیا۔ نوجوان تھا، خوبصورت تھا، ذہین اور چالاک تھا اور یہ اوصاف ترقی کرنے کے لئے کافی تھے۔ سب سے پہلے اس نے دہلی کے قریب ایک جاگیردار نواب سربلند خان کے پاس ملازمت کی۔ ایک دن نواب سربلند خان نے کسی چھوٹی سی بات پر اس نوجوان کو طعنہ دیا جو جوش میں یہ برداشت نہ کر سکا۔ لہٰذا نواب سربلند خان کی ملازمت چھوڑ کر یہ سیدھا دہلی دربار جا پہنچا اور کسی نہ کسی طرح دہلی دربار میں ملازمت حاصل کر لی۔

دہلی دربار سازشوں کا گڑھ تھا اور سید محمد امین جیسے شاطر اور چالاک نوجوان کے لئے بڑا سازگار ماحول۔ لہٰذا اپنی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے یہ نوجوان بہت جلد بادشاہ کی نظروں میں آ گیا جس نے اسے اپنا ذاتی مصاحب بنا دیا۔ سید محمد امین نے جب مزید حالات کا تجزیہ کیا تو اُسے پتہ چلا کہ بادشاہ سلامت صوبہ بہار کے گورنر سید حسنین علی سے سخت خائف اور پریشان تھے جس کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مختلف سازشیں تخت دہلی کے لئے مسلسل دردِ سر تھیں۔ لہٰذا سید محمد امین نے اپنی شاطرانہ چالوں سے بادشاہ سلامت کی جان اس سازشی گورنر سے چھڑا دی۔ بادشاہ سلامت اس کارروائی سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نوجوان سید محمد امین کو صوبہ اودھ کی گورنری بخش دی اور سید محمد امین نے سعادت خان کے نام سے 1732ء میں اپنا نیا منصب سنبھالا۔

انصاف اور ضمیر کا تقاضا تو یہ تھا کہ سعادت خان تخت دہلی کا وفادار اور بادشاہ سلامت سے مخلص رہتا جس کی وجہ سے وہ اتنے بڑے منصب پر فائز ہوا تھا لیکن اس کی سازشی طبیعت اور لالچی فطرت نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ لہٰذا اُس نے شروع سے ہی دو چیزوں کی طرف توجہ دی۔ اوّل یہ کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کی جائے در اس مقصد کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا جائے اور دوم یہ کہ تخت دہلی سے جان چھڑائی جائے۔ یعنی اپنے ہی محسن پر کاری ضرب لگا کر اُس سے اقتدار چھینا جائے۔ اس مقصد کے لئے سعادت خان نے ساز باز کر کے دکن کے گورنر نظام الملک کو اپنے ساتھ ملایا اور اپنی طاقت بڑھانے کے لئے ان دونوں نے مل کر ایران کے بادشاہ نادر شاہ کو دہلی پر حملہ کی دعوت دی۔ ان کا خیال تھا کہ نادر شاہ دہلی سے مال و دولت سمیٹ کر بہت جلد واپس چلا جائے گا اور ہندوستان کی وسیع سلطنت کے وہ دونوں بلا شرکت غیرے مالک بن جائیں گے۔ سچ ہے انسانی لالچ کی کوئی انتہا نہیں اور لالچ میں انسان اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یہی کچھ ان دونوں کے ساتھ بھی ہوا۔

نادر شاہ ایک کائیاں بادشاہ اور جنگجو پسند جرنیل تھا۔ ایسی دعوت سے فائدہ نہ اُٹھانا اس کی فطرت کے خلاف تھا لہٰذا اُس نے فوری طور پر دہلی پر چڑھائی کی اور سلطنت دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن اُس نے ان دونوں کو بھی نہ بخشا۔ انہیں غدار قوم اور غدار محسن کے لقب سے نواز کر ان سے ان کی ساری دولت چھین لی اور مزید یہ کہ انہیں اپنی رعایا سے تمام دولت اکٹھی کرنے کا حکم دیا جو انہوں نے کی اور نادر شاہ کو پیش کی۔ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ کے ڈر سے ان دو حضرات نے غریب سے غریب آدمی کے پاس سے بھی سب کچھ چھین لیا۔ نادر شاہ نے تمام دولت سمیٹ کر ان دونوں حضرات کی جی بھر کر بے عزتی کی اور انہیں عوام کے سامنے ذلیل کیا۔

مال و دولت لے کر نادر شاہ تو واپس ایران چلا گیا لیکن سعادت خان اپنی بے عزتی سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ دکن کے گورنر نظام الملک کے ساتھ مل کر

دونوں نے خودکشی کا پروگرام بنایا۔ نظام الملک بھی بہت شاطر آدمی تھا۔ اُس نے اپنے مخالف سعادت خان سے جان چھڑانے کا موقعہ غنیمت سمجھا اور سعادت خان کو اس بے عزتی کے خلاف مزید بھڑکایا اور خودکشی میں اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ لہٰذا دونوں نے زہر پی کر خودکشی کا پروگرام بنایا۔ پروگرام کے مطابق زہر کے دو پیالے لائے گئے۔ سعادت خان نے اپنا پیالہ غٹا غٹ پی لیا۔ نظام الملک نے بھی اپنا پیالہ پینے کی اداکاری کی لیکن اس کا پیالہ خالی تھا کیونکہ اُس نے زہر لانے والے خادم کو بھاری انعام دے کر اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔ لہٰذا سعادت خان جس نے اپنے ملک، اپنی قوم اور سب سے بڑھ کر اپنے محسن کے ساتھ غداری کی تھی قدرت کے انصاف کی نذر ہو گیا وہ موقعہ پر ہی وفات پا گیا۔

سعادت خان نے اودھ پر کُل سات سال یعنی 1732ء سے لے کر 1739ء تک حکومت کی جتنی دولت اکٹھی کی تھی وہ سب چھین کر نادر شاہ لے گیا۔ اس کے باوجود اس کی موت کے بعد کسی نہ کسی طرح بچ جانے والی دولت کا اندازہ لگایا گیا تو وہ 90 لاکھ پونڈ سٹرلنگ سے کچھ زیادہ تھی اور یہ تخمینہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی معرفت لگوایا گیا تھا۔ اُس دور کے 90 لاکھ پونڈ سٹرلنگ کی دولت تو آج کے حساب سے کھربوں میں چلی جائے گی۔ بدقسمتی سے ہماری موجودہ تاریخ میں بھی بنگلہ دیش اور پاکستان کے کچھ لیڈرز جنہوں نے اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنی قوم اور اپنے ملک سے زیادتی کی اسی قسم کا انصاف ان کا مقدر بنا۔ سمجھنے والوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

نوابوں کی رنگین مزاجیاں

جب دہلی کے مغل فرمانروا آپس میں لڑ لڑ کر بہت کمزور ہو گئے تو دوسری بڑی طاقت پکڑنے والی مسلمان حکومت سلطنت اودھ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس سلطنت کے تمام حکمران بہت عیاش اور نااہل ثابت ہوئے۔ اس سلطنت کی بنیاد 1732ء میں سعادت خان نے ڈالی تھی جس نے اپنے کیئے کی سزا پائی۔ بقیہ تمام کے تمام لوگ انگریزوں کے باجگزار رہے۔ دولت اکٹھی کرنے اور عیاشی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے لیکن عوام کی فلاح و بہبود کا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی بیگمات کے لئے محلات بنوائے، باغات لگوائے لیکن لکھنؤ میں پہلا کالج انگریزوں نے ہی کھولا۔ انہیں اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ عوام کے لئے کوئی تعلیمی ادارہ کھول دیں یا عوام کی بھلائی کا کوئی کام کریں۔

ان نواب زادگان یا فرمانرواؤں میں ایک لاڈلے شہزادے تھے شہزادہ سلیمان جاہ جو 1827ء میں اپنے والد نواب غازی الدین حیدر کی موت کے بعد ناصرالدین حیدر کے نام سے اودھ کے فرمانروا بنے۔ والد نے 10 کروڑ روپے کی خطیر رقم خاندان کے لئے چھوڑی جو اس شوقین مزاج شاہ نے چند سالوں میں اڑا دی۔ ایک دفعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کمانڈر انچیف لارڈ کمبرمیئر (Lord Cumbermere) لکھنؤ آیا اور شاہ کا مہمان بنا۔ دوسرے دن ناشتے پر بادشاہ سلامت اور اس کی ملکہ تاج محل نے جو لباس زیب تن کیا انگریز دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس لباس کی قیمت کروڑوں روپے تھی۔ بادشاہ اور ملکہ دونوں ہیروں موتیوں اور جواہرات سے لدے ہوئے تھے۔ جسم کا کوئی حصہ ہیروں اور جواہرات سے خالی نہ تھا۔ کمانڈر انچیف کے سٹاف افسران یہ لباس دیکھ کر دنگ رہ گئے اور تفصیلات بیان کرنے کے لئے کئی صفحات خرچ کرنے پڑے۔

بادشاہ سلامت کو ہندوستانی لوگ اور اپنے عوام قطعاً پسند نہ تھے۔ ان کے تمام دوست مغربی لوگ تھے جن کی دوستی پر بڑا ناز تھا اور ان کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ یہ

شخص اتنے گھٹیا اور کمینے کردار کا مالک تھا کہ نہ تو اُسے عوام اور اس کے وزراء پسند کرتے اور نہ ہی اس کے دربار سے منسلک برطانوی ریذیڈنٹ کرنل سرجان لور (Colonel Sir John Lor) جو اس سے بات تک کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا اور اُس نے کئی دفعہ بادشاہ کی ملاقات کی درخواست پر ملنے سے انکار کر دیا۔ William Knighton اپنی کتاب "Private Life of an Eastern King" میں اُس کے کردار کے لئے debauched, vicious اور dissolute جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کی تمام تربیت خواتین اور خواجہ سراؤں کے ذریعہ سے کی گئی تھی لہذا بادشاہ بننے کے بعد بھی اُس کا دربار گھٹیا عورتوں اور خواجہ سراؤں سے بھرا رہتا تھا جنہیں مصاحبین کا درجہ حاصل تھا اور بادشاہ سلامت امور مملکت کے تمام مشورے ان ہی گھٹیا عورتوں اور خواجہ سراؤں سے کرتا تھا۔ بالفاظ دیگر یہی لوگ امور سلطنت کی نگرانی کرتے تھے۔

حیران کن اور قابل نفرت بات یہ ہے کہ بادشاہ سلامت کی پہلی ملکہ دہلی کے مغل بادشاہ کی بیٹی تھی جو کہ ایرانی النسل ہونے کے ناطے سے بہت خوبصورت اور پاکیزہ کرداری کی حامل خاتون تھی لیکن بادشاہ سلامت کو وہ کبھی بھی اچھی نہ لگی اور بادشاہ سلامت نے اپنی عیاشی کے لئے عورتوں اور خواجہ سراؤں کی ایک فوج پال رکھی تھی جن کی تعداد کئی سو تھی۔ بادشاہ کی رنگین مزاجی یا کردار کے لچر پن کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب بادشاہ سلامت کا منہ بولا بیٹا شہزادہ منا جان پیدا ہوا تو اس کی گندگی صاف کرنے کے لئے نیچ قوم کی ایک زلاری نام کی عورت بطور خادمہ رکھی گئی۔ یہ آوارہ بدمعاش اور فاحشہ قسم کی عورت تھی۔ محل میں ملازمت سے پہلے کئی گھٹیا مردوں سے تعلقات تھے۔ حتیٰ کہ اس کا ایک تین سال کا بیٹا بھی تھا جس کے باپ کے نام کا پتہ بھی نہ تھا۔ یہ چھٹی ہوئی اور شاطر فاحشہ عورت موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

ایک دن یہ بچے کو محل میں صاف کر رہی تھی کہ بادشاہ سلامت کا اُدھر گزر ہوا۔ بادشاہ کی نظر پڑی تو بادشاہ دل ہار گیا۔ نتیجتاً یہ فاحشہ عورت ملازمہ سے سینئر ترین ملکہ بن گئی اور بادشاہ نے اس کو ملکہ زمانی کے خطاب سے نوازا اور اُس عورت کا ناجائز بیٹا شہزادہ کیوان جاہ بن گیا۔ اس بازاری عورت نے بادشاہ کو اتنا قابو کیا کہ بادشاہ سلامت نے شہزادہ کیوان جاہ کو اپنا بڑا بیٹا تسلیم کیا اور سلطنت اودھ کا وارث۔ بادشاہ کی گھٹیا حرکات سے وزراء اتنے تنگ ہوئے کہ ایک وزیر نے بادشاہ کی منظور نظر دو بہنوں کے ہاتھ سے اُسے زہر پلوا دیا اور یوں عوام کی گلوخلاصی ہوئی۔ اودھ کے باقی شاہان کی تاریخ بھی اس سے مختلف نہیں ہے بدقسمت ہے وہ قوم جسے اس قسم کے فرمانروا نصیب ہوں عوام ان شاہوں کی عادات سے اتنے تنگ تھے کہ انگریزوں کی غلامی خوشی سے قبول کر لی۔

شاہان اودھ اس حد تک رنگین مزاج تھے کہ ہمیشہ عورتوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے مثلاً ناصرالدین حیدر کے والد گرامی غازی الدین حیدر نے 1814ء میں رسم تاج پوشی کے دن موقعہ کی مناسبت سے بہت ہی قیمتی لباس زیب تن کیا جو ہیرے جواہرات سے لدا ہوا تھا۔ بھرے دربار میں بادشاہ کی بڑی بیگم جس کا نام بادشاہ بیگم تھا کو کسی بات پر غصہ آ گیا۔ اُس نے سب مہمانوں کے سامنے بادشاہ سلامت کی پھینٹی لگا دی۔ قیمتی لباس پھاڑ دیا۔ ہیرے جواہرات نوچ ڈالے۔ حتیٰ کہ بادشاہ سلامت کے سر کے بال بھی نوچ ڈالے۔ سب درباری اُمراء و وزراء حیرانگی سے دیکھتے رہ گئے اور بادشاہ سلامت بذات خود ڈر اور خوف کی علامت بنے رہے کوئی کچھ نہ کر سکا۔ یہ خاتون اتنی طاقتور اور خودسر تھی کہ جب اسے اپنے منہ بولے بیٹے ناصرالدین حیدر فرمانروا اودھ کی اچانک

موت کی خبر ملی تو اُس وقت یہ اپنے بیٹے منا جان کے ساتھ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ موت کی خبر سن کر اپنے چند باڈی گارڈز اور منا جان کے ہمراہ زبردستی شاہی محل میں داخل ہوگئی۔ اور منا جان کو تخت پر بٹھا کر اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ کسی کو اسے روکنے کی جرأت نہ ہوئی بعد میں بڑی مشکل سے محمد علی شاہ نے ان دونوں کو تخت سے علیحدہ کیا۔

اس خانوادے کے آخری تاجدار واجد علی شاہ ثابت ہوئے جس نے 1847ء سے 1856ء تک برائے نام حکومت کی۔ واجد شاہ نے عیاشی میں اپنے تمام بزرگوں کو مات دے دی۔ اسے اپنے دربار سے یا رعایا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہر وقت عورتوں کی محفل میں مست رہتا تھا۔ اپنی بیگمات کے علاوہ 360 داشتائیں سرکاری طور پر رکھی ہوئی تھیں اور بادشاہ سلامت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اپنی تمام بیگمات اور داشتاؤں کو علیحدہ علیحدہ سجے سجائے اُن کی شان کے مطابق محل اور اپارٹمنٹ مہیا کیے۔ پوری سلطنت اس حد تک افراتفری، قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کا شکار ہوگئی کہ بالآخر عوام کی اپیل پر سلطنت کا نظم و نسق ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھال لیا اور یوں یہ عیش پسند شاہوں کا خاندان اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اپنے عبرتناک انجام کو پہنچا۔ ہمیں اب بھی فخر ہے کہ ہماری تاریخ بڑی شاندار ہے۔

کر بھلا ہو بھلا

تقریباً دو صدیاں پہلے کی بات ہے کہ آئرلینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے باہر ایک فلیمنگ نامی کسان کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ اُس کے کھیت کے نزدیک ایک ندی بہتی تھی جہاں اکثر لوگ مچھلیاں پکڑنے آتے تھے۔ بدقسمتی سے ندی کے کنارے کے ساتھ کچھ مقامات پر جنگل کی طرح کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جس میں جگہ جگہ خطرناک دلدل تھی۔ جو بھی بدقسمت انسان اس دلدل میں پھنس جاتا مشکل سے ہی بچ پاتا۔ اُس دن موسم صاف تھا اور ایسے موسم میں اکثر مچھلیوں کے شوقین شکاری اِدھر آجاتے تھے۔ اتنے میں فلیمنگ کو زور سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ فلیمنگ اُس طرف دوڑا۔ فلیمنگ نے دیکھا کہ ایک لڑکا دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن نکل نہیں پا رہا۔ فلیمنگ نے دوڑ کر اُسے باہر نکالا اور آئندہ اُسے اِدھر نہ آنے کی تاکید کی۔

دوسرے دن صبح صبح گھر پر دستک ہوئی۔ فلیمنگ نے دروازہ کھولا تو سامنے وہی لڑکا اور اُس کا باپ ایک قیمتی کوچ سے نیچے اُترے کھڑے تھے۔ لڑکے اور باپ نے آگے بڑھ کر فلیمنگ سے ہاتھ ملایا۔ اپنے بچے کی زندگی بچانے کا شکریہ ادا کیا اور ایک خطیر رقم شکریے کے طور پر فلیمنگ کے حوالے کی جو فلیمنگ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کوشش کے باوجود جب وہ فلیمنگ کو رقم نہ دے سکا تو شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ یہ شخص نزدیکی علاقے کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت یہ جاگیردار پھر حاضر ہوا اور فلیمنگ سے درخواست کی کہ اگر وہ نقد رقم بطور شکریہ وصول نہیں کرنا چاہتا تو اپنے چھوٹے بیٹے کو اُن کے حوالے کر دے وہ اُسے اپنے بیٹے کے ساتھ سکول میں پڑھانا چاہتے ہیں۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد فلیمنگ نے یہ پیشکش قبول کر لی اور اپنا بیٹا الگزینڈر فلیمنگ اُن کے حوالے کر دیا جسے جاگیردار نے اپنے بیٹے کے ساتھ سکول میں داخل کرا دیا۔ الگزینڈر پڑھ لکھ کر جوان ہوا تو ایک مشہور سائنسدان بنا اور پنسلین ایجاد کی۔ پنسلین اس دور میں نہایت اہم ایجاد ثابت ہوئی اور لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بچانے کی موجب بنی۔ خصوصاً جنگ کریمیا کے زخمی جو اس سے پہلے تڑپ تڑپ کر مر جاتے تھے لیکن اب

پنسلین کی وجہ سے بہت سے زخمیوں کو نئی زندگی ملی۔ قدرت کا کرنا ہوا کہ فلیمنگ کا محسن اور شفیق جاگیردار بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے نمونیہ تشخیص کیا۔ بہت علاج کیے گئے لیکن آرام نہ آیا۔ بالآخر الیگزینڈر فلیمنگ کو پتہ چلا وہ خود آیا اور پنسلین سے علاج شروع کرایا جس سے جاگیردار صحت یاب ہو گیا اور یوں الیگزینڈر کی ایجاد کردہ پنسلین جاگیردار کی نئی زندگی کا سبب بن گئی۔

برہمن سپاہی ڈونی چند

1849ء کے لگ بھگ جب انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں کو شکست دی تو اُس وقت سکھوں کا اندازِ حکمرانی اتنا کرپٹ ہو چکا تھا کہ انگریزوں کو مجبوراً اِس علاقے کی عنانِ حکومت سنبھالنی پڑی۔ جگہ جگہ اُنہوں نے چھاؤنیاں بنائیں۔ فوجی تربیت کے مراکز بنائے اور فوج کی جدید خطوط پر تنظیم نو کی۔ اِس علاقے کے لوگوں کی جو فوجی رجمنٹ منظم کی گئی اُسے پنجاب رجمنٹ کا نام دیا گیا۔ ویسے تو اِس رجمنٹ کے تربیتی مراکز کئی جگہ پر کھولے گئے تھے لیکن ایک اہم مرکز جہلم تھا۔ اُس دور میں فوجی بھرتی عام ہوا کرتی تھی۔ ہندو مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ایک دن ایک گورا چٹا خوبصورت برہمن نوجوان ڈونی چند بھرتی ہوا۔ فوجی تربیت کے دوران پتہ چلا کہ ڈونی چند ویسے تو بڑا اچھا سپاہی تھا لیکن بعض اوقات تربیت کے دوران ہی اُسے مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ اِس دورے کے دوران اُسکی آنکھیں ایک طرف کھنچ جاتی تھیں، منہ کا زاویہ ٹیڑھا ہو جاتا اور ایک کندھا دوسرے کندھے سے اِس انداز میں اوپر ہو جاتا کہ ڈونی چند کبڑا نظر آتا۔ اُس زمانے میں تمام افسر انگریز ہوتے تھے۔ ڈونی چند کو بڑا پسند کرتے تھے لیکن اُس کی بیماری سے پریشان تھے۔ لہٰذا اُسے فوج سے نکالنے کے لئے میڈیکل بورڈ کے سامنے بھیجا گیا۔ ابھی بورڈ کا ایکشن

آخری سلام

مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے

میجر آفتاب احمد

1958 اور 1971 کے مارشل لاء تو پاکستان کے دولخت ہونے کا سبب، پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور اس کی صفوں میں کردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلف کے تقاضوں کے عین مطابق ملک میں ایک اور فوجی اور صوبائی انتشار کے نقطۂ آغاز جنرل ضیاء الحق کے تیسرے مارشل لاء کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی عدیم المثال روایت ڈالنے کی جرأت رندانہ کی۔ اس ناقابلِ یقین انوکھے اور منفرد "جرمِ وفا" میں وہ حبسِ دوام کے مستحق ٹھہرے۔ ادھر جمہوریت کی بحالی کے بعد ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرم میں حاکمِ وقت بینظیر بھٹو نے بھی انہیں تین سال بلا مقدمہ سندھ کی جیلوں میں اسیر کیے رکھا۔

مکمل نہیں ہوا تھا کہ ذونی چند ٹریننگ سنٹر سے پاس آؤٹ ہو کر ایک انگریز آفیسر کے ساتھ بطور "بیٹ مین" جنوبی وزیرستان پوسٹ ہو کر چلا گیا اور بدقسمتی سے وہاں وزیری قبائلی کی گولی کا شکار ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد ذونی چند کا سابق پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر دونوں انگلینڈ چھٹی پر گئے۔ چھٹی کے دوران دونوں نے فرانس سیر کا پروگرام بنایا۔ اس سیر کے دوران دونوں فرانس کی مشہور "فلورنس آرٹ گیلری" گئے۔ وہ مختلف پینٹنگز دیکھ رہے تھے کہ اچانک سامنے ذونی چند کی تصویر نظر آئی مرگی کا حملہ ہوا ہوا! آنکھیں کھنچی ہوئیں، منہ کا زاویہ بدلا ہوا اور کندھے کا کب نکلا ہوا۔ ایک نے دوسرے ساتھی کو آواز دی "ذونی چند"۔ ذونی چند کی تصویر فلورنس آرٹ گیلری میں دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے۔ وہ آرٹ گیلری کے منیجر کے پاس گئے اور اس پینٹنگ کی تفصیل نکلوائی۔ پتہ چلا کہ یہ ذونی چند نہیں بلکہ سکندراعظم کی پینٹنگ تھی۔ اُسے بھی مرگی کا دورہ پڑتا تھا اور دورے کے دوران اس کی حالت بالکل ذونی چند والی ہو جاتی تھی یا بلکہ ذونی چند کی حالت بالکل سکندراعظم والی ہو جاتی تھی لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ کہاں سکندراعظم اور کہاں سپاہی ذونی چند۔ جبکہ دونوں کے دور حیات میں کم از کم دو ہزار سال کا وقفہ۔ لیکن قد، شکل وصورت اور مرگی کے دورے کے دوران کی حالت میں ذرا برابر فرق نہ تھا جس سے یہ دونوں آفیسرز بھی دھوکہ کھا گئے۔

دونوں آفیسرز سیر کر کے واپس آ گئے لیکن سکندراعظم اور ذونی چند کی مشابہت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ پھر ایک دن کمپنی کمانڈر میجر رابرٹ جہلم میں سکندراعظم کی یونانی تاریخ پڑھ رہا تھا کہ اُسے اچانک ایک قصہ ملا جو شاید اس مشابہت کا حل ہو۔ قصہ اس طرح تھا کہ جب سکندراعظم نے دریائے جہلم عبور کر کے راجہ پورس کو شکست دی تو اس کے سپاہی اتنے تھک چکے تھے کہ وہ آگے جانے کے لئے تیار نہ تھے۔ لہٰذا سکندراعظم کو کچھ دن وہاں رکنا پڑا۔ اُسے فوج کے لئے ہاتھیوں کی بھی سخت ضرورت تھی اس نے حکم دیا کہ اس علاقے میں جتنے بھی ہاتھی ہیں انہیں پکڑ لیا جائے۔ جب یہ کارروائی جاری تھی تو سکندراعظم کے پاس ایک نوجوان بے حسن لڑکی پیش ہوئی۔ سکندراعظم حیران تھا کہ یہ لڑکی کس طرح سب وزراء اور پہرداروں کو جل دے کر اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ لڑکی کی عقلمندی اور بہادری دونوں قابل تعریف تھیں کیونکہ کوئی شخص سکندراعظم کے ڈر سے اس کے سامنے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک عام آدمی کے لئے اس کا رعب اور دبدبہ ناقابل برداشت تھا لیکن یہ لڑکی سب پابندیاں توڑتی ہوئی بغیر کسی ڈر اور خوف کے اتنے بڑے فاتح کے سامنے پہنچ گئی تھی اور مزید حیران کن بات یہ تھی کہ یہ لڑکی بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ سکندراعظم نے اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا حسن ایسا مسحور کن تھا کہ سکندراعظم جیسا دلیر فاتح بھی دل ہار بیٹھا۔

سکندراعظم نے لڑکی سے وہاں آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بغیر کسی خوف کے گزارش کی کہ ان کے پاس صرف ایک ہاتھی ہے۔ باپ بوڑھا ہے۔ روزی کا واحد ذریعہ وہ ہاتھی ہے اگر وہ پکڑا گیا تو اس کا تمام خاندان بھوک سے مر جائے گا۔ لہٰذا اس کی گزارش تھی کہ ان کا ہاتھی نہ پکڑا جائے۔ سکندراعظم تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا اس نے یہ درخواست فوری قبول کی لیکن اس شرط پر کہ لڑکی کو کچھ دن سکندراعظم کے پاس بطور بیوی رہنا ہوگا اور ظاہر ہے سکندراعظم کو کون انکار کر سکتا تھا۔

اب میں یہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ آیا ان دو واقعات میں کوئی کڑی مل سکتی ہے یا نہیں۔

(عسکریت پسندیاں)

سلسلہ وار کہانی

حرزنداں

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت۔

رزاق شاہد کوہلر

بیسویں قسط

بابا جان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ میری جانب یوں حیرانی سے دیکھ رہے تھے گویا میں ان کا بیٹا نہیں، دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں..... حاضرین محفل میں بھی زیادہ تر کے چہرے پر تعجب کے آثار ہویدا تھے..... اور اس کی وجہ میرے کندھے سے لٹکی ہوئی کلاشن کوف تھی جس کی بیرل کسی قلم کی طرح ترشی ہوئی تھی..... گو اس گن سے میں صحیح طریقے سے فائر کرنا بھی نہیں جانتا تھا لیکن میرا لمبا تڑنگا قد اور صحت مند جسم کلاشن کوف کے ساتھ بہت بارعب نظر آ رہا تھا۔ بچپن میں بابا جان مجھے رائفل اور پستول سے کئی بار فائر کرا چکے تھے مگر جب سے میں ہاسٹل گیا تھا مجھے ہتھیار کو چھونا تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔

"شیر دل! تو آ گیا ہے۔" بابا جان ایک جھٹکے سے اٹھے اور دونوں بازو پھیلا کر میری جانب بڑھے..... فرط مسرت سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"ہاں بابا جان! ابھی ابھی پہنچا ہوں۔" میں ان کی پُرشفقت آغوش میں سماتے ہوئے بولا۔

"آؤ بیٹھو....." انہوں نے میرے ماتھے پر بوسا دیتے ہوئے مجھے اپنی نشست کی طرف کھینچا..... ان کے لہجے میں اب بھی حیرانی جھلک رہی تھی..... مگر اس محفل میں وہ کوئی ایسا سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے جس سے ان کی حیرانی دور ہو سکتی۔

میں ان کی بغل میں بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"بابا جان! ایک چھوٹے سے مسئلے کے لیے اتنے معزز سرداروں کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بابا کی جان! یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے؟" بابا جان کے لہجے میں شامل محبت میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

"بابا جان! ایک تھرڈ کلاس اچکے کے لیے ہم دونوں بھائی اور آپ کی دعائیں کافی ہیں۔" میرے لہجے میں شامل اعتماد محفل میں موجود غیروں کے ساتھ میرے اپنوں کے لیے بھی حیران کن تھا۔ "بہرحال اگر آپ نے ان معزز سرداروں کو مشورے کے لیے بلایا ہے تو بہت بہتر کیا ہے..... ان کی وجہ سے باقیوں کو بھی پتا چل جائے گا کہ اس سارے فساد کی جڑ ایک نام نہاد ایم پی اے ہے۔"

بابا جان مسکرائے۔ "شیر دل خانا! تم نہیں تھے نا! ایک تمہاری کمی پوری کرنے کے لئے ان سب کو اکٹھا کیا تھا..... اب تم آ گئے ہو تو انہیں احترام سے رخصت کیے دیتا ہوں..... یوں بھی میں اپنا مسئلہ انہیں بیان کر چکا ہوں..... اب تو بس فیصلہ سنانا تھا۔ اور بخدا ان سرداروں کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلایا۔ انہیں بس یہ اطلاع دینے کے لیے زحمت دی ہے کہ صمد خان نے تین بار جارحیت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم نے صرف دفاعی حکمت عملی اپنائی ہے۔ چوتھی بار ہم اسے ایسا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"نہیں بابا جان! ہم اس کی پہلی غلطی بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں..... بس کھانا شروع کرنے کا حکم دیں تاکہ اس کے بعد معززین کو رخصت کیا جا سکے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا....." بابا جان میری کسی بات سے اختلاف نہیں کر رہے تھے..... ان کے لیے میرا اعتماد بے بہا درانہ لہجہ کسی سپنے جیسا تھا۔

"سردارزادے شیر دل خان! اتنی جلدی یوں بے لچک فیصلہ سنا دینا میرے نزدیک مناسب نہیں ہوگا؟" سردار لیس جان مدبرانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"محترم چچا جان! آپ جانتے ہیں ہم قبائلیوں کے قاعدے اور قوانین پتھر پر لکیر ہوتے ہیں۔ ہم اصولوں پر سودا بازی نہیں کر سکتے..... کسی کی بڑی سے

بڑی خطا معاف کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں مگر جب کوئی کوئی غیر ہم سے مدد کی درخواست کرے تو پھر معاملہ اس غیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے ہماری حیثیت دشمن سے مقابلہ کر کے اس آدمی کو انصاف دلانے والی ہوتی ہے۔ صمد یار خان کے معاملہ میں بھی یہی بات ہوئی ہے...... بابا جان نے آپ لوگوں کو زحمت دی تھی تاکہ علاقے کا امن و امان ہماری وجہ سے تباہ نہ ہو، کیونکہ صمد یار خان تین بار پہل کر چکا ہے اور بخدا بات یہیں تک محدود ہوتی تو کچھ نہ ہوتا، ہم اس کی یہ تمام غلطیاں ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتے کہ وہ کوئی خاندانی وجاہت نہیں رکھتا...... ایک تھرڈ کلاس شخص ہے، بیج سوچ کا مالک۔ ایسے آدمی کی دشمنی بھی سردار دلاور کے وقار پر دھبہ ہے..... مگر اب بات ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ میں ابھی پشاور سے آرہا ہوں...... کل داؤد خان جو کہ صمد یار خان کا بھتیجا ہے، اس سے بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی ہے..... اس نے صمد یار خان کے خلاف ہماری مدد مانگی ہے اور سردار دلاور خان کا جانشین ہونے کے ناطے میں نے ہامی بھر لی ہے، اس لیے اب بات ہمارے ہاتھ میں نہیں رہی۔"

نبیل جان او چھا وار کرتے ہوئے بولا۔ "سردار زادے شیر دل خان! آپ جانشین ہیں مگر ابھی تک وارث زندہ بیٹھا ہے...... بغیر اس کی اجازت کے آپ کو کسی کی مدد کرنے کی ہامی نہیں بھرنی چاہیے تھی؟"

"چچا جان! جانشین وہی ہوتا ہے جو وارث کی غیر موجودگی میں فیصلہ کرے...... اور جب داؤد خان نے مدد کی درخواست کی تو وہاں بابا جان حاضر نہیں تھے...... اور بالفرض موجود ہوتے تب بھی دلاور خان کا فیصلہ یہی ہوتا...... کیوں بابا جان؟" نبیل جان کو جواب دے کر میں بابا جان سے مستفسر ہوا۔

"نبیل جان! شیر دل خان کا فیصلہ ہم قبائلیوں کی ثقافت و مزاج کے حسب منشاء ہے..... میرا نہیں خیال کہ آپ کے پاس کوئی سوالی آئے اور آپ اسے خالی لوٹا دیں؟" بابا جان پُر رعب لہجے میں نبیل خان سے مخاطب ہوا تھا۔

نبیل جان نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "صحیح کہا دلاور خان! میں بس سردار زادے شیر دل کا امتحان لے رہا تھا؟"

"مہر دل خان! کھانا لگواؤ۔" میں چھوٹے بھائی سے مخاطب ہوا......

مہر دل کافی دیر سے ششدر سا میری گفتگو سن رہا تھا۔ "جی بھائی جان!" کہہ کر اٹھ گیا۔

پُرتکلف دعوت کے بعد ہم نے تمام مہمانوں کو رخصت کیا۔ مسکراہٹ بابا جان کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی...... وہ ہر چند منٹ بعد میرے کندھے کے گرد بازو پھیر کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتے...... آخری مہمان کے رخصت ہوتے ہی وہ بول اٹھے۔

"شیر دل خانا! دل خوش کر دیا...... آج تُو نے میرے دل سے موت کا خوف نکال دیا۔"

میں مسکرایا۔ "بابا جان! مرنے سے تو آپ پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے؟"

"نہیں یار! تیرے ڈراموں نے ڈرا دیا تھا۔"

"بابا جان! میرا خیال تھا لوگ محبت کی زبان سمجھ جائیں گے؟"

مہر دل مسکرایا۔ "سمجھ تو جاتے ہیں بھائی جان...... مگر ڈنڈے کی زبان عام فہم ہے...... ذرا جلدی سمجھ آتی ہے۔"

بابا جان قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ "شیر دل خان! سن لیا...... مہر دل کیا کہہ رہا ہے؟"

"جی بابا جان! سن بھی لیا اور سمجھ بھی گیا ہوں؟"

"میرا دل چاہتا ہے میں پورے علاقے کی دعوت کروں؟"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیوں بابا جان؟"
"شیر دل خان! تم نہیں جانتے آج میں کتنا خوش ہوں..... آج سارے علاقے کے سردار مجھے اتنے حقیر نظر آ رہے تھے کہ لگتا تھا میں انہیں چٹکی میں مسل سکتا ہوں..... آج میرے دونوں بازو مکمل ہو گئے ہیں، بس آج میں بہت خوش ہوں۔"
مہر دل خان چہکا۔ "بابا جان! میں بھی بہت خوش ہوں....."
میں نے کہا۔ "بابا جان! آپ گھر چلیں..... میں اور مہر دل ذرا پہاڑ کے دامن سے ہو کر آتے ہیں۔"
"بعد میں چلے جانا۔" شاید بابا جان مجھے نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔
میں مصر ہوا۔ "نہیں بابا جان ابھی ضروری ہے نا؟"
"ایسی بھی کیا ضرورت ہے یار!؟"
"بابا جان! اصل میں کافی وقت گزر گیا ہے کہ میں نے ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا..... آج ذرا مہر دل خان کے ساتھ پریکٹس کرنا چاہتا ہوں؟"
"واہ! دل خوش کر دیا شیر دل خانا! ضرور جاؤ....." بابا جان نے جھٹ اجازت دے دی۔
ہم دونوں بھائی وہیں سے پہاڑ کے دامن کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے..... مہر دل خان نے کسی ماہر اتالیق کی طرح مجھے کلاشنکوف کے بارے بریف کرنا شروع کر دیا۔ میری رگوں میں بھی ایک قبائلی پٹھان کا خون دوڑ رہا تھا، گن کے بارے سمجھتے ہوئے مجھے چنداں دشواری پیش نہ آئی۔ اور پھر اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہم نے نشانہ بازی کا مقابلہ کیا تینوں دفعہ مہر دل خان جیت گیا تھا مگر مجھے کلاشن کوف کے استعمال کی اچھی طرح سمجھ آ گئی کہ کیسے شست باندھوں اور کس طرح فائر کروں۔
بابا جان کی طرح مہر دل خان بھی میری اس کایا پلٹ پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں میرے لیے احترام اور عقیدت در آئی تھی گھر پلٹنے سے پہلے میں نے مہر دل کو کہا کہ آخری بار پلاسٹک کی بوتل پر نشانہ لگاتے ہیں..... وہ مان گیا۔ وہاں پڑی دو پرانی کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں ہم نے بطور ٹارگٹ زمین میں گاڑیں اور پھر سو گز کے فاصلے سے اپنے اپنے ٹارگٹ سے فائر کرنے لگے۔ پانچ پانچ فائر کر کے ہم بھاگتے ہوئے ٹارگٹ کے قریب پہنچے..... مہر دل خان کے ٹارگٹ میں پانچوں گولیوں کے سوراخ بنے تھے جبکہ میرے ٹارگٹ پر چار سوراخ بنے ہوئے تھے اور پانچویں گولی پلاسٹک کی بوتل سے رگڑ کھاتے ہوئے گزری تھی۔
"یہ دیکھو پانچویں گولی بھی ہٹ ہے۔" میں نے مہر دل کو گولی کی رگڑ کی طرف متوجہ کیا۔
"نہیں جناب! یہ گولی ٹارگٹ سے چھو کر ضرور گزری ہے، مگر اسے ہٹ نہیں کہہ سکتے۔"
"ہٹ کیوں نہیں ہے۔ تمہاری یہ گولی بھی تو بس بمشکل ہی ٹارگٹ کو ہٹ کر پائی ہے۔" میں نے اس کی ایک گولی پر اعتراض جڑا۔ "اگر میری گولی ایک سنٹی میٹر بھی دائیں ہوتی تو ٹارگٹ میں ضرور سوراخ کر دیتی۔"
"بات سنٹی میٹر یا ملی میٹر کی نہیں ہوتی بھائی جان۔" وہ مسکرایا۔ "گولی کے رگڑ کھا کر گزرنے سے دشمن کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔"
"اس حساب سے تو تمہاری گولی نے بھی بس دشمن کے بازو ہی کو زخمی کیا ہے۔"
"چاہے بازو ہو..... دشمن کا نقصان تو ہوا ہے نا؟"
"اگر گولی بازو سے رگڑ کھا کر گزرے تب بھی خراش تو لگ ہی جاتی ہے..... اور گولی سے لگنے والی خراش بھی لازماً باعث تکلیف ہوتی ہے..... حساب برابر۔" میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔
"نہیں بھائی جان! اپنی شکست تسلیم کر لو۔"

"پہلے تین مقابلوں کی ہار میں نے تسلیم کر لی تھی... یہ برابر رہا۔"

"گولیاں ختم ہو گئی ہیں... ورنہ ایک اور مقابلہ ضرور کرتے۔" مہر جان نے کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے..... گھر میں بھی ہماری بحث جاری رہی... زرغونہ میری طرف داری کر رہی تھی جبکہ امی جان کا ووٹ مہر دل کی طرف تھا..... بابا جان بس مسکرا کر ہماری بحث سنتے رہے۔ جب ہم دونوں نے بابا جان سے ثالثی کرانا چاہی تو کہنے لگے.....

"بھئی! اگلے ہفتے سلیم جان کی شادی ہے..... اور اس بات کا فیصلہ وہیں شادی پر ہوگا۔"

سلیم جان ہمارا خالہ زاد تھا۔ اور ہمارے ہاں شادیوں پر کچھ اور ہو نہ ہو نشانہ بازی کا مقابلہ ضرور ہوتا ہے۔

"ٹھیک ہے بابا جان!" ہم دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

☆☆☆

منظر میرا دیکھا بھالا تھا..... وہی خوش نما پھول خوش رنگ سبزہ، پھل دار درخت، بہتے جھرنے، چہچہاتے پرندے..... آسمان پر تیرتی دودھیا بدلیاں..... ہلکی ہلکی چلنے والی خوشگوار ہوا..... اور پھر وہ سبک قدموں سے چلتی ہوئی پھولوں کے کنج سے نمودار ہوئی..... آج اس کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ کھل رہی تھی..... اس کی مسکراتی آنکھیں دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہونے لگا مگر میرے ہونٹ حسب سابق سلے رہے۔ وہ مجھ سے دو تین گز دور رک گئی... چند لمحے میری جانب دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے پانچ انگلیاں دکھائیں اور پھر نفی میں سر ہلا کر انگوٹھا ہتھیلی کی جانب موڑ کر چار انگلیاں کھلی رہنے دیں۔

ایک جھماکے سے میرے ذہن میں مہر دل کے ساتھ ہونے والی بحث تازہ ہو گئی..... وہ مجھے اشارے سے بتا رہی تھی کہ ٹارگٹ پر میری چار گولیاں لگی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی ہنسی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میری نشانہ بازی کی پریکٹس سے اسے خوشی ہوئی تھی۔ اور پھر وہ جس سمت سے آئی تھی اسی طرف واپس چل دی، میں نہ تو اسے آواز دے سکا اور نہ اس کا تعاقب کر سکا۔ اس کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی....

بقیہ رات میں اس کے خیالوں میں کھویا رہا... اس کا نام سائرہ تھا.....خاندانی لحاظ سے وہ میری ہم پلہ تھی ایف اے کی طالبہ تھی اور اسے بھی میرے خواب آتے تھے..... جبکہ صمد خان اسے اپنی بہو بنانا چاہتا تھا.... زبردستی اسے اغوا کیا ہوا تھا..... جانے قید میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا تھا؟... گو صمد یار خان کا ارادہ اسے بہو بنانے کا تھا اس لحاظ سے امید کی جا سکتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں ہو رہا ہوگا، مگر پھر بھی قید تو قید ہوتی ہے..... اور یوں اپنے کم عمر بیٹے سے زبردستی اس کی شادی کرتا؟ میرا دماغ کھولنے لگا، میں صمد یار خان کی ساری غلطیاں معاف کر سکتا تھا لیکن سائرہ کو اغوا کرنے کی خطا معاف ہونے کے قابل نہیں تھی، میری ذہنی رو صمد یار خان سے انتقام لینے کے طریقوں کی طرف بہنے لگی اور انہی خیالات میں مجھے صبح کی اذان سنائی دی۔

وضو کر کے میں محلے کی مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

نماز پڑھ کر میں گھر آیا امی جان کچن میں مصروف تھیں، کیونکہ بابا جان نماز پڑھتے ہی قہوہ پیتے اور پھر زمینوں کی طرف نکل جاتے..... میں کچن ہی میں گھس گیا، زرغونہ بھی اسی وقت کچن میں داخل ہوئی..... اس نے سفید دوپٹا نماز کے انداز میں اوڑھا ہوا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی... البتہ میں عموماً نماز پڑھ کر دوبارہ سو جایا کرتا تھا ... آج خلاف توقع مجھے صبح صبح کچن میں گھستا دیکھ کر زرغونہ نے پوچھا۔

"بھیا! خیر تو ہے؟"

"ہاں خیر ہی ہے..... بس بھوک لگی تھی سوچا گڑیا کے ہاتھ کا بنا پراٹھا ہی کھالوں؟"

"آپ بیٹھیں..... بس دو منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔" وہ فریج کھول کر گوندھا ہوا آٹا باہر نکالنے لگی۔ میں وہیں چوکی پر بیٹھ گیا۔

"اماں! بابا جان کو چائے کا عادی کرو نا؟..... یہ کیا صبح صبح اتنا کڑوا قہوہ پیتے ہیں۔"

امی مسکرائی۔ "تم خود کہو نا اسے..... میں اب اس عمر میں اس سے جھگڑتی اچھی لگوں گی؟"

"جھگڑنے کا تو نہیں کہا؟..... سمجھانے کا مشورہ دیا ہے۔"

"تمہارے بابا جان کو سمجھانے کا مطلب ہے اس سے جھگڑنا۔"

"اچھا ایسا ہے تو آج میں ان کے لیے چائے لے جاتا ہوں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟"

"مذاق مذاق میں مارے جاؤ گے ان کے ہاتھ سے۔" امی جان قہوے کی کیتلی اٹھائے ابو جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"بھیا! ایک بات پوچھوں؟" زرغونہ نے توے پر کپڑا پھیر کر صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں نہ کہوں پھر بھی تو نے پوچھنی تو ہے۔ پھر اجازت مانگنے کی ضرورت؟"

زرغونہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "بھیا! مجھے، بلکہ ہم سب کو سمجھ نہیں آرہی آپ ایک دم بدل کیسے گئے؟"

"خود نہیں بدلا..... مجھے بدلنے پہ مجبور کیا گیا ہے؟"

"کس نے بابا جان کی باتوں اور مہرول کے رویے نے؟"

"نہیں صرف ان باتوں سے شاید میں نہ بدلتا..... ان کے علاوہ بھی کافی محرکات ہیں۔"

"اس میں خوابوں والی بھابی کا ہاتھ تو نہیں ہے؟" زرغونہ کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں..... وہ بھی اس کار خیر میں شامل ہے..... صمد یار خان کا حقارت بھرا سلوک بھی، بابا جان کا درشت رویہ بھی، مہرول خان کا بدتمیزانہ انداز بھی..... اور بھی چند باتیں ایسی ہوئیں کہ مجھے اپنے اطوار بدلنے پڑے..... اور یقیناً یہ بہتر ہوا ہے..... میں جس ڈھنگ سے زندگی گزارنا چاہتا تھا ایسا شاید کہانیوں ہی میں ممکن ہے، حقیقی زندگی میں تلخیاں بھری ہوئی ہیں..... ہر موڑ پر ایسے مفاد پرستوں سے واسطہ پڑتا ہے جنہوں نے مکر و فریب کی ردائیں اوڑھ رکھی ہیں..... کچھ ایسے ظالم ہیں جنہیں کمزوروں پر ظلم کرتے ہوئے لذت آتی ہے..... مجبوروں اور بے کسوں پر ظلم ڈھانا ان کا مشغلہ ہے۔ ایسے حالات میں اگر میں نہ بدلتا تو مارا جاتا..... اور جانتی ہو میرے مرنے پر بابا جان کو یقیناً خوشی ہوتی..... ان کے نزدیک، بزدل بیٹے کی زندگی سے، موت بدرجہا بہتر ہے۔"

"خیر ایسا بھی نہیں تھا..... " زرغونہ نے میرے سامنے رکھی چھوٹی سی میز پر پراٹھا اور ہاف فرائی انڈا رکھتے ہوئے کہا۔ "بابا جان کو آپ کی ادائیں ناپسند سہی مگر وہ آپ کی موت کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے تھے، وہ اپنی ساری اولاد میں سب سے زیادہ آپ کو چاہتے ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... مگر یقینی طور پر انہیں میری بزدلی سے نفرت تھی۔"

"وہ تو مجھے بھی تھی۔" زرغونہ اپنے دودھ میں پتی اور شکر ڈالنے لگی۔

"ہاں گڑیا! کسی بھی چیز کی افراط کو لوگ عموماً پسند

نہیں کرتے میں کچھ زیادہ ہی ڈرپوک ہو گیا تھا۔ اور پتا ہے ایک بار تو جھگڑے کی آوازوں اور فائر سن کر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"اچھا بھیا! حنا کیسی لڑکی ہے؟" اس نے اچانک ایک غیر متعلق سوال پوچھا۔

"تمہاری مراد ارشد کی بہن حنا سے ہے تو وہ نہایت خوب صورت اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔"

"مطلب مجھے بھابی ڈھونڈنے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی؟"

"ہاں...... اس کی اور مہرو کی جوڑی خوب جچے گی۔"

"بھیا! یہ کیا؟ بات تو آپ کی ہو رہی تھی۔" وہ شکوہ کناں ہوئی۔

"زرغونہ! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ایک بات کہی تھی؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون سی بھیا!؟"

"یہی کہ ... کیا میرے بدلنے میں خوابوں والی بھابی کا ہاتھ تو نہیں ہے؟"

"تو بھیا!؟" وہ ابھی تک میرا اشارہ نہیں سمجھی تھی۔

"تو یہ کہ میری دو شادیاں کرانا چاہتی ہو؟...... کبھی تو خوابوں والی کو بھابی کہتی ہو اور کبھی حنا کا تعلق مجھ سے جوڑتی ہو؟"

زرغونہ جلدی سے بولی۔ "وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔"

"مگر میں نے مذاق نہیں کیا، زرغونہ عرف ننھی سسٹر صاحبہ! وہ خوابوں والی گزشتہ کل بھی تمہاری بھابی کے عہدے پر فائز تھی اور آنے والے کل بھی وہی اس نشست پر براجمان رہے گی۔"

"بھیا! خواب بھی کبھی حقیقت ہوئے ہیں۔"

"بہنا! وہ خواب نہیں حقیقت ہے...... اس کا نام سائرہ ہے، فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے، گجرات کے چوہدری فرمان علی کی بیٹی ہے۔"

"سچ بھیا!" زرغونہ قہقہہ چیختے ہوئے میرے کندھے سے چمٹ گئی تھی۔

"ہاں گڑیا!" میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "یہ سچ ہے...... اور جانتی ہو وہ اس وقت کہاں ہے؟"

زرغونہ نفی میں سر ہلا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"وہ اس خبیث شخص کی قید میں ہے جس کا نام صمد یار خان ہے...... اور جو میرے نزدیک اس کائنات کا مبغوض ترین شخص ہے۔"

"بھیا! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے اندر ایک دم آنے والی تبدیلی میں سائرہ بھابی کا کردار نمایاں ہے۔"

"تم! ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہو؟...... مگر حقیقت یہی ہے کہ سائرہ کی کہانی معلوم ہونے سے پہلے میں ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا...... ایک ایسے آدمی کو جس نے بابا جان کو گالی بکنے کی جسارت کی تھی۔"

"مطلب آپ بابا جان کو اپنی سائرہ سے بھی زیادہ چاہتے ہیں؟"

"زرغونہ! یہ تمہیں کس نے کہا کہ پیار کو ناپا تولا جا سکتا ہے...... کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہیں بابا جان زیادہ پیارے ہیں، امی جان یا میں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر میں کیا بتاؤں کہ بابا جان مجھے زیادہ عزیز ہیں یا سائرہ...... دل میں ہر ایک کا اپنا مقام اور اپنا مرتبہ ہوتا ہے اور یاد رکھو احساس سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں...... مثلاً اگر کسی آدمی نے کبھی کھجور نہ کھائی ہو تو تم اس کے سامنے الفاظ میں کھجور کی مٹھاس کی وضاحت نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ کھجور میٹھی ہوتی ہے اور بس۔"

وہ ہنسی۔ "تو یہی وضاحت ہوئی نا بھیا! کہ کھجور میٹھی ہوتی ہے۔"

"وضاحت کیسے ہوئی..... اگر وہ پوچھے کیا کھجور سیب کی طرح میٹھی ہوتی ہے تو تم کیا کہو گی؟ نہیں نا؟..... وہ پوچھے آلو بخارے، ناشپاتی، انار کی طرح میٹھی ہوتی ہے؟..... تب بھی تمہارا جواب نہ ہی ہوگا۔ بتاؤ بھلا کیا کہو گی؟"

زرغونہ نے منہ بنایا۔ "بھیا! پتا نہیں آپ نے مجھے کن باتوں میں الجھا دیا..... آپ مجھے سائرہ بھابی کے بارے بتا رہے تھے..... آپ نے اسے کہاں سے ڈھونڈا..... اور پھر چوہدریوں کی لڑکی کو اس خبیث نے کیسے اغوا کرلیا؟"

"لمبی کہانی ہے محترمہ! بعد میں سناؤں گا..... فی الحال تو میں فائر کی پریکٹس کے لیے جا رہا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ چھوٹے بھائی کے ہاتھوں تماشا بن جاؤں۔"

"فائر پریکٹس؟..... تماشا؟..... میں کچھ نہیں سمجھی بھیا؟"

"بھلکو! کل بابا جان کیا کہہ رہے تھے کہ سلیم جان کی شادی پر ہونے والی نشانہ بازی میں میرا اور مہر جان کا بھی مقابلہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بھیا! مگر یاد رکھنا رات کو اس وقت تک سونے نہیں دوں گی جب تک ساری کہانی تفصیل سے سن نہ لوں۔"

"ٹھیک ہے محترمہ! سن لینا۔" میں مسکراتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا۔

آدھا گھنٹا پیدل چلنے کے بعد میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر بطور ٹارگٹ ایک بڑی چٹان پر رکھ کر میں نشانہ بازی کی پریکٹس کرنے لگا..... اور جب تک گولیاں ختم نہ ہوگئیں میں پریکٹس میں مگن رہا۔ آخری گولی فائر کرنے کے بعد میرے قدم گھر کی طرف اٹھ گئے۔ آج فائر کرتے ہوئے میری ساری جھجک دور ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ نشانہ بھی پہلے سے زیادہ بہتر ہوگیا تھا..... یوں بھی نشانہ بازی کے لیے ایک بار فائر کے طریقہ کار کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد سارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اور نشانے کا اچھا برا ہونے کا تعلق پریکٹس سے زیادہ قدرتی مہارت پر ہوتا ہے۔ گو پریکٹس ہی ایک انسان کو مکمل کرتی ہے مگر کچھ چیزیں پریکٹس کے ساتھ ساتھ قدرتی مہارت کی بھی متقاضی ہوتی ہیں اور نشانہ بازی بھی ان میں سے ایک ہے۔

بابا جان صحن میں بچھی چارپائی پر براجمان دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

"آؤ شیر دل خانا! کھانا کھا لو۔" مجھے دیکھتے ہی انہوں نے خوش دلی سے پکارا۔

اور میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" بابا جان نے روٹیوں کا چھابا میری جانب کھسکایا۔

"نشانہ بازی کی مشق کر رہا تھا بابا جان!"

"واہ جی واہ..... شیر دل خانا! لگتا ہے تجھے اب پتا چل گیا ہے کہ ہتھیار کی ایک پٹھان کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے؟"

"ہاں بابا جان! اور دیکھ لینا مقابلے میں آپ کے بیٹے سے کون جیتتا ہے؟"

"ہا..... ہا..... ہا....." بابا جان نے قہقہہ لگایا۔ "خیال رکھنا پتر! مہر دل خان اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں سے نہیں ہے؟"

"اسے بھی دیکھ لوں گا بابا جان!"

"اچھا یارا! وہ صمد یار خان کے بھتیجے کے متعلق تم کل کچھ کہہ رہے تھے؟"

"بابا جان! پرسوں وہ ملا تھا اور اس نے مجھے کافی

تفصیل سے صمد یار خان کے متعلق بتایا ہے، وہ صمد یار خان کا جانی دشمن ہے...... اس کے علاوہ گجرات کا ایک جاگیردار خاندان بھی صمد یار خان کا دشمن ہے۔ اس خاندان کے ایک جوان سے بھی تفصیلی بات چیت ہوئی ہے......" میں نے جزئیات حذف کر کے اہم تفصیل باباجان کے گوش گزار کر دی۔

بات مکمل ہونے تک ہم دونوں کھانے سے بھی فارغ ہو گئے تھے۔ زرغونہ باباجان کے لیے قہوہ اور میرے لیے چائے لے آئی۔

قہوے کی چسکی لیتے ہوئے باباجان نے کہا۔

"شیر دل خان! صمد یار خان بہت گھٹیا اور پنچ شخص ہے...... جو شخص اپنے سگے بھائی کو دولت کے لیے قتل کر دے، نفسانی خواہشات کے لیے اپنے خالہ، خالو کا گلا کاٹ دے، ایسے شخص میں بھلا کب انسانیت ہو سکتی ہے۔ اور یقین مانو ایسے آدمی کا زیرِ زمین چلے جانا زمین کے اوپر رہنے سے کئی گنا بہتر اور مفید ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں باباجان!" میں نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔

"کیا گپ شپ ہو رہی ہے بھئی؟" مہر دل خان گھر میں داخل ہوتے ہی چہکا۔

"باباجان سے نشانہ بازی کے گر پوچھ رہا تھا یار!"

"پھر کیا بتایا باباجان نے؟" مہر جان موڑھا لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ اپنی کلاشن کوف اس نے گود میں رکھ لی تھی۔

میں مسکرایا۔ "تمھیں کیوں بتاؤں؟"

"بھیا! کھانا لے آؤں؟" زرغونہ نے مہر دل کو ہمارے ساتھ بیٹھے دیکھ کر دور سے ہانک لگائی۔

"ہاں لے آؤ..." اسے کہہ وہ ہماری جانب متوجہ ہوا۔ "اور آپ...؟"

"ہم نے کھا لیا ہے۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"شیر دل خان! داؤد خان اور چوہدری جی کو بھی

سلیم خان کی شادی کا دعوت نامہ بھیج دیا ہوتا۔ اسی بہانے ان سے گپ شپ بھی ہوجائے گی اور صمد یار خان کے خلاف آئندہ کا لائحہ عمل بھی تیار کر لیتے..... اب اس خبیث کو مزید مہلت دینا مناسب نہیں لگتا..... اس کے آدمی دو بار مہردل خان پر قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں..... گو اس کا نقصان خود انہی کو پہنچا مگر انہوں نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو کی ہے نا؟"

"ٹھیک ہے باباجان! میں ابھی انہیں فون کر دیتا ہوں۔" میں موبائل فون نکال کر داؤد خان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے شادی سے زیادہ باباجان سے ملاقات کا شوق تھا..... بغیر کسی حجت کے وہ جھٹ تیار ہو گیا..... اس کے بعد میں نے عدنان حیدر چوہدری سے بات کی۔ عدنان نے بھی ہامی بھرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے والد صاحب کو بھی ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا۔

رابطہ منقطع کر کے میں باباجان سے مخاطب ہوا۔

"باباجان! پرسوں کے دن ان شاء اللہ داؤد خان اور عدنان حیدر ہمارے مہمان ہوں گے۔"

مہردل خان نے پوچھا۔ "یہ داؤد خان، صمد یار خان کا بھتیجا ہے نا؟"

"ہاں وہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اور مہردل خان سر ہلاتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

رات کو زرغونہ نے پوری کہانی سنے بغیر مجھے سونے نہیں دیا تھا۔ اگلے دن میں نشانہ بازی کی پریکٹس میں مشغول تھا جب تین ہتھیار بردار مجھے دور سے اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی کہ میں اپنی پریکٹس چھوڑنے کی سوچتا۔ البتہ جب وہ بالکل میرے قریب پہنچ گئے تو مجھے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر اگی گھنی مونچھیں بہت بری لگ رہی تھیں۔ باقی دو کی مونچھیں تو چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن شکل پر چھائی نحوست مونچھوں والے سے کم نہیں تھی۔

"تم شیر دل خان ہو؟" مونچھوں والے کی آواز شکل سے بھی بھیانک تھی۔

"لوگ تو اسی نام سے پکارتے ہیں۔" میں ان کی طرف متوجہ تھا لیکن میری کلاشنکوف کی بیرل ٹارگٹ کی طرف اٹھی ہوئی تھی..... تینوں کے پاس ہتھیار موجود تھے مگر انہوں نے اپنے ہتھیار کندھوں سے لٹکائے ہوئے تھے۔

"ہم سردار صمد یار خان کے آدمی ہیں اور...؟" یہ الفاظ مونچھوں والے کے ہونٹوں پر تھے کہ ایک دم میری گن کا رخ، ٹارگٹ سے ہٹ کر ان کی طرف ہو گیا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی..... کلاشن کوف کی بیرل کا رخ اپنی جانب دیکھ کر ان تینوں کے ہاتھ اپنی کلاشنکوفوں کی جانب بڑھے، مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہتھیار کندھوں سے اتارتے، میں دھاڑا...

"خبردار! اگر کسی نے ہتھیار کو چھونے کی کوشش کی؟..... تم جتنے بھی چست ہو گولی کی رفتار سے تیز نہیں ہو سکتے؟!" میں نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کر دیا کیونکہ اس سے پہلے نشانہ بازی کے لیے میں سنگل راؤنڈ فائر کر رہا تھا اور اسی وجہ سے کلاشنکوف کے سیفٹی لیور کو بھی سنگل راؤنڈ پر سیٹ کیا ہوا تھا۔ ان کے حرکت کرتے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے تھے۔

"شیر دل خان! تم بہت غلط کر رہے ہو!" اس مرتبہ بھی مونچھوں والے نے منہ کھولا تھا۔

میں نے اس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دو..... دوسرا ہاتھ استعمال نہ کرنا..... اور یاد رہے میں نے بھری میگزین

سے صرف تین گولیاں فائر کی ہیں، ستائیس گولیاں ابھی تک باقی ہیں ... گویا فی آدمی نو گولیاں.... "

وہ تینوں ہونٹ کاٹتے میری جانب غصے سے گھورتے رہے۔ ہتھیار ابھی تک ان کے کندھوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے بیرل کا رخ تھوڑا سا نیچے کرتے ہوئے ٹریگر پریس کیا...... "ترتڑتڑ" کی آواز کے ساتھ گولیاں ان کے پیروں کے سامنے لگیں...... پتھریلی زمین میں کوئی گولی اچٹ کر انہیں نقصان بھی پہنچا سکتی تھی مگر ان کی زندگی میرے نزدیک کسی خارش زدہ کتے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی اس لیے مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔

فائر کی آواز نے ایک لمحے میں تمام اکڑ ختم کر دی تھی...... انہوں نے فی الفور اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دیئے تھے۔

"اب تین قدم پیچھے ہو جاؤ"۔ میں نے اگلا حکم جاری کیا۔

اس مرتبہ انہوں نے بے چوں وچرا اس عمل کیا۔

"شاباش! اب اپنی اپنی قمیص اتار دو۔"

"دیکھو!......"

"دیکھ رہا ہوں بھئی دیکھ رہا۔" میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"ہم ... میرا مطلب ہے......" اس نے دوبارہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں نے دوبارہ ٹریگر پریس کیا...... اس مرتبہ میں نے بیرل کا رخ تھوڑا اوپر اٹھایا تھا گولیاں ان کے سر سے اوپر گزریں۔ تینوں کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی...... وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگے۔

مونچھوں والے نے اپنی موٹی توند کے ساتھ ہولسٹر باندھا ہوا تھا جس میں اڑسا پستول صاف نظر آرہا تھا۔

بہترین دوا

حکیم لقمان نے کسی کے پوچھنے پر بتایا۔ "میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لئے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے"۔

میں نے کہا۔ "ہولسٹر بھی اتار کر میری طرف پھینکو۔"

اس نے ہولسٹر اتار کر نیچے پھینک دیا۔

"اب بھونکو! کیا پیغام لائے ہو؟"

"شیر دل خان! کسی پیغام لانے والے کے ساتھ یہ سلوک کسی سردار کو زیبا نہیں دیتا؟" اس مرتبہ دوسرے آدمی نے زبان کھولی تھی۔ اس کے لہجے میں شامل نرمی اس کے ڈر کو ظاہر رہی تھی۔

"یہ بات تمہیں اس خبیث سے پوچھنی چاہیے جس کا پیغام لے کر آئے ہو؟...."

"اس کی کسی غلطی کے جواب دہ ہم کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"تم اس کے نمائندے ہو۔ اور تمہارے ساتھ جو سلوک بھی ہو گا وہ براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

وہ لجاجت سے بولا۔ "ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم اس کا پیغام لائے ہیں...... پلیز ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرو۔"

"مجھے اس خبیث کا پیغام بتاؤ؟"

"سردار کہہ رہے تھے آپ کو بتا دیں کہ ان تک آپ کے جرگے کی ساری کارروائی پہنچ گئی ہے اور بہتر یہی ہو گا کہ آپ داؤد خان اور چوہدری قربان حیدر سے

عیسوی رہیں۔ ....سردار آپ کے والد کے ساتھ مزید لڑائی نہیں چاہتا.... وہ آپ کی وڈیو بھی واپس کر دے گا...... ورنہ دوسری صورت میں آپ کی وڈیو تمام علاقے میں پھیلا دی جائے گی۔'' مونچھوں والے نے سیکھے الفاظ میں صمد یار خان کا پیغام دہرایا۔ اگر سچویشن یہ نہ ہوتی تو لازماً اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ کوئی اور ہوتے۔

''اس اشائی کیرے کو کہہ دینا، کہ سردار جب مدد کا وعدہ کرتے ہیں تو کسی کی دھمکی کی پروا نہیں کرتے اور جہاں تک... بے ہودہ وڈیو کا تعلق ہے تو میری طرف سے وہ سینما میں چلا دے۔ مرد کون ہے؟ اس کا فیصلہ میدان کرے گا.... باقی گن پوائنٹ پر کسی نہتے سے اپنی بات منوانا کون سا مشکل ہے، بالکل اسی طرح جیسے اب تم تینوں یہاں سے بغیر کپڑوں کے جانے والے ہو۔''

ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ مونچھوں والا بے چارگی سے بولا۔

''سردارزادے شیر دل خان! ہماری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے.....''

''خاموش!'' میں دھاڑا۔ ''اب جلدی سے شلواریں اتارو۔''

''خ.....خدا... کے لیے..... سردار! ہمارا تماشا نہ بناؤ؟''

اسی وقت گاؤں کی طرف سے ایک جیپ نمودار ہوئی۔ مجھے اپنی جیپ پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دو تین منٹ بعد جیپ نزدیک آ گئی۔ جیپ مہر دل ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ بابا جان ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں سرسری نظر جیپ پر ڈال کر ان کی طرف متوجہ رہا۔

بابا جان جیپ سے اترتے ہی بولے۔

''شیر دل خانا! مجھے معلوم ہوا کہ اس اچکے کے تین آدمی تمہارے متعلق استفسار کرتے پھر رہے ہیں میں نے سوچا کہیں یہ بے خبری میں تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔''

''بابا جان زندگی موت تو اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے..... بہرحال آپ لوگوں نے آ کر اچھا کیا۔''

''بھیا! ان غریبوں کا کیا حال کیا ہوا ہے؟'' مہر دل خان ان لوگوں کی حالت پر ہنسا۔

میں نے کہا۔ ''یہ مجھے دھمکانے آئے تھے.....''

بابا جان نے پوچھا۔ ''کیا..... دھمکی دی ہے صمد یار خان نے؟''

''محترم سردار فرما رہے ہیں، کہ ہم لوگ داؤد خان اور چوہدریوں کا ساتھ نہ دیں اور جو کچھ ہمارے اور اس کے درمیان ہو چکا ہے، اسے فراموش کر دیں۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''یہی کہ سردار وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے۔''

''خوش کر دیا شیر خانا!'' بابا جان مسکرائے۔ ''اب انہیں جانے دو۔''

''مسٹر مونچھوں والے!'' میں ان کے سرغنے سے مخاطب ہوا۔ ''میرا ارادہ تو کوئی اور تھا مگر اب بزرگ پہنچ گئے ہیں اس لیے تم یہاں سے پھوٹنے کی کرو۔''

وہ ہاتھ نیچے کر کے اپنے کپڑوں کی جانب بڑھے۔

''میں نے بکواس کی ہے پھوٹنے کی کرو... اور شکر کرو اس بقیہ لباس پر جو تمہارا تن ڈھانپے ہوئے ہے..... ورنہ میرا ارادہ تو تم پر ظاہر ہو چکا ہے..... بھاگو یہاں سے۔''

میرا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کی حجت بازی کرتے۔ وہ کان دبائے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''چلیں بابا جان!'' ان کے دفع ہوتے ہی میں نے بابا جان سے اجازت چاہی۔

"ہاں چلو....." باباجان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے ہتھیار میں نے جیب میں رکھے اور کپڑوں کی سرسری تلاشی لے کر وہیں پھاڑ کر پھینک دیے۔ اگر وہ لباس لینے کے لیے واپس بھی لوٹ آتے تو وہ ان کے استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم گھر کا رخ کر رہے تھے۔

"شیر دل خانا! آج کل تُو ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا کہ میں تجھے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔" باباجان میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

"باباجان میں شروع دن سے ایسا تھا۔ بس سکول کی تعلیم نے مجھے انسانیت اور ایثار و قربانی کا سبق سکھایا مگر میں یہ نہیں جان پایا تھا کہ ایثار ان کے لیے ہے جو اس کے قابل ہوں..... صمد یار خان جیسے متکبروں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا صدقہ ہے۔ ایسے لوگ صرف ہمارے نہیں دین اور معاشرے کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔"

مہر دل خان بولا۔ "باباجان! پتا ہے؟..... بھیا کے خوابوں میں آنے والی لڑکی کو بھی صمد یار خان نے زبردستی اغوا کیا ہوا ہے..... وہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے زرغونہ نے بتایا ہے..... کل رات بھیا نے اسے ساری کہانی سنائی ہے۔"

"ساری کہانی تو خیر ہمیں بھی سنائی تھی مگر یہ ذکر درمیان سے گول کر گئے تھے برخوردار!" باباجان معنی خیز لہجے میں بولے۔

"باباجان! آپ نے پھر میرا مذاق اڑانا تھا۔"

"وہ تو خیر اب بھی اڑائیں گے..... اور وہ کیا کہتے ہیں عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے تم ہم سے یہ بات کیسے صیغۂ راز میں رکھ سکتے تھے؟"

"اس زرغونہ کی بچی کی تو میں اچھی طرح خبر لوں گا۔" میں تپتا ہوا بولا۔ اور وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

☆☆☆

اور پھر سلیم خان کی شادی کا دن بھی آن پہنچا..... اس دوران کوئی دوسرا قابلِ ذکر واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے قریب داؤد خان، عدنان چوہدری اور اس کے والد کے ہمراہ آن پہنچا تھا۔ اس وقت نشانہ بازی کا مقابلہ زور و شور سے جاری تھا۔ ان کی آمد تک میدان میں صرف پانچ فریق بچ گئے تھے۔ مہر دل خان، دولھا کا بھائی اختر خان، چچا بہرام گل کا بیٹا منور گل، بُلبل جان کا سب سے چھوٹا بھائی دولت خان اور میں۔ وہ مقابلہ جو شیشے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو سو گز کے فاصلے سے نشانہ بنانے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہر فائرر کو پانچ گولیاں ملی تھیں۔ اس مرحلے میں چالیس فائرر سے صرف پندرہ فائر کامیاب ہو سکے تھے۔ اگلے مرحلے میں فاصلہ سو گز سے بڑھا کر دو سو گز کر دیا گیا تھا اور گولیوں کی تعداد پانچ سے کم کر کے تین کر دی گئی تھی۔ اس مرتبہ مزید دس فائرر نااہل ہو گئے تھے اور بچنے والے پانچ وہی تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اب فاصلہ دو سو گز سے بڑھا کر تین سو گز کرتے ہوئے گولیاں تین سے گھٹا کر دو کر دی گئی تھیں۔ اس مرتبہ ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ دولت خان ٹارگٹ کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ہر مرتبہ جب شیشے کے ٹکڑے کو گولی لگتی تو اس کی جگہ اس سائز کا نیا ٹکڑا لگا دیا جاتا۔

چونکہ ہمارے پاس سنائپر رائفلوں کے بجائے عام کلاشن کوفیں تھیں اس لیے مزید فاصلہ بڑھانے کے بجائے گولیوں کی تعداد کم کر دی گئی اور اب صرف ایک گولی سے نشانہ بنانا تھا۔ مزید یہ کیا گیا کہ چھ مربع انچ سائز کے شیشے کی جگہ تین مربع انچ کا شیشہ لگا دیا گیا۔ سب سے پہلے دولت خان کی باری تھی، اس نے شست لے کر نشانہ باندھا گولی فائر ہوئی مگر شیشہ ہٹ نہ ہوا۔

اس کے بعد مہرول خان تھا وہ بھی ناکام رہا، آخر میں میری باری تھی اگر میں بھی ناکام رہتا تو ہم تینوں کو برابر قرار دے کر مقابلہ ختم کر دیا جاتا مگر میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مان سکتا تھا۔ میں نے نشست باندھی ٹریگر پر انگلی رکھی اور پچھلی سائیڈ سے دیکھتے ہوئے میں نے اگلی سائیٹ کی ٹپ شیشے کے نیچے والے کونے سے ملائی اور سانس روک کر بالکل ساکت ہو گیا۔ فائر کرتے وقت اکثر لوگ اس لیے ٹارگٹ کو نشانہ نہیں بنا سکتے کہ ان کا بایاں ہاتھ جو رائفل کو سہارا دیئے ہوتا ہے اس کی ہلکی سی لرزش فائر ہونے والی گولی کو دائیں بائیں لے جاتی ہے۔ ٹریگر کو مکمل پریس کرتے وقت میں نے بڑے دھیان سے دائیں بازو کی ہلکی لرزش کو روک لیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں، میرے تصور میں صمد یار کا چہرہ تھا۔ دھماکا ہوا اور......

''واہ...... شاباش جوانا۔'' کا شور مجھے یہ باور کرانے لگا کہ میں بازی لے گیا تھا۔

مہرول نے مجھے چھاتی سے لگا کر مبارک باد دی۔

بابا جان کا چہرہ بھی جوش سے کھلا ہوا تھا۔

چچا بہرام گل نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بابا جان کو کہا...... ''دلاور خان! دیکھا میرے بھتیجے کو، تم یونہی ہر وقت فکر کرتے رہتے ہو؟''

اسی وقت عدنان حیدر میرے قریب آیا اور بولا۔

''واہ کیا بات ہے تمہارے نشانے کی بھائی!''

''کیسے ہو عدنان!'' میں اس سے بغلگیر ہوا۔ ''تم کس وقت پہنچے؟''

''جب مقابلہ پورے عروج پر تھا اس وقت...... داؤد لالہ اور ابو جان بھی میرے ہمراہ ہیں۔''

وہ چونکہ مقابلہ کے درمیان میں پہنچے تھے اس لیے اس وقت میں ان سے مل نہیں پایا تھا۔

''چلو آؤ!'' میں اسے اندر کمرے میں لے گیا۔

داؤد خان اور اس کے والد فرمان حیدر چوہدری کا تعارف میں نے بابا جان سے کرایا...... پھر ہم سب کمرے ہی میں بیٹھ گئے...... باہر شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر تھے لیکن ہم سب ان ہنگاموں سے بے نیاز صمد یار خان کے خلاف منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

بابا جان اردو صحیح طریقے سے نہیں بول سکتے تھے جبکہ عدنان چوہدری اور اس کا باپ پشتو سے نابلد تھے...... ہم چونکہ پہلے سے آپس میں مل چکے تھے اس لیے داؤد خان بابا جان سے پشتو میں محو گفتگو ہو گیا جبکہ میں فرمان حیدر چوہدری سے بات کرنے لگا جو میرے تئیں میرا ہونے والا سسر تھا۔ داؤد خان نے بابا جان کے سامنے وہ ساری باتیں دہرائیں جو میں پہلے ہی بابا جان کے گوش گزار کر چکا تھا۔

بابا جان نے کہا...... ''داؤد خان! میرا بیٹا آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہے...... اور سچ تو یہ ہے کہ صمد یار خان ہمارا بھی دشمن ہے...... وہ تین بار ہم پہ حملہ کرنے میں پہل کر چکا ہے...... اور پھر اس نے میری ہونے والی بہو کو بھی حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے ایسے شخص کے خلاف آپ مجھے ہر میدان میں اپنے ہمراہ پائیں گے۔''

بابا جان کی بہو والی بات نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔ داؤد خان بھی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا مگر سائرہ کا باپ اور بھائی بابا جان کی بات نہیں سمجھ سکے تھے۔

''شکریہ چچا جان! میں جانتا تھا کہ آپ ایک ظالم کے خلاف ضرور میرا ساتھ دیں گے...... بلکہ یہ تو ایک ضمنی بات تھی...... میرے یہاں آنے کا مقصد آپ کے ساتھ بیٹھ کر صمد یار خان کے خلاف کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کرنے کا ہے۔''

''بھتیجے! ہم پٹھان کسی لمبے چوڑے منصوبے میں نہیں پڑتے...... مارتے ہیں یا مر جاتے ہیں...... صمد یار

خان نے ہمیں مارنے کی کوشش کی، ناکام ہوا.. اب ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے شاید اس موذی کا انجام ہمارے ہاتھوں لکھا ہو؟....."

"چچا جان! بجا فرمایا مگر آپ کی ہونے والی بہو اس کے قبضے میں ہے، اس لحاظ سے اس کا پلا بھاری ہے..... جب تک اس بچی کو رہا نہیں کرا لیتے ہم کیسے اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں؟"

عدنان اور اس کے باپ کی سہولت کی خاطر میں بابا جان کی بات کو اردو میں ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔ البتہ بابا جان کی بہو والی بات میں گول کر گیا تھا۔

"اس کی بھی تو کوئی ایسی کمزوری ہوگی کہ جس کے سہارے ہم بہو کو آزاد کرلیں؟"

بابا جان کی بات سن کر میں اچھل پڑا تھا.....

"یس! ہم اس کے بیٹے کو اغواء کر کے سائرہ کو آزاد کرا سکتے ہیں؟" یہ بات میں نے اردو میں کہی تھی۔

"وہ پشاور کے ایک پرائیویٹ سکول میں دسویں کلاس کا طالب علم ہے... اسے سکول لانے اور لے جانے کے لیے چار مسلح باڈی گارڈ ساتھ ہوتے ہیں۔" یہ معلومات داؤد خان نے ہمارے گوش گزار کی تھی۔

میں نے کہا۔ "تو کیا! کلاشن کوف کی ایک میگزین میں تیس گولیاں آتی ہیں..... وہ تو صرف چار ہوتے ہیں... چوبیس بھی ہوتے تو مجھے میگزین بدلنے کی ضرورت نہ پڑتی..... ایک ہی میگزین سے ان کا صفایا ہو جاتا۔"

"تو کتنے بندے اسے اغواء کرتے جائیں گے؟" یہ سوال داؤد نے کیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ "اکیلا شیر دل کافی ہے۔"

بابا جان نے فوراً پشتو میں کہا۔ "نہیں بیٹا! بہرول بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔"

"چچا جان! ہم سب ایک گروپ ہیں..... یہ نہیں کہ صرف سردار دلاور خان کے بیٹے ہی قربانی کا بکرا بنیں۔" داؤد کی پشتو میں کہی بات میں نے اردو میں دہرا دی تھی۔

چوہدری فرمان نے کہا۔ "بالکل جی! میری عزت کو اس خبیث نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے، اس پر پہلی گولی چلانے والا چوہدریوں کا خاندان ہوگا۔"

بابا جان نے گلابی اردو میں کہا۔ "او صرف تمہارا نہیں امارا بی بیٹی اے۔ بلکہ امارا بہو ہے، اس لیے امارا حق زیادہ ہے۔"

بابا جان کی بات نے چوہدری فرمان کو حیرت سے گنگ کر دیا تھا۔ اس نے حیرانی سے میری جانب دیکھا، میں جھینپ کر نیچے دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری فرمان بے اختیار بازو پھیلا کر اٹھا اور بابا جان کی طرف بڑھا۔

"دلاور صاحب! دل جیت لیا آپ نے۔ وہ آپ کی بیٹی ہوئی..... سائرہ آپ کی ہوئی۔"

بابا جان نے ہنستے ہوئے بڑی گرم جوشی سے فرمان حیدر کو چھاتی سے لگا لیا تھا۔ میرا دل خوشی سے نہال ہو گیا تھا۔ چند لمحے بابا جان اور چوہدری فرمان ایک دوسرے کو بھینچتے رہے اور پھر جیسے ہی جدا ہوئے بابا جان نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر چوہدری فرمان کے سر پر رکھ دی۔

"خان صاحب! یہ پگڑی نہیں عزت کا وہ نشان ہے جو مجھے کسی بادشاہ کے تاج سے بھی کئی گنا عزیز رہے گا۔" یہ کہہ کر چوہدری فرمان اپنے کندھے پر پڑی قیمتی چادر اتار کر بابا جان کے سر سے پگڑی کی طرح لپیٹنے لگا۔

داؤد خان اور عدنان کے چہرے بھی خوشی سے کھلے پڑے تھے۔ کمرے سے باہر ڈھول اور شہنائیوں کا شور گونج رہا تھا... سلیم جان کی شادی حقیقت میں ہمارے لیے خوشی کا پیغام لائی تھی۔

بابا جان اور چوہدری فرمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ

گئے تو داؤد خان نے کہا۔

''یہ دو خاندانوں کا نہیں دو تہذیبوں کا ملاپ ہے..... سائرہ بیٹی کی ماں کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا تھا اور اب اس کی بیٹی اسی علاقے میں واپس لوٹ کر آ رہی ہے... اللہ پاک اس ملاپ کو بابرکت کرے... یوں بھی شیر دل میاں اور اور سائرہ کی روح نے تو کافی عرصہ پہلے سے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا تھا..... شکر ہے کہ آج رسمی طور پر بھی دونوں کے بڑوں نے انہیں اکٹھا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے..... اس ضمن میں دلاور خان کی روشن خیالی اور وسیع قلبی لائق تحسین ہے کہ انہوں نے سائرہ کو بغیر کسی جھجک کے اپنی بہو منتخب کر لیا ورنہ اس ملک کے لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ قریباً ہر مجبور اور بے بس لڑکی کو جو کسی کے ظلم کا نشانہ بنی ہو دھتکار دیا جاتا ہے۔''

''بھتیجے! کسی لڑکی کی پارسائی کو اس کا اغواء ہونا یا عصمت دری زائل نہیں کر سکتی؟''

''بجا فرمایا چچا جان!'' داؤد خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اسی کو وسیع القلبی اور روشن خیالی کہتے ہیں..... عورت کو ننگے سر گھومنے کی اجازت دینا روشن خیالی نہیں بے غیرتی کہلاتا ہے۔''

''ہم منصوبہ ترتیب دے رہے تھے؟'' میں نے انہیں اصل موضوع کی طرف متوجہ کیا۔

''وہ تو طے ہو گیا نا؟ اب ہم صمد یار خان کے بیٹے حشمت یار خان کو اغوا کریں گے، بدلے میں سائرہ بہن کو آزاد کرائیں گے... پھر اسے رہا کر کے صمد یار خان کا کریا کرم کریں گے۔'' یہ باتیں دلاور خان نے اردو میں کہیں تھیں۔

فرمان حیدر چوہدری اور عدنان حیدر چوہدری نے بھی اسی بات کی تائید کر دی تھی... یہ طے کرنے کے بعد وہیں دستر خوان بچھا کر پرتکلف کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد ہم کمرے سے باہر نکل کر شادی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

☆☆☆

اگلے دن جب مہمانوں کی واپسی ہوئی تو میں ان کے ہمراہ تھا۔ چھوٹے بھائی مہر دل خان کو میں نے بصد اصرار وہیں رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ یقیناً کبھی نہ رکتا مگر جب میں نے بابا جان کے اکیلے رہنے کی بات کی تو اسے میری بات ماننا پڑی۔

گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا اور میرے ساتھ عدنان بیٹھا تھا۔ داؤد خان اور فرمان چوہدری عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔ میرے ذہن میں کافی دیر سے ایک سوال مچل رہا تھا جو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا.....

''یار عدنان! آپ کی امی جان تو خالص پٹھان ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے آپ کو پشتو نہیں سکھائی؟''

''انہوں نے تو بہت کوشش کی مجھے خود ہی شوق نہیں تھا..... یوں بھی لڑکے عموماً کھیلنے کودنے میں لگے رہتے ہیں، ماں کے ہاتھ کم ہی چڑھتے ہیں..... البتہ..... تیری ہونے والی بیگم اچھی خاصی پشتو بول لیتی ہے۔'' عدنان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا.....

میں ہولے سے مسکرا دیا۔ داؤد خان نے عقبی نشست سے مجھے آواز دی۔

''شیر دل خان! ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ ہم اپنی کارروائی کو جتنا لیٹ کریں گے سائرہ بہن کے لیے اتنا خطرہ بڑھتا جائے گا..... صمد یار تک ہمارے گٹھ جوڑ کی خبر پہنچ گئی ہو گی۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں کو عملی شکل دینے میں جلدی نہ کرے؟''

''داؤد بھیا! ہم کل ہی حشمت خان کو اغواء کرنے کی کوشش کریں گے... باقی آپ کی اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خبیث تک ہماری دوستی کی خبر پہنچ چکی ہے... اس ضمن میں اس نے اپنے تین آدمی میرے

پاس بھجوائے تھے..... تینوں آئے تو دھمکی دینے تھے مگر اپنی بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے انہیں پھنسا دیا۔ اپنی قیمیں اور ہتھیار چھوڑ کے بے چاروں کو بھاگنا پڑا۔"

میری بات پر وہ تینوں قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے۔

"اس نے لازماً تمہاری ویڈیو کے بل پر تمہیں بلیک میل کرنا چاہا ہوگا؟" داؤد خان کا انداز غضب کا تھا۔

"صحیح کہا لالہ! لیکن آپ تو جانتے ہیں اس ویڈیو کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ مجھے صمد یار خان کے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکے۔"

عدنان بولا۔ "یوں بھی اس کا بیٹا ہمارے ہاتھ آ گیا تو اسے ہمارے سامنے جھکنا پڑے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "لالہ داؤد! آپ بتا رہے تھے کہ اس کے ساتھ چار باڈی گارڈ ہوتے ہیں؟"

"بالکل ایسا ہی ہے؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ چاروں صمد یار کے بیٹے کی گاڑی میں بیٹھتے ہیں یا علیحدہ گاڑی میں بیٹھتے ہیں؟" میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

داؤد خان نے جواباً کہا۔ "وہ ایک کھلی چھت والی جیپ میں ہوتے ہیں، جبکہ صمد یار کا بیٹا ڈرائیور کے ساتھ مرسڈیز میں ہوتا ہے۔"

میں نے جوش سے کہا۔ "میرا خیال ہے! اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔"

"بھلا وہ کیسے؟" یہ سوال میرے ہونے والے سسر نے کیا تھا۔ میرے لیے اس کے چہرے پر میرے لیے شفقت اور محبت کا ملا جلا تاثر جھلک رہا تھا۔

میں نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "انکل! ایسا ہے کہ ہم دو گاڑیوں میں سوار ہوں گے..... ایک گاڑی اس کے بیٹے کی مرسڈیز سے آگے ہوگی اور دوسری محافظوں کی جیپ سے پیچھے۔ ہم قدرے سنسان روڈ یا ایسا روڈ جس پر رش کم ہو محافظوں کی جیپ کا ٹائر پنکچر کر دیں گے..... امید ہے ان کی جیپ الٹ جائے گی..... اگر نہ بھی الٹی ہوئی تب بھی ہمیں اتنا ٹائم بہر حال مل جائے گا کہ ہم حشمت خان کی مرسڈیز میں داخل ہو کر اسے یرغمال بنا سکیں۔ کیونکہ اپنی جیپ کو الٹتے دیکھ کر لامحالہ اس کا ڈرائیور گاڑی روکے گا..... اگر اس نے گاڑی نہ روکی تو ہماری ایک گاڑی تو بہر حال اس کی مرسڈیز سے آگے جا رہی ہوگی اور اس کی مدد سے مرسڈیز کو رکوانا کوئی مشکل نہ ہوگا۔"

"بیوٹی فل آئیڈیا....." داؤد خان خوشی سے چہکا۔ چوہدری فرمان کے چہرے پر بھی تحسین آمیز تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

☆☆☆

سکول کی چھٹی سے آدھا گھنٹا پہلے ہم نے اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ صمد یار خان کے بیٹے حشمت خان کے سکول آنے اور گھر واپس جانے کا ایک ہی رستا تھا۔ داؤد خان اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ اپنی ہی ٹویوٹا کار میں موجود تھا جبکہ میں اور عدنان سکول سے ایک فرلانگ آگے ایک درخت کے نیچے موجود تھے۔ ہمارے پاس نئے ماڈل کی ایک سپورٹس کار تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عدنان بیٹھا تھا۔ صمد یار خان کے محافظوں کی جیپ کا ٹائر پنکچر کرنے کی ذمہ داری میرے سر پر تھی۔ اس مقصد کے لیے میں نے سنائپر رائفل ڈریگونوف کا انتخاب کیا تھا۔ چونکہ اس سے پہلے مجھے بھی سنائپر رائفل سے فائر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے ایک دن پہلے میں نے ڈریگونو رائفل سے کافی راؤنڈ فائر کر لیے تھے۔ گو ہر ہتھیار سے فائر کرنے کا طریقہ کار ایک ہی ہوتا ہے مگر پھر بھی درست نشانہ لگانے کے لیے نئے ہتھیار کا جانچنا نہایت ضروری ہوتا

ہے۔ کلاشن کوف اور سنائپر رائفل میں ٹیلی سکوپ سائیٹ کا بھی فرق ہوتا ہے۔ ٹیلی سکوپ سائیٹ والی رائفل سے شست لینا، عام رائفل کی نسبت آسان ہوتا ہے اور نشانے کی درستی زیادہ ہوتی ہے۔

چھٹی کا ٹائم ہوتے ہی عدنان نے کار سٹارٹ کی اور تیار ہو کر بیٹھ گیا..... میں نے بھی رائفل اپنے گھٹنوں پر رکھ لی تھی۔ میں نے گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی اس لیے کسی کا باہر سے رائفل کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی حشمت یار خان کی نئی مرسڈیز زن کر کے ہمارے پاس سے گزری، اس کے چند قدم پیچھے طاقتور انجن والی ایک جیپ تھی جس میں بیٹھے چاروں افراد نے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامی ہوئی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کے آگے بڑھتے ہی عدنان نے اپنی خوبصورت سپورٹس کار آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم حشمت یار خان کے محافظوں والی جیپ سے چند گز کی دوری پر پہنچ چکے تھے۔ اور پھر یہی فاصلہ رکھ کر ہم آخر تک چلتے رہے۔ داؤد خان سے ہمارا رابطہ موبائل فون کے ذریعے قائم تھا اور میں اسے ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہا تھا۔ حشمت یار خان کی مرسڈیز پہنچنے سے پہلے وہ روڈ پر آ گئے تھے اور پھر وہ مرسڈیز سے آگے آگے چلنے لگے۔ اب ان کی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ہمارے گھیرے میں تھیں۔

جلد ہی ہم مطلوبہ روڈ پر چڑھ گئے۔ داؤد خان مسلسل رابطے میں تھا۔

''شیر دل خان! تیرے پاس پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔'' اس کی آواز ہینڈ فری کے ذریعے میرے کانوں میں گونجی۔

''میں تیار ہوں لالہ جی!'' میں نے رائفل کی نال کھڑکی کے شیشے پر رکھ کر شست باندھ لی..... گو حرکتی ٹارگٹ کو نشانہ بنانا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے اور اس وقت یہ مشکل دوگنی ہو جاتی ہے جب آدمی خود بھی کسی چلتی گاڑی میں ہو، لیکن مجھے یہ سہولت تھی کہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند گز سے سنائپر رائفل کی گولی کے خطا جانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ فائرر، نشانہ بازی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے..... جبکہ میں نے ایک دن پہلے ہی نشانہ بازی کا مقابلہ جیتا تھا۔ مہر دل خان جیسے ماہر نشانہ باز کو شکست دینا اتنا سہل نہیں تھا۔

میں نے شست باندھی پندرہ بیس میٹر کا فاصلہ ٹیلی سکوپ سائیٹ میں سمٹ کر چند فٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دس سے الٹی گنتی شروع کر دی۔ ''دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک..... ٹھاہ۔'' زوردار دھماکا ٹائر کے پھٹنے کا تھا۔ جیپ لہرائی..... ڈرائیور نے سٹیرنگ موڑ کر جیپ کو الٹنے سے بچانے کی کوشش کی، گو اس کی کوشش مکمل کامیاب تو نہیں ہوئی، البتہ اتنا ضرور ہوا، کہ جیپ بالکل الٹی نہیں ہوئی اور سائیڈ کے بل گر گئی تھی۔ چاروں محافظ جیپ کے اندر ہی تھے۔ ارد گرد موجود ٹریفک اور لوگوں نے پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید کوئی خود کش دھماکا ہو گیا ہے، اس لیے سب لوگ دائیں بائیں بھاگنے لگے مگر بعد میں دھوئیں کے بادل نہ اٹھتے دیکھ کر تمام جیپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حشمت خان کی مرسڈیز کی رفتار بھی کم ہوئی اور پھر گاڑی روک کر ڈرائیور نیچے اترا، حشمت خان بھی جیپ سے باہر نکل آیا۔ وہ ایک کم سن لڑکا تھا، ابھی تک اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ عدنان نے عین مرسڈیز کے پیچھے کار روکی، میں نے سنائپر رائفل سپورٹس کار میں چھوڑ دی اور ہولسٹر سے بریٹا پسٹل نکال کر باہر نکلا۔ ڈرائیور کی توجہ الٹی ہوئی جیپ کی طرف تھی وہ اس طرف دوڑا، حشمت خان بھی اس کے پیچھے لپکا مگر جیسے ہی وہ میرے ساتھ سے گزرا میں نے ایک دم اسے اپنی گرفت میں لیا اور سپورٹس کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر منتقل ہو

گیا۔ وہ شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ جیسے ہی اسے خطرے کا احساس ہوا اس نے منہ کھولنے کی کوشش کی مگر میں بریٹا پسٹل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑتے ہوئے غرایا۔

"اگر ذرا بھی آواز نکالی تو بھیجا اڑا دوں گا؟"

اس کا چہرہ ایک دم خوف سے پیلا پڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

عدنان نے کار تھوڑی سی ریورس کر کے آگے بڑھا دی، ہم زن سے داؤد خان کی ٹویوٹا کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ اب انہیں ہمارے پیچھے پیچھے آنا تھا، اور کسی بھی قسم کے تعاقب وغیرہ کو روکنے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ مگر ہم بغیر کسی حادثے کے داؤد خان کی وسیع و عریض کوٹھی تک پہنچ گئے تھے۔ حشمت یار خان کا خوف سے برا حال تھا۔ اپنے والد کی نحوست کا کچھ اثر اس کے چہرے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ملازموں وغیرہ کے ساتھ نہایت برا برتاؤ کرتا ہوگا۔ جب تک ہم کار سے باہر نکلتے داؤد خان کی ٹویوٹا بھی اندر داخل ہو گئی تھی۔

"بہت اعلیٰ شیر دل خان!" گاڑی سے باہر آتے ہی داؤد خان تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ رہے ہو؟" عدنان نے میری پیٹھ تھپکی۔

"اچھا پہلے اس سنپولیے کی تلاشی لے کر اسے قید کر دو؟" میں نے حشمت خان کو داؤد خان کے آدمیوں کی طرف دھکیلا۔ وہ لڑکھڑایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ داؤد خان کے آدمیوں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور اس کی جیبوں سے نکلنے والا سامان ہمارے حوالے کر کے اسے داؤد خان کے کسی خفیہ ٹھکانے میں منتقل کرنے لے گئے۔ ہم اسے داؤد خان کی کوٹھی میں قید کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

مجھے خواہ مخواہ اس لڑکے سے نفرت ہو رہی تھی، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دل میں سائرہ سے شادی کرنے کا کوئی خیال نہیں ہوگا مگر پھر بھی کوئی سائرہ کے ساتھ منسوب کیا جائے مجھے یہ منظور نہیں تھا، وہ صرف اور صرف میری تھی...... اس کی خاطر میں صمد یار خان تو کیا کسی بھی طاقت سے ٹکرا سکتا تھا۔

میں نے حسرت سے سوچا۔ "جانے اس کے دل میں بھی میری اتنی ہی محبت ہوگی؟"

"شاید ہاں؟..... شاید نہیں؟" بہر حال اس کے دل میں کچھ بھی ہوتا وہ میری محبت تھی، اور آئندہ بھی اسی نے میری محبت رہنا تھا۔

داؤد خان کے آدمیوں کے جاتے ہی ہم کوٹھی کے خوبصورت سبزہ زار پر بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ داؤد خان حشمت خان کے موبائل فون سے اس کے باپ صمد یار خان کو کال کرنے لگا۔ پہلی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ داؤد خان نے موبائل فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔

"ہیلو!؟" صمد یار کے لہجے میں کچھ جاننے کی بے تابی تھی۔

"کمینے تجھے پتا تو چل گیا ہوگا؟" داؤد خان بغیر کسی تمہید کے اس پر چڑھ دوڑا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا داؤد خان...... ! بڑوں کی لڑائی میں بچوں کو گھسیٹ لائے ہو؟"

"ہا...... ہا...... ہا۔" داؤد خان کا استہزائی قہقہہ گونجا۔ "وہ کہاوت تو سنی ہوگی، کہ کوزے کو چھلنی کہتی ہے تم میں دو سو راخ ہیں......"

"میں نے کب بچوں کو اس جنگ میں گھسیٹا ہے؟"

"محترم چچا جان! تیرے مقابلے میں، میں بچہ ہی ہوں، تیرے اس بھائی کا بیٹا جو تیرے ہاتھوں قتل ہوا، میری زندگی بھی بس اللہ پاک ہی کو عزیز تھی ورنہ تو نے کسر نہیں چھوڑی تھی...... اس کے علاوہ چوہدری فرمان

حیدر کی بیٹی کو کس نے اغواء کر کے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے؟...... تم! وہ نامرد ہو جو ہمیشہ عورتوں اور بچوں کا سہارا لے کر دشمنی پالتے ہو؟"

"ایک فرنگی میرا بھتیجا نہیں ہو سکتا؟....." صمد یار خان زہر خند لہجے میں بولا۔

"صحیح کہا! بھتیجے انسانوں کے ہوتے ہیں اور تمہاری درندگی نے کب کی صفت انسانیت تم سے چھین لی ہے۔"

"داؤد خان! تم بڑھ چڑھ کر باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ میرا بیٹا تمہارے قبضے میں ہے...... ورنہ میں دیکھتا کہ تم کتنے پانی میں ہو؟"

داؤد خان اطمینان سے بولا "ٹھیک ہے...... عورتوں، بچوں کو درمیان سے ہٹا دیتے ہیں...... تم سائرہ چوہدری کو باعزت واپس کرو، اور اس کے علاوہ شیر خان کی وڈیو واپس کر دو۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"اور ہاں...... کوئی چالاکی نہیں...... ورنہ یاد رکھنا حشمت خان نے لڑکیوں کے کپڑے پہن کر بہت اچھا ڈانس کیا ہے، فیس بک پر کافی پسند کیا جائے گا اس وڈیو کو......"

"داؤد خان......!" صمد یار خان حلق کے بل دھاڑا۔

"بڑی تکلیف ہوئی...... یہ تو تیری کرنی کا پھل ہے...... بقول نظیر اکبر آبادی......

یہ دنیا ہے جس کا نام میاں، یہ اور طرح کی بستی ہے
یہ مہنگوں کو تو مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
اس ہاتھ کرو، اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

اسی ضمن میں کافی کہاوتیں بھی مشہور ہیں...... ادلے کا بدلہ، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے...... وغیرہ وغیرہ......"

"کیا کیا ہے میں نے؟" صمد یار خان کی آواز میں غم و غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا......

...... جناب! شیر دل خان بھی کسی کا بچہ ہی تھا، جسے گن پوائنٹ پر چوڑیاں پہنا رہے تھے...... حالانکہ وہ تو تم سے صلح کرنے آیا تھا...... وہ بزدلی کی حد تک امن پسند نوجوان تھا جو آج تمہاری گھٹیا حرکتوں کے باعث آتش فشاں کی شکل اختیار کر گیا ہے تم نے جو تین آدمی اس کے پاس بھیجے تھے انہوں نے تجھے بتا تو دیا ہو گا کہ شیر دل خان نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ تمہارے بیٹے کو بھی اس اکیلے ہی نے اغواء کیا ہے۔"

"میں تمام سے نبٹ لوں گا داؤد خان...... صمد یار خان اتنا کمزور نہیں ہے کہ تم جیسے چند چھوکروں کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔"

"وہ بعد کا مسئلہ ہے...... تمہاری طاقت کو ناپنے کے لیے ہمارے پاس بڑا وقت پڑا ہے...... فی الحال تو سودے بازی کی بات کرو......"

"مقام اور جگہ کا تعین تم کرو...... میں سائرہ چوہدری کو وہیں لے آؤں گا۔"

"مقام کون سا؟...... سائرہ اور وڈیو ابھی میری کوٹھی پر پہنچا دو...... صبح تمہارا بیٹا سکول پہنچ جائے گا، اور یہ ڈن ہو گیا...... مزید آئیں بائیں کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"واہ! تاکہ تم مجھے بعد میں بلیک میل کرتے رہو۔"

"مسٹر صمد یار خان! یہ ایک مرد کی زبان ہے...... میں اگر بچوں کے سر پر دشمنی پالتا تو آج سے دو سال پہلے تیرا بیٹا اغواء کرا لیا ہوتا۔ ابھی تو وہ غریب تیرا لبیا کاٹ رہا ہے؟...... تم اطمینان رکھو...... میرا انتقام تیرا سر لے کے پورا ہو گا۔"

صمد یار خان خاموش ہو گیا...... چند لمحوں بعد اس کی

آواز فون کے رسیور سے برآمد ہوئی۔

"ٹھیک ہے داؤد خان..... میں سائرہ چوھدری کو تمہاری کوٹھی پر بھجوا رہا ہوں..... باقی شیر دل خان کی وڈیو میں نے پہلے سے ضائع کر دی تھی کیونکہ وہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے ہم بھی تمہارے بیٹے کی وڈیو نہیں بناتے..... مگر یاد رکھنا آئندہ اس طرح کا او چھا وار کرنے سے پہلے ایک نظر اپنے اہل و عیال پر ڈال لینا..... کیونکہ ہر عمل کا رد عمل ضرور ظاہر ہوا کرتا ہے۔"

"دو گھنٹے کے اندر سائرہ تمہارے پاس پہنچ جائے گی..... اور میں چاہتا ہوں میرا بیٹا بھی مجھے آج ہی مل جائے۔"

"او کے مل جائے گا..... سائرہ کے یہاں پہنچتے ہی اسے تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔" یہ کہتے ہی داؤد خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"لیں جی! یہاں تک تو مسئلہ حل ہو گیا۔" ہمیں کہتے ہوئے وہ اپنے ملازم کو آواز دینے لگا۔ "بشارت! کھانا لگا دو، کافی بھوک لگ رہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے..... مگر میری بھوک اڑ چکی تھی دو گھنٹوں کے اندر میرے خوابوں کی شہزادی یہاں آنے والی تھی..... ایسے عالم میں کھانے پینے کو کس کا دل کرتا ہے، میں بھی بے دلی سے عدنان اور داؤد کا ساتھ دے رہا تھا..... داؤد خان میری کیفیت سے اچھی طرح آگاہ تھا، مجھے بے دلی سے لنچ کرتے دیکھ کر وہ پشتو میں بولا۔

"شیر دل خان! پریشان نہ ہو، وہ آ جائے گی....."

میں پھیکے لہجے میں بولا۔ "میں پریشان تو نہیں ہوں....."

جواباً داؤد خان نے ہنسنے پر اکتفا کیا تھا۔ مزید نصیحت اس نے اس لیے نہیں کی کہ اسکی کیفیت نصیحت کے بل پر ختم نہیں کی جا سکتی۔

کھانے کے بعد داؤد نے اپنے آدمیوں کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ وہ حشمت خان کو تیار رکھیں جیسے ہی سائرہ ہمارے پاس پہنچی ہم اسے صمد یار خان کے حوالے کر دیں گے۔

وقت جیسے تھم سا گیا تھا..... عدنان اور داؤد خان ہنستے کھلکھلاتے گپ شپ میں مصروف تھے..... عدنان نے اپنے گھر کال کر کے گھر والوں کو سائرہ کی واپسی کا مژدہ سنا دیا تھا، لیکن میں ابھی تک امید و بیم کی حالت میں تھا..... کیا واقعی میں تھوڑی دیر بعد اپنے سپنوں کی تعبیر پانے والا تھا یا سائرہ بھی وہ نہیں تھی جس کے خواب میں دیکھتا آ رہا تھا..... کہیں یہ عدنان چوھدری اور دلاور خان کا کوئی خفیہ منصوبہ تو نہیں تھا مجھے اپنے ساتھ ملانے کا؟ مجھے اس سوچ پر شرمندگی بھی ہوئی مگر میری اس وقت کی کیفیات میرے بس میں نہیں تھیں..... یہ بھی ممکن تھا کہ سائرہ میرے خوابوں کی شہزادی کی معمولی شباہت رکھتی ہو اور عدنان پارٹی نے اسے میرے خوابوں میں آنے والی سمجھ لیا تھا؟..... اچانک میرے ذہن میں یہ لرزا خیز خیال گزرا کہ بابا جان، میری اور سائرہ کی منگنی کا حکم سنا چکے ہیں..... اگر وہ میرے خوابوں میں آنے والی نہ ہوتی تو میں کیا کرتا؟

ان خوفناک سوچوں نے اس وقت تک میرا پیچھا نہ چھوڑا جب تک مین گیٹ کی اطلاعی گھنٹی نہ بجی..... چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا..... اور پھر سر اندر کر کے مین گیٹ کھولنے لگا..... داؤد خان اسے پہلے سے سب کچھ بتا چکا تھا۔ ہم تمام کھڑے ہو گئے تھے۔ دروازہ کھلا ایک سوزوکی کار اندر داخل ہوئی، پچھلی نشست پر کالا نقاب اوڑھے بیٹھی ایک لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

آئے دن ٹی وی چینلز اور اخباروں پر خبریں آتی رہتی ہیں کہ کوئی لڑکا لڑکی کی آواز میں مردوں کو اُلو بنا کر ان سے تحفے میں موبائل اور قیمتی تحفے منگواتا رہا اور کئی لڑکیاں بھی اسی طرح نوجوان ہیں اور اپنی جھلک بھی نہیں دکھاتیں اور جب بات ان کی پردہ کشائی تک پہنچتی ہے تو وہ سم بند کرکے دوسری سم لگا لیتی ہیں۔ زیرِ نظر واقعہ میں بھی دیکھیں کہ ایک لڑکی نے کتنی مہارت سے محترم رضوی صاحب کے ساتھ کھیل کھیلا۔

اے آر رضوی
0331-5452724

فریبِ آرزو

قارئین! ہمارے سامنے روز لوگ مرتے ہیں لیکن ہمیں پروا نہیں ہوتی البتہ موت کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب ہمارے اپنے گھر کا کوئی فرد ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ کر کسی دوسرے جہان میں چلا جاتا ہے تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ موت زندگی کی کتنی بڑی تلخ حقیقت ہے۔ میری بیوی کا چند ماہ پہلے انتقال ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ گھر کے ایک فرد کے جانے سے گھر کا نظام کس بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ مرد تو سارا دن گھر سے باہر گزارتا ہے اور شام کو جب تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہے اور اس وقت اس کی بیوی اس کا خوشدلی سے استقبال کرتی ہے۔ اسے چائے پانی پوچھتی ہے اور کھانا لے آتی ہے تو اس مرد کی آدھی تھکاوٹ تو اسی دم دور ہو جاتی ہے لیکن اس کے برعکس اگر عورت گھر میں مرد کے داخل ہوتے ہی شکوے شکایتوں کا ڈھیر لگا دے تو اس گھر میں ایک ایسی لڑائی شروع ہو جاتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

میری بیوی بہت نیک، ملنسار، صابر اور سادہ خاتون تھی۔ اللہ کی ذات اس کی مغفرت فرمائے۔ آمین! وہ چند روز بیمار رہی اور پھر اچانک ہی اگلے جہان سدھار گئی۔ میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ میرا ساتھ اچانک اس طرح چھوڑ دے گی۔ بچوں کو تو ماں کے بچھڑنے کا غم ہوتا ہی ہے لیکن مجھے اس لحاظ سے صدمہ ہوا کہ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا تھی کیونکہ بڑھاپے میں جب جوان اولاد ماں باپ کا خیال نہیں رکھتی تو میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ میری بیوی کی خواہش تھی کہ وہ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی ایک ساتھ کر دے لیکن بچوں کی خوشیاں دیکھنا اس کے نصیب میں نہ تھا لہٰذا موت نے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

ان حالات میں گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری میری بڑی بیٹی کے سر آ گئی۔ جس کی عمر بیس سال ہے۔ میری چھوٹی بیٹی بالشتہ حجاب کی عمر صرف نو سال ہے۔ میرے دو بیٹے سرکاری جاب کرتے ہیں جبکہ تیسرا بیٹا موبائل شاپ پر کام کرتا ہے۔ بچوں نے صبح کام پر جانا ہوتا ہے۔ ماں تھی تو وہ نماز فجر پڑھ کر بچوں کو بروقت ناشتہ بنا دیتی تھی اب بیٹی پر ذمہ داری آن پڑی تو وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہ تھی کہ ماں کے ہوتے ہوئے تو وہ خود مہمانوں کی طرح ناشتہ کرتی تھی لہٰذا وہ کبھی تو اٹھ کر بچوں کو صبح ناشتہ بنا دیتی اور کبھی "اچھا اٹھتی ہوں" کہہ کر پھر سو جاتی۔ میں اور بھائی آوازیں دیتے رہتے لیکن وہ جب اٹھتی تو بچوں کا آفس ٹائم نکل رہا ہوتا اور وہ بغیر ناشتہ کئے گھر سے چلے جاتے کہ دفاتر میں پہنچتے ہوئے بھی انہیں آدھ پون گھنٹہ لگتا تھا۔ بچوں کی ماں نے اپنے جیتے جی بیٹی کی منگنی کر دی تھی۔ اب وہ لوگ شادی کے دن مانگ رہے ہیں اور ارادہ ہے کہ چار پانچ ماہ تک اس کی شادی کر دیں لیکن اس کے لئے میرے پاس وسائل نہیں ہیں اور سادگی سے شادی کرنے پر بھی ہزاروں روپے کا خرچہ ہوتا ہے۔ بڑا بیٹا 28 سال کا ہے اس کو شادی کا کہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں ابھی کم از کم ایک سال تک شادی نہیں کر سکتا کہ وہ جاب کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شادی کرنے کی صورت میں میری پڑھائی متاثر ہوگی اور میں یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لے پاؤں گا۔

ادھر بیٹی سے گھر کا کام نہیں سنبھالا جا رہا تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے وہ برائے نام ہی کام کرتی تھی۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے گھر چلی جاتی ہے تو گھر میں تو کھانا پکانے والا بھی کوئی نہیں۔ اب بچوں سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ڈیوٹیاں دے کر گھر آئیں اور پھر کھانا پکانے میں اپنے ہاتھ جلائیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی شادی کا فیصلہ کیا۔ بچوں نے پہلے تو اس فیصلے کی مخالفت کی پھر جب میں نے انہیں طریقے سے سمجھایا کہ اگر میری بیوی میری روٹی پکائے گی تو تمہیں بھی تو پکا دے گی اور گھر کا سسٹم

سنبھال لے گی جس پر بچے بات کو سمجھ گئے اور مان گئے۔

میں نے ایک اخبار میں اپنی شادی کے بارے میں اشتہار دیا تو کئی فون کالز آئیں۔ پھر کسی جگہ بات شروع میں ہی رہ گئی کسی کے ساتھ کچھ عرصہ چل کر ختم ہو گئی، کسی کے معیار پر میں پورا نہ اتر سکا اور کچھ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اترے۔ اس دوران ایک دو ایسی خواتین ملیں جو کہ صاحب اولاد تھیں مگر حالات کے شکنجے میں آ گئیں اور مردانہ وار حالات کے مقابل آ گئیں۔ وہ بڑی ہمدرد خواتین تھیں لیکن میرے ساتھ اس وجہ سے شادی نہیں کر سکیں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ ان کے بھی بچے ہیں اور میرے بھی بچے جوان ہیں تو شادی کرنے کی صورت میں بچوں کی وجہ سے نت نئے جھگڑے جنم لیں گے اور مسئلہ ہوگا۔ البتہ وہ خواتین اب بھی میرے رابطے میں ہیں۔ میں ان سے کبھی ملا نہیں لیکن ہم فون پر ایک دوسرے کے ساتھ دکھ سکھ شیئر کر لیتے ہیں۔

ایک ماہ بعد میری شادی کے سارے رابطے ختم ہو گئے صرف حناء نام کی ایک لڑکی رہ گئی جس کے ساتھ میری بات چیت چل رہی تھی۔ وہ بھی چنڈی کی ہی رہنے والی تھی اور دو اڑھائی ماہ میں ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور شادی کے لئے اپنا ذہن بنا لیا تھا۔ حناء نے بتایا تھا کہ اس کی عمر تیس سال ہے۔ وہ یونیورسٹی میں جاب کرتی ہے اور اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن ہے جو شادی شدہ ہیں۔ انہیں میری شادی کی فکر نہیں ہے لہٰذا میں نے اپنی شادی کا خود فیصلہ کرنا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میری عمر گو پچاس سال سے زائد ہے لیکن دیکھنے میں اپنی عمر سے پانچ سات سال چھوٹا نظر آتا ہوں۔ بطور جرنلسٹ جاب کر رہا ہوں اور میری تنخواہ دس ہزار روپے ماہانہ ہے۔ مکان کرائے کا ہے جس کا کرایہ چودہ ہزار روپے ہے اور وہ بچے ادا کرتے ہیں جبکہ میں جو کماتا ہوں۔ اس سے میرے گھر کا کچن چلتا ہے۔ میں نے حناء کو یہ بھی بتایا کہ اسلام آباد میں تین مرلے کا ایک پلاٹ لیا ہے جس پر سال دو سال میں گھر بنا لیں گے۔

اس نے بتایا کہ میں نے اپنے گھر شادی کی بات کی ہے تو بھائی کہتا ہے کہ اس آدمی کے بچے ہیں اور تنخواہ کم ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں بچوں کے ساتھ گزارا کر سکتی ہوں کہ زندگی میں نے گزارنا ہے اور ان کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گی اور ان کا خیال رکھوں گی۔ ایک روز میری چھوٹی بیٹی نے فون پر اس سے بات کی تو اس نے کہا کہ "پاپا نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ان سے شادی کرنے والی ہیں تو کیا آپ مجھ پر ظلم تو نہیں کریں گی"۔

"نہیں بیٹا میں تم پر کیوں ظلم کروں گی" اس نے کہا اور پھر مجھے کہا کہ بچی کی اس بات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اس نے یہ کیسے سوچا کہ میں اس پر ظلم کروں گی۔ میں نے بتایا کہ آج کل ٹی وی ڈراموں میں سوتیلی ماؤں کا ظلم دکھاتے ہیں لہٰذا اس کے ذہن میں یہی تصور ہے کہ سوتیلی مائیں ظلم کرتی ہیں۔

"نہیں نہیں میں کبھی ایسا نہیں کروں گی بلکہ میں آپ کو تو نظر انداز کر سکتی ہوں لیکن اس بچی کو کبھی نظر انداز نہ کروں گی اور ہاں آج کے بعد اس بچی کو آپ نے ڈانٹنا بھی نہیں ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ ابھی اس بچی کے پاس آ کر اس کو اپنے سینے سے لگا لوں کہ یہ کتنی پیاری ہے اور کتنی بڑی سوچ ہے اس کی"۔

میں اس کی اس بات پر خوش ہو گیا اور میں نے کہا "حناء مجھے اسی بچی کی فکر ہے کہ سب سے چھوٹی ہونے کے سبب مجھے بہت لاڈلی ہے بلکہ اس سے تو سب بہن بھائی بھی پیار کرتے ہیں۔ تم اس کا خیال رکھو گی تو میری فکر ہی ختم ہو جائے گی۔ دوسرے بچے تو بڑے ہیں نہ آپ ان پر ظلم کریں گی نہ وہ کرنے دیں گے کہ وہ سمجھدار ہیں۔

بڑی بیٹی ہے تو وہ شادی کے بعد اپنے گھر چلی جائے گی"۔

"نہیں، آپ اس کی فکر چھوڑ دیں"۔ اس نے کہا اور میں مطمئن ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں آپ کی باتوں کی سچائی سے بہت متاثر ہوئی ہوں کیونکہ آج کے دور میں لوگ بہت جھوٹ بولتے ہیں اور شادی کی بات ہو تو وہ خود کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں لیکن آپ نے مجھے ہر چیز سچ بتائی ہے"۔

"میں نے اس لئے سب کچھ سچ بتایا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے اس میں کبھی جھوٹ نہ بولنا چاہیے کہ جھوٹ کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والی عمارت کبھی بھی پائیدار نہیں ہوتی۔ جب سچائی کی حقیقت سامنے آتی ہے تو پھر جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ میاں بیوی کا یہ رشتہ دنیا کا سب سے کمزور رشتہ بھی ہے اور سب سے مضبوط رشتہ بھی ہے۔ کمزور اس لحاظ سے کہ ذرا سے جھگڑے پر مرد تین طلاق دیتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور مضبوط اس لئے کہ جب سارے رشتے اپنی اپنی سرگرمیوں میں گم ہو جاتے ہیں تو میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا زندگی کے آخری سانسوں تک ساتھ نبھاتے ہیں"۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں"۔ اس نے کہا "میں آپ کی سچائی سے متاثر ہوں"۔

"میں نے سچ اس لئے کہا ہے کہ تمہیں سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملے اور کل کو تم یہ نہ کہہ سکو کہ یہاں آپ نے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے تمہیں ہر بات سچ بتائی ہے اور تمہیں بھی کہوں گا کہ مجھے صرف سچ ہی بتانا ہوگا"۔

"جی ہاں، میں بھی ہر بات سچ ہی کہوں گی"۔

حنا مجھے تقریباً ہر روز کال کرتی تھی اور دس بیس منٹ تک بات کرتی رہتی۔ ایک روز اس نے کہا بھائی کہتا ہے تم [illegible] ہے میں نے کہا

پھر اس نے دوبارہ ملنے کا پروگرام بنایا لیکن نہ آئی اور ایک روز کہنے لگی کہ بھائی کہتا ہے کہ ان کو کسی روز گھر بلا لو کھانے پر۔

"یہ تو اور اچھی بات ہے تو کب آؤں میں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں بتا دوں گی آپ کو کہ آپ نے کب آنا ہے"۔ اس نے کہا لیکن اس نے یہ موقع بھی نہ دیا کہ میں اس کے پاس چلا جاتا۔ میں نے اسے دو تین بار اپنے گھر بلوایا تھا لیکن وہ وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آئی اور بعد میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا کہ میں اس وجہ سے نہیں آ سکی۔

چند دن بات ہوئی اور ایک روز میرا پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ میں کال کرتا تو وہ فون نہ اٹھاتی میں بہت پریشان ہوا اور پھر چوتھے روز اس نے کال کی اور بتایا کہ لاہور میں میری ایک خالہ تھیں جن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ سب گھر والے ادھر آئے ہیں۔ وہ تو ابھی ادھر رکیں گے لیکن میرا دل گھبرا رہا ہے اور میں جلد واپس آنا چاہتی ہوں۔

"تو آ جاؤ واپس کیا مسئلہ ہے"۔

"دراصل میرے پاس پندرہ ہزار روپے تھے وہ میں نے آپ سب کے لئے گفٹ خریدنے پر خرچ کر دیئے اور ابھی میرے پاس کرایہ کے لئے پیسے نہیں ہیں لہٰذا آپ مجھے تین ہزار روپے بھجوا دیں"۔

"لیکن اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں"۔

"مجھے نہیں پتہ آپ کسی سے لے کر بھجوا دیں اگر نہیں بھجوا سکتے تو بتا دیں آپ"۔

"اچھا میں کچھ کرتا ہوں"۔ میں نے کہا اور اس کو کسی سے پکڑ کر تین ہزار روپے بھجوا دیے۔ اس نے شام کو بتایا کہ وہ لاہور سے نکل رہی ہے اور صبح فون کر کے بات کرے گی کیونکہ رات کو میں لیٹ پہنچوں گی لیکن صبح اس نے نہ کال کی نہ میرا فون اٹینڈ کیا اور دو تین روز اسی

طرح گزر گئے۔ پھر ایک شام اس نے کال کی اور کہنے لگی میں ایک نے ایک ضروری بات کرنا ہے آپ سے ۔ بتایئے میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

آپ کو پتہ ہے کہ میں خالہ کے ہاں تھی''۔ اس نے کہنا شروع کیا۔''ایک رات پہلے جب میں ایک کمرے میں سو رہی تھی کہ میرا خالہ زاد بیٹا رات کے کسی پہر میرے کمرے میں آ گیا مجھے نہیں پتہ کہ وہ کب کمرے میں آیا اور اس نے کمرے کو اندر سے لاک کر کے مجھے جگایا چھری اس کے پاس تھی اس نے مجھے چھری سے ذبح کرنے کی دھمکی دے کر میرے ساتھ زیادتی کی اور...''

''بس حنا اب آگے کچھ مت کہنا مجھ میں سننے کی تاب نہیں ہے''۔ میں نے کہا۔

''تو رضوی آپ مجھے اب بھی قبول کر لیں گے؟''

وہ رو رہی تھی۔ میں جو یہ سب سن کر شاک میں چلا گیا تھا اس کا یہ فقرہ سن کر اپنے حواسوں میں آ گیا اور پھر میں نے ایک عزم سے کہا

''ہاں حنا، میں اس کے باوجود تمہیں قبول کروں گا کیونکہ اس سارے قضیئے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے''۔

''اور آپ زندگی میں مجھے کبھی اس بات کا طعنہ تو نہیں دیں گے''۔

''تمہیں تم اسٹام پر لکھوا لینا مجھ سے میں تمہیں کبھی طعنہ نہیں دوں گا''۔

''نہیں مجھے لکھوانے کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے آپ پر سو فیصد یقین ہے کہ آپ جو کہتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں''۔

''تم خود کو سنبھالو اور ریلیکس ہو جاؤ''۔ میں نے کہا۔

اس نے خود کو کسی حد تک سنبھالا اور پھر شام کو بات کی تو وہ خاصی حد تک نارمل ہو چکی تھی لیکن پھر تین روز تک وہ رابطے میں نہ آ رہی تھی۔ پھر ایک روز اس نے کال کی تو بڑی نحیف آواز میں بول رہی تھی کہ آپ کیسے ہیں؟

''کیا ہوا تمہیں اور کہاں غائب تھی؟!'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن موت نے مجھے قبول نہیں کیا''۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتی''۔

''جب میں نے تمہیں قبول کر لیا تھا اور اس حادثے کو بھول جانے کو کہا تھا تو پھر یہ حرکت کیوں کی؟'' میں نے کہا تو وہ شرمندگی سے چپ رہی۔

''تو کہاں رہی ہو؟'' میں نے پوچھا

''میں دو روز ہسپتال میں رہی ہوں اور ابھی اپنے گھر پر ہوں''۔

''ابھی کون ہے تمہارے پاس؟''

''میرے پاس بھائی اور بھابی ہیں وہ آ گئے ہیں لاہور سے''۔

''تم نے کسی کو بتایا نہیں؟''

''نہیں''۔ اس نے کہا۔

''اتنا بڑا حادثہ تمہارے اوپر گزر گیا اور تم نے کسی کو بتایا ہی نہیں؟'' میں حیران رہ گیا اس کی سوچ پر۔ ''یار بتانا تو چاہیے تھا نا ں تمہیں''۔ پھر اس نے میرے کہنے پر اپنی بھابی کو بتایا اور جب اگلے روز میں نے پوچھا کہ بھائی نے بات کی تو کہنے لگی نہیں وہ میرے کمرے میں نہیں آیا۔

''میں تمہیں دیکھنے کے لئے آنا چاہتا ہوں''۔

''نہیں ابھی نہ آیئے گا۔ میں ٹھیک ہو جاؤں تو پھر آ جائیں''۔

''ٹھیک ہے جیسے تم کہتی ہو''۔ اور میں مان گیا۔

ایک روز میں نے اسے کہا کہ حنا، میں نہیں جانتا

کہ تمہاری شکل و صورت کیسی ہے بلکہ میں نے تو تمہیں دیکھے بغیر قبول کرلیا ہے لیکن تم مجھ سے مل کر فیصلہ کرو کہ تمہارے ذہن میں ایک آئیڈیل ہوگا میری شخصیت کے بارے میں۔

"نہیں مجھے ضرورت نہیں ایسی میں نے آپ کے سنگ زندگی گزارنا ہے یہ میرا فیصلہ ہے"۔

"لیکن، تمہیں کیا پتہ کہ میں کالا ہوں، گنجا ہوں، میری شکل بدصورت ہے یا میرے منہ سے بو آتی ہے"۔

"آپ جو بھی ہیں مجھے قبول ہے"۔ اس نے کہا۔

پھر اس نے کہا کہ بھائی نہیں مانتے ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔

"اس میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے"۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے" اس نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا"۔

پھر اس نے بتایا کہ میں اپنی چیزیں پیک کروں گی۔

"چیزوں میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کپڑے، جیولری اور ڈاکومنٹس ہیں"۔

"ٹھیک ہے لیکن صرف اپنی ہی چیز اٹھانا"۔

"ہاں ہاں میں صرف اپنی چیزیں ہی لوں گی"۔

"کتنے دن لگیں گے اس کام میں؟" میں نے پوچھا۔

"تین چار روز لگیں گے"۔ اس نے کہا۔

اور پھر اس نے کہا کہ میری پیکنگ مکمل ہوگئی ہے اور پوچھنے لگی کہ میری گاڑی بھی ہے اس کا کیا کروں؟

"وہ کس کے نام ہے؟" میں نے پوچھا

"وہ میرے ہی نام ہے"۔

"تو اسے اُدھر ہی رہنے دو"۔

"نہیں ہمیں آگے پیچھے جانے میں اس کی ضرورت ہوگی"۔

"ٹھیک ہے پھر اپنی مرضی کرو"۔

"گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہے آپ کے گھر میں؟"

"ہاں گیراج ہے"۔ میں نے بتایا تو وہ بولی یہ تو اور اچھی بات ہے۔

"حنا! سوچ سمجھ لو آج اور ابھی موقع ہے کل کو تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے"۔

"نہیں، نہیں میں اٹل فیصلہ کر چکی ہوں کہ میری سانسیں اب آپ کے نام ہیں"۔

میں مطمئن ہوگیا۔

"اور ہاں، میں نے اپنی ایک کزن اور یو کے میں اپنی خالہ کو بھی بتا دیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ شادی کر رہی ہوں"۔ اس نے بتایا۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی کہ وقت سے پہلے سب کو بتا رہی ہو"۔

"ہاں تمہارے پیار میں پاگل ہی تو ہوگئی ہوں"۔

وہ ہنسی۔ "اور ایک بات اور بتاؤں آپ کو!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں نے ایک عامل سے زائچہ بنوایا ہے پانچ ہزار روپے دے کر اور اس نے بتایا کہ جس بندے سے آپ شادی کر رہی ہو وہ آپ کے ساتھ بہت مخلص ہے اور آپ کی زندگی اس کے ساتھ بہت اچھی گزرے گی۔ رضوی میں بہت لکی ہوں کہ مجھے آپ جیسا شوہر ملے گا"۔

"چلیں، خوشی ہوئی مجھے کہ تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں واقعی تمہیں خوش رکھوں گا اور تمہارے اعتماد پر پورا اتروں گا"۔

"میں اب بہت مطمئن ہوں"۔ اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے!" میں نے کہا۔

"اور ہاں، میری بات سنیں"۔ اس نے فون پر کہا۔

"جی سن رہا ہوں"۔ میں نے کہا۔
"شادی پر تو بہت خرچہ ہوتا ہے ناں!"
"ہوں"۔ میں نے کہا۔
"لیکن یہاں تو آپ کی شادی مفت میں ہو رہی ہے"۔ اس نے شرارت سے کہا۔
"مفت میں تو نہ کہو، لاڑ تو ہزاروں کے حساب سے فیس لیتا ہے ناں!"
"ہاں لیکن شادی کا جوڑا تو مرد کی طرف سے ہی ہوتا ہے ناں!"
"ہاں ہوتا ہے تو میں خرید لیتا ہوں"۔
"نہیں مجھے اپنی پسند کا خود خریدنا ہے۔ آپ مجھے اس سوٹ کے لئے پیسے بھیج دیں"۔
"کتنے پیسے ہوں گے؟"
"آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا۔
"میرا خیال ہے دو ہزار روپے میں سوٹ آ جائے گا"۔ میں نے کہا۔
"آپ کہاں رہتے ہیں جناب!" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "پانچ ہزار روپے سے کم میں سوٹ نہیں آتا دو ہزار روپے میں تو خالی لون کا سوٹ آتا ہے"۔
"رعایت کرو ناں میرے ساتھ کچھ کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔
"چلیں آپ چار ہزار روپے بھیج دیں ایزی پیسہ سے میں سلائی خود دے دوں گی"۔
"ٹھیک ہے مجھے اپنا کارڈ نمبر دو میں بھیج دیتا ہوں"۔ اس نے کارڈ نمبر دیا اور میں نے کسی دوست سے ادھار پکڑ کر اس کو چار ہزار روپے بھیج دیئے۔
"میں شام کو پانچ بجے آپ کے آفس کے سامنے آ جاؤں گی"۔ اس نے کہا۔ شام پانچ بجے میں نے اسے فون کیا کہاں ہو۔
"میں پندرہ منٹ میں آپ کے پاس پہنچ رہی

علم حق

علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت۔ یہ علم حق کی ابتدا ہے۔

(علامہ اقبالؒ)

ہوں۔ اس نے کہا لیکن وہ ساڑھے پانچ بجے تک نہ آئی تو میں نے فون کیا تو اس کا نمبر آف تھا۔ میں پانچ بجے چھٹی کر لیتا تھا لیکن اس کی وجہ سے دفتر میں بیٹھا رہا۔ رات آٹھ بجے تک اس کا نمبر آف ہی ملا اور بالآخر میں گھر لوٹ آیا۔ اس کا نمبر اگلے تین روز تک آف ہی رہا اور چوتھے روز اس نے مجھے فون کیا میں نے کہا کہ تم پندرہ منٹ تک پہنچ رہی تھی میرے آفس میں پھر ایسے ہوا کہ تم دس کلک ہو گئی جیسے آتے ہوئے کسی جن نے تمہیں اچک لیا ہو تو مجھے یہ تو بتا دو کہ ہوا کیا تھا۔
"کچھ نہیں"۔ اس نے کہا۔ "میں چاندنی چوک پہنچ گئی تھی کہ مجھے ایک کال آئی کہ جس بندے سے تم شادی کر رہی ہو یہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے لہٰذا تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی اس کال کی وجہ سے میں واپس چلی گئی"۔
"ٹھیک ہے لیکن......" اس نے مجھے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا اور بولی۔ "لیکن آپ مجھ سے یہ سوال نہیں کریں گے کہ مجھے کال کرنے والا کون تھا"۔
"ٹھیک ہے میں نہیں پوچھتا لیکن اتنا بتا دوں کہ کال کرنے والا میرا کوئی دوست یا جاننے والا ہرگز نہیں ہوگا وہ تمہارا ہی جاننے والا ہوگا"۔

''مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ آپ کرید کرید کر سوالات نہیں کرتے ورنہ آپ کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اس طرح بال کی کھال اتارتا کہ مجھے اس سے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتا''۔ اس سے بات ہوتی رہی پھر بمشکل ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ وہ پھر رابطہ ختم کر بیٹھی میری کال جاتی اور وہ پک نہ کرتی تیسرے روز اس نے مجھے کال کی اور بتایا کہ بھائی اور بھابی بیرون ملک چلے گئے ہیں اور میں بیمار ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''مجھے فوڈ پوائزنگ ہو گیا تھا اور میں تین روز ہسپتال میں ایڈمٹ رہی ہوں اور آج ہی گھر آئی ہوں مجھے کتنی ہی ڈرپس لگ چکی ہیں ابھی بھی ڈرپ لگی ہے گھر پر''۔

''اوہو!'' میں نے تاسف کا اظہار کیا اور پوچھا۔

''ابھی کون ہے تمہارے پاس؟''

میری پھوپھو آئی ہیں وہی ہیں میرے پاس۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے''۔

''میں مزاج پرسی کر لوں آکر؟''

''نہیں، آپ نہ آئیں''۔

ٹھیک ہے میں پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ رابطے میں رہی اور دن میں دو تین بار کال کر لیتی اور پھر تیسرے روز اس نے بتایا کہ آج میری طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے اور میں نے پیٹ بھر کر کھانا بھی کھایا ہے لیکن میں ابھی ڈیوٹی پر نہیں جا سکتی کیونکہ چکر آ رہے ہیں۔

''ہاں تم دو دن ریسٹ کرو تو ٹھیک ہو جائے گا سارا معاملہ''۔ میں نے کہا۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے''۔

''وہ کیا؟''

''پھوپھو نے واپس گھر جانا ہے دو دن کے لئے آئی تھیں اور اب کتنے ہی دن ہو گئے ہیں''۔

''تو میرے لئے کیا حکم ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''مجھے تین ہزار روپے بھیج دیں''۔ اس نے فرمائش کر دی۔

''تمہیں پتہ ہے کہ مہینے کے آخری دن ہیں میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔ میں نے اسے بتایا۔

''یار میں دے دوں گی آپ کو واپس فی الحال میرے لئے بینک جانا مشکل ہے''۔

''اچھا ٹھیک ہے''۔ میں نے کہا اور اسے تین ہزار روپے بھجوا دیئے۔

اس کی پھوپھو نے شام کو جانا تھا لیکن اس روز بارش بہت تیز ہو رہی تھی لہٰذا کہنے لگیں صبح جائیں گی۔ صبح حناء نے سات بجے کے قریب فون کیا کہ میں پھوپھو کے ساتھ لاہور جا رہی ہوں کہ وہاں پر میرے ماموں کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ میں نے پڑھا اور تعزیت کی تو کہنے لگی۔

''آپ مجھے تین چار روز فون نہ کرنا، وہاں میں فون اٹینڈ نہ کر پاؤں گی''۔

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔ ''تم خود ہی رابطہ کر کے اپنا پروگرام بتا دینا کہ کب واپس آ رہی ہو''۔

''میں جلد ہی کوشش کروں گی''۔ اس نے کہا۔ پھر وہ وہاں سے فون کرتی رہی اور پھر وہی مسئلہ کہ مجھے پیسے بھجواؤ واپسی کرائے کے لئے۔ پھر دو ہزار روپے بھجوائے اسے اور اس نے بتایا کہ وہ آج شام کو واپس آ رہی ہے میں رات دس بجے تک ڈائیوو اڈے پر پہنچ جاؤں گی آپ مجھے لینے آ جانا۔

ٹھیک ہے میں نے کہا اور شام کو ساڑھے نو بجے اسلام آباد جانے کیلئے وین میں سوار ہو گیا جب آدھے راستے میں پہنچا تو اس کی کال آئی کہ آپ کہاں ہیں میں نے بتایا کہ آدھے راستے میں پہنچ چکا ہوں

"آپ واپس چلے جائیں پلیز!"
ٹھیک ہے میں نے کہا اور میں وہیں سے اتر گیا اور دوسری گاڑی میں واپس آ گیا۔ وہ کس وقت گھر پہنچی میں نہیں جانتا تھا لیکن مجھے اس نے صبح سات بجے کال کی اور بتایا کہ رات میں جس بس میں اسلام آباد پہنچی تھی اسی بس میں میرا وہ کزن بھی سوار تھا جس نے میری عصمت لوٹی تھی اب میں واپس لاہور جا رہی ہوں اب میں اس کو نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے کہا تم مجھ سے مل لو مل کر کسی وکیل سے بات کرتے ہیں اور اس کے مطابق تم کارروائی کر لینا۔
"نہیں میں رک نہیں سکتی اور اب تو ویسے بھی میں پنڈی کی حد سے باہر نکل چکی ہوں۔ وہاں مجھے تین چار روز لگیں گے اور پھر واپسی ہو گی"۔
شام کو اس نے مجھے کال کر کے بتایا کہ پولیس نے اس کے کزن کو گرفتار کر لیا ہے، اس نے پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے اور اب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہے لیکن میرے خاندان کے سارے بزرگ اکٹھے ہو کر مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں اسے معاف کر دوں اور اس کے ساتھ شادی کر لوں کہ بات گھر کے اندر ہی ختم ہو جائے۔
"یہ اچھا انصاف ہے"۔ میں نے کہا۔ "کہ مجرم کو سزا دینے کی بجائے اس کی مدد کر رہے ہیں، خیر! تم نے کیا جواب دیا؟"
"میں نے کہا ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے آپ کے ساتھ"۔ حنا نے بتایا۔
"تو پھر انہوں نے کیا کہا؟"
"انہوں نے کہا اگر شادی ہو چکی ہے تو تمہارے شوہر کو تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا"۔ میں نے کہا۔ "وہ تو آ رہے تھے ساتھ لیکن میں نے خود منع کر دیا کہ یہاں جھگڑے کا امکان تھا اس لیے"۔

اور تمہارے شادی کے پیپر کہاں ہیں؟ ان کا سوال تھا۔
"وہ میرے گھر پڑے ہیں میں جا کر بھجوا دوں گی"۔ میں نے کہا ہے انہیں۔
"اچھا اب واپسی کب ہے؟" میں نے حنا سے پوچھا۔
"جب آپ پیسے بھیجیں گے"۔ وہ ہنسی۔
"کیا مجھے بینک منیجر سمجھ لیا ہے تم نے؟"
"نہیں اپنا مجازی خدا ہی سمجھا ہے تبھی تو آپ کو کہتی ہوں ورنہ رشتہ نہ ہو تو بندہ کسی سے کچھ کہہ سکتا ہے"۔
"ٹھیک ہے میں دو ہزار روپے بھجوا دیتا ہوں۔
پھر میں نے دو ہزار روپے بھجوا دیے اور پھر اس نے بتایا کہ پیسے مل گئے ہیں لیکن لاہور سے نکلتے نکلتے اسے شام ہو گئی۔ رات کو اس نے بتایا کہ میں پنڈی نہیں آؤں گی ادھر کلر کہار میں رک گئی ہوں اور یہاں سے صبح چھ بجے نکلوں گی اور آٹھ بجے اسلام آباد آ جاؤں گی آپ ادھر ہی آ جانا۔ صبح آٹھ بجے کی بجائے اس نے نو بجے فون کیا اور بتایا کہ میرا ادھر نکاح ہو گیا ہے
"ٹھیک ہے"۔ میں نے کہا اور فون بند [illegible] نے دوبارہ فون کیا اور کہا آپ مجھے مبارک [illegible] گے۔
"نہیں تم میرے زخموں پر نمک پاشی [illegible]"
"لیکن میں تم سے شادی کے بعد بھی رابطہ [illegible] چاہتی ہوں"۔ اس نے کہا۔
"سوری میں نہیں رکھ سکتا اس طرح کے رابطے"۔
"ٹھیک ہے آپ کی مرضی"۔ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت میرے دل کی حالت کیا ہو رہی تھی یہ میں ہی جانتا ہوں یا وہ سمجھ سکتا ہے جس کے ساتھ ایسی صورت حال گزر چکی ہو۔ میرا اور اس کا رابطہ ختم ہو چکا تھا کہ چوتھے روز اس نے پھر کال کی اور بولی رضوی مجھے

معاف کر دو۔

"کس بات کی معافی؟" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کے ساتھ مذاق کیا تھا"۔

"اور یہ مذاق کیوں کیا تھا؟"

"بس مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے"۔

"تمہیں کیا امید ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"آپ سے مجھے یہی امید ہے کہ آپ مجھے کھلے دل سے معاف کر دیں گے"۔

"تو ٹھیک ہے میں نے معاف کیا"۔

"سچ"۔ وہ خوشی سے چیخ اٹھی اور بولی۔ 'You are really grat man.' اور آپ مجھے کبھی طعنہ تو نہیں دو گے؟"

"نہیں"۔ میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے اس مذاق سے خوشی ہوئی ہے کہ تم اب بھی میری ہو..... تم اب کدھر ہو لاہور میں؟"

"نہیں لاہور میں ہی ہوں؟"

"لیکن تم تو کہہ رہی تھی کہ وہاں خاندان والے تم پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور تم جلد نکلنا چاہتی ہو اُدھر سے"۔

"اُدھر سے تو میں نکل آئی ہوں لیکن اپنی ایک دوست کے پاس ٹھہری ہوئی ہوں"۔

"کیوں؟"

"کرایہ نہیں ہے میرے پاس!"

"تو کرایہ اس سے لے لو"۔

"نہیں ناں، آپ نہ دیں میں پڑی رہوں گی اُدھر ہی"۔

"نہیں کیوں پڑی رہو گی اُدھر؟" میں نے کہا۔

"اچھا میں تمہیں دو ہزار روپے بھجوا دیتا ہوں"۔

"نہیں مجھے تین ہزار روپے بھجوانا ہیں"۔

"لیکن میری جان! لاہور سے پنڈی آنے کا ڈائیوو کا کرایہ تو ساڑھے سات سو روپے ہے"۔

"لیکن آپ کو تین ہزار روپے ہی بھجوانا ہیں"۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے کہا اور ایک بار پھر اسے تین ہزار روپے ایزی پیسہ سے کرایہ بھجوا دیا جس کا رسیونگ میسج ملا تو پتہ چلا کہ پیسے اس نے راولپنڈی میں ہی وصول کیے ہیں۔

قارئین! 21 مارچ کو میری بڑی بیٹی کی سالگرہ تھی اور 24 مارچ کو میری چھوٹی بیٹی کا رزلٹ ڈے تھا اس موقع پر اس نے میری بچیوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئے گی لیکن اس نے مجھے بھی دھوکہ دیا اور میری بچیوں کو بھی۔ میں نے اسے ہر بات سچ بتائی اور اس نے اپنی مرحومہ ماں کے نام کی قسم کھا کر کہا کہ وہ مجھے دھوکہ نہ دے گی لیکن اب اس کے بقول پنڈی پہنچ کر بھی دس روز سے میرے رابطے میں نہیں ہے۔

جس روز اس نے آنے کا بتایا تھا میں نے دو روز اسے کال کیا اس کے فون کی بیل مسلسل بجتی رہی لیکن اس نے کال پک نہ کی اب میں نے دل پر صبر کی سل رکھ لی ہے کسی کو دل میں بسا کر نکالنا کتنا مشکل ہے یہ صرف دل والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے زخم تو اب دو چند ہو گئے ہیں پہلے بیوی کی موت کا صدمہ تھا اب حنا نے دل زخمی کر کے میرے اعتماد کے پرزے اڑا دیے ہیں۔

دنیا دوسروں کے جذبات سے کیسے کھیلتی ہے۔ میں جس راستے پر چلا تھا آج مہینوں بعد بھی اسی راستہ پر کھڑا ہوں۔ اب میں کسی ایسی مخلص، ہمدرد اور دکھی خاتون کی تلاش میں ہوں جو پڑھی لکھی اور خود مختار ہو اور صحیح معنوں میں میرے ساتھ مخلص ثابت ہو۔ میری چھوٹی بچی کو ماں کا پیار دے سکے اس کا اپنا ایک چھوٹا بچہ ہو تو بھی قابل قبول ہے اس کو میں باپ کا پیار دوں گا اور اس بچے کو کسی موڑ پر باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔

◆◆◆

بھارت کا منصوبہ "کولڈ سٹارٹ ڈوکرائن" پاکستان نے مکمل طور پر ناکام بنا دیا ہے جس کے مطابق بھارتی فوج نے پاکستان کے آٹھ کمزور حصوں سے گھس کر پاکستان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا تھا

بھارت کا جنگی جنون

☆ گلزار اختر کاشمیری

0301-3005908, 0345-8599944

سانحہ پشاور میں بھارت ملوث ہے

مورخہ 27 جنوری سینٹ میں قائمہ کمیٹی برائے دفاع کے ان کیمرہ اجلاس میں بریفنگ کے دوران سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عالم خٹک نے انکشاف کیا ہے کہ پاک فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف نے امریکہ کو بھارت کے ملوث ہونے کے تمام ثبوت فراہم کر دیے ہیں جبکہ امریکہ نے پاکستان کو کالعدم تحریک طالبان کے سربراہ ملا فضل اللہ کو افغانستان میں مارنے یا زندہ پکڑنے کی مکمل یقین دہانی کرائی ہے۔

گرفتاری کی صورت میں پاکستان کے حوالے کیا جائے گا۔ آرمی چیف نے امریکہ کو افغان سرزمین سے پاکستان میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں بھارت کے ملوث ہونے کے ناقابل تردید ثبوت پیش کیے۔ اس میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ بھارت ہی پاکستان میں دہشت گردی کی سرپرستی کر رہا ہے اور بے گناہ اور معصوم افراد کو مروانے میں ملوث ہے۔

سانحہ پشاور میں دہشت گردوں کے زیر استعمال اسلحہ بھارتی ساختہ تھا جس کے ثبوت لے کر آرمی چیف اور DG،ISI نے افغان صدر ملٹری چیف افغانستان اور ایساف کے کمانڈر سے ملاقاتیں کر کے وہ سارے ثبوت ان کے سامنے رکھے۔ حساس اداروں نے حکومت کو بھی وہ سارے ثبوت دکھائے مگر ہماری حکومت کھلے دل سے یہ اعلان نہیں کر سکی کہ بھارت پاکستان میں دہشت گردی کروا رہا ہے۔ ان ثبوتوں کو لے کر امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے بھارتی قیادت کو پاکستان میں دہشت گردی

کے واقعات کے حوالے سے ٹھوس ثبوتوں کی روشنی میں استفسارات کیے تو بھارتی قیادت تردید کرنے لگی۔ جان کیری نے کہا کہ بھارتی ایجنسیاں اس میں ملوث ہیں۔

اکتیس دسمبر کو ایک کشتی کے حوالے سے جب بھارت نے پاکستان کو ملوث کرنے کی کوشش کی تو جان کیری نے وزیراعظم نریندر مودی سے ملاقات کے دوران کہا کہ سانحہ پشاور کے حوالے سے امریکہ کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ سانحہ پشاور میں بھارت ملوث ہے کیونکہ دہشت گردوں کو بھارتی این جی اوز اور بھارتی حساس اداروں نے مالی امداد و اسلحہ فراہم کیا تھا تو نریندر مودی نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کرتے جس پر جان کیری نے یہ جواب دے کر اسے خاموش کر دیا کہ آپ نہیں کرتے مگر آپ کے خفیہ ادارے تو ایسا کرتے ہیں۔ جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جان کیری نے ملا فضل اللہ سے بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے روابط کے ثبوت بھی پیش کیے۔

پاکستان میں دہشت گردی میں شروع سے ہی بھارت کا ہاتھ رہا ہے مگر امریکہ اور یورپین ممالک تسلیم نہیں کرتے تھے۔ پاکستان کے ساتھ جڑی ہوئی سرحدوں سے وہ دہشت گردوں کو پاکستان میں داخل کرتا ہے بلکہ افغانستان میں بھی 26 قونصل خانے کھول رکھے ہیں۔ جہاں سے وہ افراد بھرتی کر کے ان کو تربیت دے کر پاکستان بھیجتا ہے۔ مگر عالمی طاقتوں نے کبھی اس کو اہمیت نہیں دی۔ امریکہ اور یورپ نے اس لئے اہمیت نہیں دی تھی تاکہ بھارت ناراض نہ ہو جائے۔ بھارت کی قومی پالیسی کا حصہ ہے کہ وہ پاکستان کو نقصان پہنچاتا رہے۔ سانحہ پشاور پر بھارت نے دکھ کا اظہار بھی کیا اور در پردہ ساری کارروائی بھی اس نے کروائی۔ فوج نے کئی مرتبہ بھارتی اسلحہ پکڑا اور حکومت کو بتایا اور پاکستانی وزیر داخلہ رحمٰن ملک یہ اعلان تو کرتے رہے کہ غیر ملکی اسلحہ استعمال ہوا ہے۔ مگر بھارت کا نام لینے سے ہمیشہ گریز کیا۔

بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کے مشیر برائے قومی سلامتی اجیت کمار دیول نے افغانستان میں مولوی فضل اللہ سے خود ملاقات کی اور اس کارروائی کے لئے رقم فراہم کی اور قندھار میں بھارتی قونصل خانے سے اسلحہ فراہم کیا گیا۔ یہ وہ شخص ہے جو پاکستان، چین اور سری لنکا میں تخریبی کارروائیوں میں ملوث رہا ہے اور یہ کسی غیر ہندو کو جینے کا حق ہی نہیں دیتا ہے۔ امریکہ پہلے بھی بھارت کے ساتھ طالبان کے تعلق کو جانتا تھا مگر یہ وہ طالبان تھے جو امریکہ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے۔ اجیت کمار دیول کا کافی عرصہ سے ان پاکستانی طالبان سے رابطہ ہے۔ ملا فضل اللہ کے امریکہ، بھارت اور سوئس بینکوں میں بھی اکاؤنٹ ہیں جہاں پر اسے بے مثت کی جاتی رہی ہے۔ ابھی امریکہ نے اس کے اثاثے منجمد کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔

کیا امریکہ کو اس سے قبل اس کے اثاثہ جات کی اطلاع نہ تھی؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا فضل اللہ کے امریکیوں سے بھی تعلقات تھے۔ تب ہی اس نے اثاثے وہاں جمع کر رکھے تھے۔ بھارت افغانستان میں ترقیاتی کاموں کی آڑ میں دہشت گردی کے تربیتی کیمپ چلا رہا ہے۔ بھارتی خفیہ تنظیم ”را“ کی زیر نگرانی یہ تربیتی کیمپ کام کر رہے ہیں۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افغانی غیر قانونی طور پر حال ہی میں پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں جبکہ بھارت اربوں ڈالر خرچ کرنے کے علاوہ دریائے کابل پر نصف درجن سے زائد ڈیم بنانے کے منصوبے پر کام شروع کر چکا ہے۔ ان افغانیوں میں کتنے ہی دہشت گرد اور کتنے غیر ملکی ایجنٹ پاکستان آ چکے ہوں گے۔

بھارت کا دفاعی مشیر ڈوول اعلانیہ طور پر پاکستان

میں مداخلت اور سیٹھ ابراہیم جیسے شخص کے لئے کمانڈوز کے ہمراہ پاکستان کے ایک بڑے اخبار کے این جی اوز پروگرام کے ذریعے پاکستان آنے کا پروگرام طے کر چکا ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ بھارت کے مفاد کے لئے کسی بھی وقت پاکستان میں کارروائی کر سکتا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اتنے شواہد کی موجودگی میں کسی بھی پاکستانی سیاسی لیڈر نے سانحہ پشاور کے حوالے سے بھارت کا نام نہیں لیا۔ اگر بھارت میں ایسا ہوتا تو براہ راست افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کا نام لیا جاتا۔

پاکستان کی سلامتی کے خلاف سازشیں

یو ایس ایس آر نے بھی افغانستان پر قبضے کا خواب اسی وجہ سے دیکھا تھا کہ وہ اس راستے گوادر تک پہنچے اور گوادر کے راستے مشرق وسطیٰ اور خلیجی ممالک تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکے۔ اس نے فقط افغانستان میں نہیں رہنا تھا۔ اس کوشش میں وہ سپر پاور کے درجے سے گر کر بین الاقوامی برادری میں اپنا مقام کھو بیٹھا۔ امریکہ اور بھارت بھی اس کی وجہ سے پاکستان میں توڑ پھوڑ، انتشار اور علیحدگی کی تحریکیں پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ گوادر کی بندرگاہ پر اس وقت سب کی نظریں ہیں۔ ایران اس لئے تشویش میں مبتلا ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی چاہ بہار بندرگاہ متاثر ہوگی۔ اس وقت افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں کی ساری آمدورفت ایران کے ذریعے ہے۔ بھارت بھی افغانستان میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اسے بحری جہازوں کے ذریعے افغانستان میں سامان لے جانے اور یہاں سے بمبئی پہنچانے میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی ایران کی چاہ بہار بندرگاہ استعمال کرتا ہے۔ بھارت کے لئے آسان راستہ واہگہ بارڈر کے راستے طورخم اور جلال آباد تک صرف آٹھ گھنٹوں کا ہے۔ مگر راستے میں پاکستان ہے۔ امریکہ اور بھارت پچھلے کافی عرصے سے پاکستان پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ بھارت کو پاکستان راستہ دے مگر اس کی گاڑیاں چیک نہ کی جائیں۔ جس طرح امریکی کنٹینرز بغیر چیک کئے کراچی سے افغانستان جاتے تھے۔ ایسے ہی بھارت کو بھی اجازت دی جائے۔ سابق صدر آصف علی زرداری کے دور میں کچھ معاملات طے ہو گئے تھے مگر وہ جنرل کیانی کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۔ اس لئے معاملہ التوا کا شکار ہو گیا۔

بھارت پاکستان کو توڑ کر کمزور کرنا چاہتا ہے تا کہ دیگر کمزور ریاستوں کی طرح پاکستان کو بھی اپنے ماتحت رکھ سکے اور پاکستان کسی قسم کی مزاحمت نہ کر سکے۔ امریکہ بھی بلوچستان پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بلوچستان میں سونا، لوہا، کوئلہ، تیل اور سب سے بڑھ کر گوادر کی بندرگاہ ہے جہاں وسط ایشیائی ریاستوں سے تیل نکال کر آسان گزرگاہ سے امریکہ اور یورپ لے جایا جا سکتا ہے۔ کئی سال پہلے ہی نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر سندھ، بلوچستان اور کے پی کے کو الگ کرنے کا منصوبہ بنا کر بے شمار مال و دولت کے ذریعے اور پاکستان میں مقامی ایجنٹوں کے ذریعے بدامنی اور فساد پھیلانے کی عملی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ بی ایل اے اور دیگر تنظیمیں اس کا ثبوت ہیں جبکہ سرداری نظام بھی پاکستان کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ گوادر کو پاکستان کے اندرونی راستوں سے وسط ایشیائی راستوں اور چین تک آسان رسائی کے خوف سے امریکہ اور ہندوستان کے مفادات کو بہت نقصان اور پاکستان کا بے حساب فائدہ انہیں پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ امریکہ ایران اور پاکستان کے تعلقات بھی خراب کرنا چاہتا ہے تا کہ ایران سے گیس پائپ لائن پاکستان اور پاکستان سے چین نہ پہنچ سکے۔

بھارت ایک طرف سرحدوں پر روزانہ چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے، دوسری طرف کراچی میں بدامنی، بھتہ خوری

اور قتل و غارت کرنے والے لوگوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ یہاں کے مقامی لوگوں کو بھارت لے جا کر دہشت گردی کے کیمپوں میں ان کو تربیت دے کر استعمال کر رہا ہے اور یہ سب کچھ مقامی لوگوں کو شامل کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس ساری صورت حال میں واضح ہے کہ پاکستان کے خلاف ہندوستان اور اس کے آقاؤں کا منصوبہ بالکل واضح ہے۔ وہ اپنے کولڈ سٹارٹ کے منصوبے کے تحت افواج پاکستان اور چینی افواج کے خلاف بیک وقت کارروائی کر کے خود کو منی سپر پاور کے درجے پر لانا چاہتا ہے۔ اس حوالے سے بھارت اپنے سرحدی علاقوں میں فوجی نقل و حرکت کے لئے استعمال ہونے والی سڑکوں، پلوں، ریلوے لائنوں اور رکاوٹوں کو تیزی سے مضبوط کر رہا ہے تاکہ ہوائی اڈوں کے ساتھ ساتھ زمینی افواج کو بھی تیزی سے اگلے مورچوں تک رسائی اور حملہ آور کارروائیوں کے لئے استعمال کر سکے۔

ہندوستان پاکستان میں اپنے اعلانیہ اور خفیہ اتحادیوں کے ساتھ پاکستانی دہشت گردوں کو پیسے اور ٹیکنیکی تعاون سے دہشت گردانہ کارروائیوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد پاکستان کو اندرونی مسائل میں الجھا کر افغان مہاجرین کے روپ میں اپنے ایجنٹوں کو متحرک رکھے اور فرقہ پرستی کے منافرت کو ہوا دینا قوم کو تقسیم کرنے کے لئے صوبائی اور لسانی تعصب پھیلانا بالخصوص نام نہاد انسانی حقوق والی این جی اوز کے ذریعے افواج پاکستان کے خلاف لوگوں میں نفرت پیدا کرنا تاکہ مرکز صوبوں اور عوام میں اشتعال انگیزی کے ساتھ ساتھ علیحدگی کے جذبات پیدا ہوں۔ وہ مقامی ایجنٹوں کو خواہ وہ کسی بھی بڑے عہدے پر ہوں، این جی اوز اور ملٹی نیشنل کمپنیوں اور خفیہ لوگوں کے ذریعے قرضے، مراعات اور پرکشش ترغیبات، بیرون ممالک ان کے بچوں کو بھیجنا اور وہاں ان کو روزگار دلوانے کے بدلے خرید کر ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہماری سب ایجنسیوں کو، حکومت کو اور سب سے بڑھ کر عوام کو خبردار رہنا ہوگا۔ تب ہی ہم اپنی مادر وطن کا دفاع کر سکتے ہیں۔

پاکستان کا فلیگ میٹنگ نہ کرنے کا اعلان

شکرگڑھ سیکٹر میں پچھلے دنوں اطراف سے فائرنگ کے دوران بھارت کی طرف سے سفید جھنڈا لہرا کر اشارہ کیا گیا کہ سیکٹر کمانڈر (No Man Land) پر آ کر ملاقات کریں گے۔ ملاقات کے لئے دونوں اطراف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ بھارت کی طرف سے ملاقات کے لئے آنے والی ٹیم پہلے پہنچ گئی۔ انہوں نے کچھ اسلحہ بردار افراد چھپا دیئے۔ جوں ہی پاکستان کی طرف سے ابتدائی گروہ کے دو افراد No Man Land کے قریب پہنچے تو بھارتی چھپے ہوئے افراد نے فائرنگ کر دی اور دونوں پاکستانی جوان شہید ہو گئے اور رات تک ان کی ڈیڈ باڈی بھی نہیں اٹھانے دی۔ بھارتی دراصل پاکستان رینجرز کے سیکٹر کمانڈر کو ملاقات کے بہانے بلا کر شہید کرنا چاہتے تھے مگر کمانڈر سے پہلے دو افراد حالات دیکھنے کے لئے گئے اور دونوں شہید ہو گئے۔ چناب رینجرز کے ان دو جوانوں کی شہادت کے بعد اعلان کیا کہ آئندہ سیکٹر کمانڈر کی سطح سے کوئی ملاقات نہیں ہوگی۔ ڈائریکٹر جنرل رینجرز پنجاب میجر جنرل خان طاہر جاوید خان نے کہا کہ بھارت سے اب نچلی سطح پر کوئی فلیگ میٹنگ نہیں ہوگی۔ ڈی جی سطح پر مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ جب رینجرز کے جوان بھارتی فائرنگ سے شہید ہونے والے جوانوں کو اٹھانے کے لئے گئے تو بھارتی فوج نے فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ رکوانے کے لئے بھارتی پلاٹون کمانڈر سے لے کر ڈی جی ایم تک سب سے رابطہ کیا لیکن فائرنگ بند نہیں ہوئی اس لئے بھارت کو بتا دیا

گیا ہے کہ آئندہ کسی بھی سیکٹر پر سیکٹر کمانڈر کی فلیگ میٹنگ نہیں ہو گی کیونکہ بھارت نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔

بھارت اسلحہ کا ڈھیر کیوں جمع کر رہا ہے؟

بھارت نے ایٹم بم بنانے کے بعد روس کی مدد سے میزائل پروگرام شروع کیا تھا۔ بھارت نے پرتھوی میزائل، اگنی، ترشول میزائل اور ناگ میزائل کے علاوہ اور بھی میزائل تجربات کئے۔ اس کے علاوہ بھارت جہاں دنیا سے دیگر اسلحہ کا بڑا خریدار ہے وہاں میزائل ٹیکنالوجی اور تیار میزائل بھی خرید رہا ہے۔ اسلحہ کی درآمدات کے لحاظ سے بھارت دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔ دوسرے نمبر پر چین اور جنوبی کوریا اور تیسرے نمبر پر پاکستان ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں جتنا اسلحہ فروخت کیا گیا 2006ء سے 2010ء تک اس کا نو فیصد اسلحہ بھارت نے خریدا جبکہ اس عرصہ میں چین اور جنوبی کوریا نے 6-6 فیصد جبکہ پاکستان نے پانچ فیصد اسلحہ درآمد کیا۔

دفاعی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ بھارت مستقبل میں بھی سب سے زیادہ اسلحہ خریدنے والا ملک ہوگا کیونکہ وہ مستقبل میں بڑی تعداد میں لڑاکا طیارے، نیول سسٹم اور بھاری اسلحہ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پچھلے پانچ سال کے دوران بھارت نے اسلحے کی خریداری میں 21 فیصد اضافہ کیا۔ اس وقت بھارت کا دفاعی بجٹ 34 ارب ڈالر ہے۔ دو سال میں بھارت نے دفاعی بجٹ میں چالیس فیصد اضافہ کیا ہے۔ بھارت اپنے اسلحہ کا ستر فیصد دوسرے ممالک سے درآمد کرتا ہے۔ بھارت کی کل درآمدات میں 71 فیصد لڑاکا طیاروں پر مشتمل ہے اور اس سے قبل وہ سب سے زیادہ اسلحہ روس سے خریدتا تھا جو اس کی کل دفاعی درآمدات کا 82 فیصد ہے۔ بھارت مستقبل میں بھاری مالیت کے جو جنگی سودے کرنا چاہتا

ہے ان میں 11 ارب ڈالر کے 126 لڑاکا طیاروں اور چار ارب ڈالر کے 200 جنگی ہیلی کاپٹروں کی خریداری شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھارت چھوٹے جنگی بحری جہاز بھی خریدنے کا منصوبہ بنا رہا ہے جن میں سے ہر ایک کی مالیت 30 کروڑ سے 50 کروڑ ڈالر تک ہوگی۔ اس کے علاوہ دس کروڑ ڈالر کی لاگت سے آبدوزوں کی خریداری کے لئے بھی بات جاری ہے۔ 2006ء سے 2010ء تک ایشیائی ممالک نے کل اسلحہ کا 43 فیصد اور یورپین ممالک نے 21 فیصد اسلحہ خریدا۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک نے 17 فیصد جنوبی اور شمالی امریکہ کے ممالک نے 12 فیصد اسلحہ خریدا۔ یورپین ممالک نے 21 فیصد اسلحہ خریدا۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک نے 17 فیصد جنوبی اور شمالی امریکہ کے ممالک نے 12 فیصد اسلحہ خریدا۔ چین دو سال قبل تک بہت اسلحہ خریدتا تھا مگر اب وہ بیشتر اسلحہ خود بنانے لگا ہے۔

2005ء میں چین نے 3.5 ارب ڈالر کا اسلحہ خریدا تھا مگر اب 2009ء تک اس کی دفاعی درآمدات 0.6 ارب ڈالر تک ہو گئی ہے۔ ان پانچ سالوں میں بھارت کی دفاعی درآمدات میں 21 فیصد اضافہ ہوا۔ بھارت اسلحہ کے لحاظ سے سے کفالت کی منزل سے ابھی کافی دور ہے۔ مارچ 2015ء میں ایسٹرا میزائل داغنے کا کامیاب تجربہ کیا جو بھارتی فضائیہ کے روسی ساختہ جنگی طیارے سخوئی 30 سے آزمائشی طور پر داغا گیا۔ بھارت نے گزشتہ تین سالوں میں امریکہ سے 3 ارب ڈالر کا اسلحہ خریدا جبکہ اسرائیل سے کچھ ہی عرصہ میں 13 ارب ڈالر کا اسلحہ خرید رہا ہے جس میں جاسوسی کے لئے ڈرونز، طیارہ شکن میزائل، میزائل ڈیفنس سسٹم اور اینٹی ٹینک گائیڈڈ میزائل قابل ذکر ہیں۔ بھارت کا جھکاؤ اب امریکہ کی طرف ہو گیا ہے اس لئے اب اس نے روس سے خریداری بہت کم کر دی ہے۔ بھارت نے روس کی طرف سے MI-28 نائیٹ ہاک گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے امریکہ AH-64 اپاچی گن شپ ہیلی کاپٹروں کی خریداری کا فیصلہ کیا ہے۔ روسی MI-26 ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹروں کی جگہ امریکہ CH-47 چینوک کی خریداری کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح روسی ٹرانسپورٹ طیاروں کو مسترد کرتے ہوئے C.130J ہرکولیس اور C.17 گلوب ماسٹر ٹرانسپورٹ طیارے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت اپنی فضائیہ کے لئے 126 عدد جدید ملٹی رول طیارے حاصل کر رہا ہے۔ اسی طرح روسی مگ 35 جہازوں کی پیشکش کو مسترد کر کے فرانس سے رافیل ملٹی رول طیارے خرید رہا ہے۔

بھارت کی سرحدیں پاکستان، برما، نیپال، بنگلہ دیش کے ساتھ ملتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اتنا اسلحہ کیوں اور کس کے خلاف خرید رہا ہے۔ بھارت کی سرحد چین کے ساتھ زیادہ اروناچل پردیش صوبے کے ساتھ لگتی ہے جو بہت پہاڑی اور دشوار گزار راستوں پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کی زمینی ساخت ٹینکوں کے استعمال کے لئے غیر مناسب ہے۔ لہٰذا چین کے ساتھ مستقبل میں کسی بھی تصادم کی صورت میں اس علاقے میں ٹینکوں کا کردار بہت محدود ہوگا۔ بھارت اینٹی ٹینک گائیڈڈ میزائل کا ایک بڑا ذخیرہ جو جمع کر رہا ہے وہ چین کے خلاف استعمال نہیں ہوگا۔ برما اور نیپال کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں جس کا بھارت خطرہ محسوس کرے۔ بنگلہ دیش بھارت نے خود پاکستان سے الگ کرایا۔ بنگلہ دیشی حکومت در پردہ بھارت کے تابع فیصلے کرتی ہے۔ ویسے بھی بنگلہ دیش کے پاس کل 600 ٹینک ہیں۔ یہ گائیڈڈ میزائل اس کے خلاف بھی استعمال نہیں ہو سکتے۔ پھر صرف پاکستان ہی بچتا ہے جس سے بھارت خوفزدہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت اسرائیل سے خریدے ہوئے اسپائیک میزائل پاکستان کے خلاف ہی

استعمال کر سکتا ہے۔ بھارت پاکستان کی آرمڈ فورسز کی صلاحیتوں سے سخت خوفزدہ ہے۔ پاکستان سے کسی بھی جنگ سے نمٹنے کے لئے ایٹمی ٹیکنیک میزائلوں پر انحصار کر رہا ہے۔ زمینی حقائق گواہ ہیں کہ پاکستانی آرمڈ صلاحیتیں بھارت کے مقابلے میں کہیں زیادہ جدید اور مؤثر ہیں۔ پاکستان کے الخالد اور الضرار T.80 UD، اور T.85-III قسم کے مین بیٹل ٹینک کا شمار دنیا کے بہترین ٹینکوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان نے اس شعبہ میں بھارت پر برتری رکھی ہوئی ہے۔ کسی بھی جنگ کی صورت میں پاکستانی مین بیٹل ٹینک بھارتی مین بیٹل ٹینکوں کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بھارتی بری فوج کے پاس T.72 ارجن ٹینک، T.55، PT76 پاکستانی ٹینکوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بھارت کا واحد ٹینک روسی T-905 ہے جو صرف 600 ٹینک ہیں اور بھارت ان 600 ٹینکوں کے ساتھ پاکستانی آرمڈ فورسز کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

2008ء میں بھارت پاکستان کے ساتھ جنگ کے حوالے سے بھارتی وزیر اعظم نے بھارتی فورسز کے سربراہان کی میٹنگ میں بری فوج کے سربراہ جنرل دیپک کپور نے اعتراف کیا تھا کہ بھارتی ٹینک اپنی کمتر صلاحیتوں اور کمزوریوں کے باعث پاکستانی ٹینکوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ ایسی صورت میں اگر پاکستان کے ساتھ جنگ ہوئی تو پاکستانی آرمڈ فورسز بھارتی فورسز کو روند ڈالیں گی۔ اس طرح بھارت یہ سارا اسلحہ کا ڈھیر صرف پاکستان کے خلاف جمع کر رہا ہے۔ دوسرے کسی بھی ملک کے خلاف یہ استعمال نہیں ہو گا۔

رعد میزائل اور شاہین تھری کا کامیاب تجربہ

پاکستان نے سب سے پہلا جو میزائل غیر ملکی ٹیکنیک کو سامنے رکھتے ہوئے تیار کیا اس کا نام ایک مسلمان فاتح سلطان شہاب الدین غوری کے نام پر ''غوری'' رکھا گیا اور دوسرے کا نام ''ابدالی'' رکھا جو احمد شاہ ابدالی کے نام پر رکھا گیا۔ یہ سلسلہ حتف 8 تک پہنچ چکا ہے۔ پاکستان نے پہلا کروز میزائل جو فائر کیا اس کی رفتار 500 کلومیٹر ریکارڈ کی تھی۔ یہ ٹرانسپورٹ لانچر سے زمینی بنیادوں پر لانچ کیا گیا تھا۔ دو سال کے بعد ایک توسیع شدہ میزائل کا تجربہ کیا گیا اس کی رفتار 700 کلو میٹر تھی۔ اب 22 مارچ 2015ء کو مزید دو تجربات کئے گئے اس کا نام رعد میزائل رکھا گیا۔ اس کو حتف 8 بھی کہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک کروز میزائل کا تجربہ 6 جون 2012ء کو کیا گیا تھا جس کا نام ظہیر الدین بابر کے نام سے ''بابر میزائل'' حتف 7 کہا گیا۔ یہ میزائل زمین سے زمین تک مار کرنے والا ہے۔ اس کی ٹیکنیک یہ رکھی گئی ہے کہ ریڈار میں نہیں آتا۔ یہ میزائل سات سو کلومیٹر دور تک درست نشانے پر گرے گا۔ یہ اسی فاصلے تک ایٹمی ہتھیار بھی لے جا سکتا ہے۔ اس سال 22 مارچ کو حتف 8 میزائل کا تجربہ کیا گیا۔ رعد قرآن پاک کی سورۃ مبارکہ پر رکھا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تلوار کا نام بھی رعد تھا۔

رعد میزائل پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مکمل پاکستانی پراڈکٹ ہے اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ سمندر پر ''اسٹریٹجک سٹینڈ آف استعداد'' رکھتا ہے۔ یہ حتف 8 کروز میزائل ہے جس میں روایتی ہتھیاروں کے علاوہ ایٹمی ہتھیار لے جانے کی صلاحیت بھی ہے۔ یہ بھی ریڈار میں نہیں آتا اور دشمن کے ہر قسم کے خبری آلات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ اپنے ہدف کو 350 کلومیٹر کی دوری سے نشانہ بنا سکتا ہے۔ یہ سمندر میں بھی ہر قسم کے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ شاہین تھری کا 9 مارچ 2015ء کو تجربہ کیا گیا۔ یہ 2750 کلومیٹر تک مار

کرنے والا میزائل ہے۔ شاہین تھری بھی ریڈار میں نہیں آئے گا۔ البتہ اس میں اضافی خصوصیت یہ ہے کہ راستے میں کسی رکاوٹ کے آنے کی صورت میں یہ راستہ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بھارت 32 لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ملک ہے۔ شاہین تھری میں صلاحیت ہے کہ یہ بھارت کے ہر شہر کو تباہ کر سکتا ہے۔ شاہین تھری میں ایک اور صلاحیت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ یہ محفوظ جوہری تنصیبات کو ہدف بنا سکتا ہے اور اسے کوئی میزائل راستے میں تباہ نہیں کر سکتا چونکہ اس میں خطرے کی صورت میں رخ بدل کر اپنے ہدف تک پہنچنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بلاشبہ یہ پاکستان کے لئے تاریخی کامیابی ہے۔ یہ میزائل اس وقت دنیا میں صرف چند ممالک کے پاس ہے۔

میزائل بردار ڈرون طیارہ

دنیا میں سب سے زیادہ جوہری مواد روس اور امریکہ کے پاس ہے یہ دونوں پانچ سے چھ ہزار ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ فرانس کے پاس 300 اور چین کے پاس 250 برطانیہ کے پاس 225 اور اسرائیل کے پاس 180 ایٹمی ہتھیار ہیں۔ بھارت کے پاس 100 اور پاکستان کے پاس 120 ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ بھارت کے اس منصوبے کو جو کولڈ سٹارٹ ڈوکٹرائن کہلاتا ہے یعنی پاکستان کے آٹھ کمزور حصوں سے گھس کر پاکستان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے، پاکستان نے ناکام بنا دیا ہے جس سے بھارت کی پریشانی بڑھ گئی ہے۔ پاکستان روایتی ہتھیاروں کے معاملے میں بھارت سے آگے ہے۔

لیزر گائیڈڈ میزائل براق

13 مارچ 2015ء کو پاکستان نے مقامی طور پر تیار کردہ ڈرون براق اور لیزر گائیڈڈ میزائل کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ مارچ کا مہینہ پاکستان کے لئے خوشخبریوں کا مہینہ ثابت ہوا ہے جس میں رعد میزائل شاہین تھری اور میزائل بردار ڈرون طیارہ براق نے لیزر گائیڈڈ میزائل سے جہلم ٹیلہ رینج پر تاریخ رقم کی۔

مکمل طور پر ملک میں تیار کردہ بمبار ڈرون طیارے براق کی کامیاب اڑان نے ملکی دفاع کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آرمی چیف نے کمانڈ اینڈ کنٹرول روم سے پہلے اس کے آپریشن کا جائزہ لیا۔ پھر بھارت کے اس شاندار نمونے پر پوری قوم کو مبارکباد دی۔ پاکستان اس وقت امریکہ، اسرائیل اور روس کے بعد چوتھا ملک بن گیا جو ڈرون ٹیکنالوجی خود بناتا ہے اور جو ڈرون طیارے کی مدد سے زمین پر موجود اپنے ہدف پر سو فیصد نشانہ لگا سکتا ہے۔

2200 فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے والا براق اپنے ہدف پر عقاب کی نظر رکھتا ہے۔ جب ایک بار ٹارگٹ ڈرون کے گھیرے میں آ جائے تو اس کا بچنا ناممکن ہے۔ اشارے کے منتظر براق سے برق رفتاری سے فائر ہونے والا لیزر گائیڈڈ میزائل اپنے ہدف کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ براق سے فائر ہونے والے براق میزائل کے لئے ہدف کے ساکت یا حرکت میں ہونے کی کوئی قید نہیں۔ وہ ہدف کو منٹوں میں تباہ کر دے گا۔ کہاں کل تک پاکستان امریکہ کی منتیں کرتا تھا کہ وہ پاکستان کو ڈرون طیارے دے لیکن امریکہ اس پر راضی نہ ہوا مگر پاکستانی انجینئرز نے شاندار کارنامہ دکھا دیا۔ اس کارنامے نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ جہلم تلہ کے مقام پر ڈیڑھ درجن سے زیادہ براق طیاروں نے گائیڈڈ میزائل سے اپنے اپنے اہداف کو نشانہ بنانے کا مظاہرہ کیا۔ پاکستانی براق کی مدد سے دشمن کے ٹینک اور توپ خانے کے اہداف کو باآسانی نشانہ بنایا جا سکے گا۔

میں نے غیرت کا تقاضا پورا کیا ہے، اب آپ قانون کا تقاضا پورا کریں۔

غیرت سے پھانسی تک

☆ فدا بلوچ

وقت اور حالات کے ہاتھوں انسان مجبور ہوتا ہے۔ مجھے حالات نے اتنا مجبور کر دیا کہ میں جیل خانوں کی پولیس میں وارڈر کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ مگر پتھروں کی ان اونچی اونچی دیواروں میں گھری ہوئی دنیا کے اُن باسیوں پر جو آہنی سلاخوں میں محبوس ہیں، ڈیوٹی دینے لگا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ تم نہیں، مجبور تو یہ لوگ ہیں جن سے حالات نے آزادی کی نعمت بھی چھین لی ہے اور ان کے نام شریف انسانوں کی فہرست سے خارج ہو چکے ہیں۔ میری ایک اور مجبوری یہ ہے کہ میں وردی میں لپٹا ہوا صرف وارڈر نہیں، ایک حساس قلمکار بھی ہوں۔ بات جو دل پر اثر کرتی ہے سپرد قلم کر دیتا ہوں۔ سزائے موت کے قیدی فضل کی کہانی بھی معاشرے کی اُن ہی وارداتوں میں سے ہے جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

یہ 1970ء کی ایک رات کا ذکر ہے۔ وہ رات تاریک تھی۔ میں پھانسی کی کوٹھڑیوں پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ موت کے مسافر سرکاری کمبلوں میں لپٹے ہوئے سو رہے تھے اور نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھ رہے تھے۔ اُن کی

کوٹھڑیوں میں ہلکی ہلکی روشنی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ سب موت کی دہلیز پر بیٹھے ہیں۔ باری باری بلائے جائیں گے اور ان کی لاشیں ایک دوسرے کے پیچھے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوتی چلی جائیں گی۔ پھر ان کی کہانیاں پیچھے رہ جائیں گی جنہیں لوگ کچھ عرصہ ایک دوسرے کو سنائیں گے اور پھر آہستہ آہستہ یہ کہانیاں بھی وقت کی اڑتی ریت کے نیچے دفن ہو جائیں گی۔ میں انہیں دیکھتا ہوا گشت کر رہا تھا۔ صرف ایک قیدی تھا جو جاگ رہا تھا۔ زرد پیلی بتی کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے تو میں رُک گیا۔ سزائے موت کے کسی قیدی کی آنکھوں میں آنسو کوئی نئی یا انوکھی بات تو نہیں تھی۔ پھر بھی میں اس کی کوٹھڑی کے آگے رُک گیا اور سلاخوں کا سہارا لے کر اس سے پوچھا:

"کیوں دوست؟ روتے کیوں ہو؟ اللہ کا نام لو۔ اس کے دربار میں بخشش کی کمی نہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"اب نام پوچھ کے کیا کرو گے؟" اس نے کہا۔ "اس کوٹھڑی میں آ کر میرا نام مٹ چکا ہے اور تمہارے اس سوال کا جواب کیا دوں کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ اب تو یہی میرا ٹھکانہ ہے۔ چند روز کا مہمان ہوں پھر تم جانتے ہو کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ بس میں وہیں کا رہنے والا ہوں جہاں جا رہا ہوں۔"

"کوئی جسمانی تکلیف ہو تو بتا دو"۔ میں نے کہا۔ "میں ڈاکٹر کو بلا سکتا ہوں"۔

مگر تکلیف اُس کے دل میں تھی جس کا علاج موت کے سوا کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ مجھے صرف وارڈر سمجھ رہا تھا اور میری باتوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ڈیوٹی کا وقت پورا کرنے کے لئے رسمی طور پر اُس کے ساتھ [illegible] لگا [illegible] نے دلچسپی اور ہمدردی سے باتیں کیں تو اس کی رائے بدل گئی۔ اس نے کہا:

"سنو دوست! اگر تمہیں میرے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے تو میری ایک تمنا پوری کر دو۔ میرا ایک بچہ فیض الاسلام سکول میں پڑھتا ہے۔ اسے ملنے کو ترس رہا ہوں۔ وہ اکیلا نہیں آ سکتا۔ کل اسے لے آؤ۔ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں"۔

یہ یتیم خانے کا سکول تھا جس میں صرف یتیم بچے پڑھتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ اس کا بچہ یتیم خانے میں کیوں ہے۔ وہ پاک فوج میں حوالدار تھا۔ ستمبر 1965ء کی جنگ میں لڑا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل تمہارے بچے کو یہاں لے آؤں گا۔ جیل خانے کی بھیانک رات نے ڈری سہمی ہوئی سحر کو جنم دیا۔ میری ڈیوٹی ختم ہوئی۔ میں نے باہر جا کر وردی بدلی اور یتیم خانے کے سکول چلا گیا۔ مجھے فضل کا بچہ تو مل گیا لیکن منتظم نے بچے کو میرے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ مجھے جانتے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ ان کے قواعد وضوابط کے مطابق کوئی یتیم بچہ کسی اجنبی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں واپس آیا۔ فضل سے درخواست لکھوائی کہ میرے بچے کو ملاقات کے لئے بھیجا جائے۔ میں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے منظوری لکھوائی اور درخواست پر مہر لگوا کر پھر یتیم خانے چلا گیا۔ منتظم نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔

وہ منظر بڑا ہی دردناک تھا جب آٹھ نو سال کا بچہ سلاخوں کے ساتھ کھڑا اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان سلاخیں حائل تھیں۔ بیٹا اپنے بہادر اور غیرت مند باپ کے سینے سے لگ جانے کو بے تاب تھا اور باپ اسے سینے سے لگا لینے کو بے قرار مگر ان کے درمیان جیل کا قانون اور سلاخیں کھڑی تھیں۔ بچے نے ہاتھ سلاخوں کے اندر کر دیئے۔ باپ ان چھوٹے

ہاتھوں کو پکڑ کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ میں یہ دردناک منظر برداشت نہ کر سکا اور باپ بیٹے کو تنہا چھوڑ کر پرے چلا گیا۔ اچانک مجھے گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ میں نے گھوم کے دیکھا آٹھ نو سال کا بچہ سلاخوں سے لگا تڑپ رہا تھا اور اس کی ننھی سی گردن اپنے باپ کے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ باپ نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر اپنے اس بچے کا گلا دبا لیا تھا جس سے ملنے کے لئے وہ بے تاب اور بے قرار تھا۔ میں دوڑا۔ اُدھر سے ڈیوٹی وارڈر دوڑا آیا۔ ہیڈ وارڈر بھی گشت پر آیا ہوا تھا وہ بھی پہنچ گیا۔

فضل درندہ بن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، اس کے دانت پس رہے تھے۔ بچے کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں، منہ کھل گیا تھا اور زبان نکل آئی تھی۔ ہم نے بڑی ہی مشکل سے باپ کی انگلیاں بچے کی گردن سے اکھاڑیں۔ بچہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ فضل پر قہر اور غضب طاری تھا۔ ہم نے بچے کو سنبھال لیا۔ اسے ہوش میں لے آئے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ کس قدر خوفزدہ ہوگا۔ اسے پرے لے گئے۔ فضل سے ہم نے پوچھا کہ اس نے بچے کو کس ارادے سے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بتایا کہ بچے نے یتیم خانے کے متعلق اسے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو سن کر اس نے بہتر یہی سمجھا کہ بچہ زندہ نہ رہے۔

فضل خود تو پھانسی پانے والا تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنے عزیز بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ اس نے بتایا کہ بچہ مجھے کہہ رہا تھا۔ ''ابو! آپ نے جہاں مجھے داخل کرایا ہے وہاں استاد بہت مارتے ہیں۔ کھانا بہت جلدی پکا دیتے ہیں اور بچوں سے کہتے ہیں کہ کھانا ابھی کھا لو نہیں تو اپنے ساتھ رکھ لو پھر نہیں ملے گا۔ ہم بھوکے رہتے ہیں ابو! وہ ہمیں لوگوں کے گھروں میں کھانا کھلانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ ابو! مجھے وہاں سے نکلوا لو!'' مگر باپ مجبور تھا۔ چند دن کا مہمان تھا۔ وہ پاک فوج کا حوالدار غیرت مند باپ تھا، اسی غیرت نے اس کے ہاتھوں اپنے بچے کی ماں کو قتل کرایا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بچہ بھکاریوں کی سی زندگی گزارے۔ لہٰذا اس نے بچے کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ یہ تو بچے کی زندگی باقی تھی ورنہ وہ تو ختم ہو چکا تھا۔

''میں اس قوم کے لئے لڑا ہوں''۔ فضل نے کہا۔ ''اس ملک پر جان نثار کرنے کا جذبہ لے کر میں میدان جنگ میں گیا تھا مگر قوم اتنی بے حس ہے کہ میرا بچہ جانوروں کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ میری دو بچیاں معلوم نہیں کس کس کے دروازے پر دھکے کھا رہی ہیں۔ ان بچے کے مستقبل کو بچانے کے لئے میں نے اسے اس سکول میں داخل کرایا تھا مگر میرے بچے کا مستقبل مجھے بے وقار اور تاریک نظر آتا ہے۔ اس معاشرے میں ایک بھی ایسا فرد نہیں جو میرے بچے کو گلے لگا لے تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔ قتل کا مجرم میں تھا، میرا بچہ نہیں تھا۔ سزا مجھے ملنی چاہئے، میرے بچوں کو نہیں مگر ہمارے ملک کا قانون بے حس ہے''۔

ہیڈ وارڈر نے خاکی وردی کا احترام کرتے ہوئے فضل کو یقین دلایا کہ تمہارا بچہ اب یتیم خانے میں نہیں جائے گا۔ یہ اب میرا بچہ ہے اور اسے میں پالوں گا اور اس میں وہی غیرت پیدا کروں گا جو تم میں ہے۔ فضل مطمئن ہو گیا۔ رات کو جب میں پھانسی کی کوٹھڑیوں پر ڈیوٹی دینے گیا تو فضل کی کوٹھڑی کے سامنے جا رکا۔ مجھے اب اس کے ساتھ سگے بھائیوں جیسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ فضل کوئی جرائم پیشہ انسان نہیں تھا۔ اس نے قتل کا ارتکاب ڈکیتی یا رہزنی کی نیت سے نہیں کیا تھا۔ اس نے یہ قتل عدالت میں جج کے سامنے کیا تھا اور ریوالور جج کی میز پر رکھ کر کہا تھا۔ ''یہ لیجئے حضور! میں نے غیرت کا

تقاضا پورا کر دیا ہے، آپ قانون کا تقاضہ پورا کریں"۔ جس واردات کا عینی شاہد بھری عدالت اور ایک جج ہو اس کی سزا سے بچنے کی بھلا کیا صورت ہو سکتی ہے۔ فضل نے اپنے خاندان کی تاریخ اور قتل کی جو تفصیل سنائی وہ مختصر یوں ہے:

اس کے آباؤ اجداد بلوچستان کے رہنے والے تھے۔ انگریزوں نے وہاں مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا۔ فضل کا دادا اپنی ماں کو لے کر راولپنڈی آ گیا۔ اُس وقت وہ جوان تھا۔ راولپنڈی کے ایک مضافاتی گاؤں میں آباد ہوا اور وہیں شادی کر لی۔ اس سے پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ پھر ان کی شادیاں ہوئیں اور بلوچستان کا خون، زبان اور تہذیب و تمدن پوٹھوہار میں مکمل مل گیا۔ فضل پوٹھوہار میں پیدا ہوا۔ جوان ہوا تو فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ جب لانس نائک بنا تو اس کی شادی ہو گئی۔ بیوی ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ پہلے ایک لڑکی پیدا ہوئی پھر یہ لڑکا جسے فضل نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے بعد ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔ اس بچی کی پیدائش کے وقت فضل لمبی چھٹی لے کر گاؤں گیا لیکن چند ہی دنوں بعد اسے اپنی یونٹ کی طرف سے تار ملا کہ فوراً واپس آ جاؤ۔ وہ واپس چلا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ بھارت نے رن کچھ میں حملہ کر دیا ہے۔ چونکہ یہ ایک کھلی جنگ تھی اس لئے فوج کی چھٹی بند کر دی گئی تھی اور جو لوگ چھٹی گئے ہوئے تھے انہیں فوراً یونٹوں میں بلا لیا گیا تھا۔ فضل کی یونٹ کو رن کچھ بھیج دیا گیا۔

فضل رن کچھ میں لڑا۔ وہاں فائر بندی ہو گئی۔ ستمبر 1965ء کی جنگ شروع ہونے سے پہلے اس نے دس دن کی چھٹی لی اور بیوی کے گاؤں گیا۔ وہ رن کچھ جانے سے پہلے بیوی کی مرضی کے مطابق اسے چکوال چھوڑ گیا تھا جہاں اس کی بیوی کو اس کے ماموں کے پاس رہنا تھا۔ [illegible] ہے کہ وہ پڑھے لکھے خاندان کی عورت تھی جس میں تعلیم اور پیسے کی وجہ سے آزادی تھی۔ فضل نے بیوی کو جا کر دیکھا کہ وہ اپنے ماموں کے پاس رہنے کی بجائے الگ مکان کرائے پر لے کر رہ رہی تھی۔ فضل کے پوچھنے پر اُس نے یہ وجہ بتائی کہ اُس کے اور ماموں کے بچے آپس میں لڑتے تھے اس لئے الگ رہنا بہتر سمجھا۔ فضل کو کچھ شک ہوا۔ یہ وجہ اسے مطمئن نہ کر سکی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیوی اس کے ساتھ چکنی چپڑی باتیں کر رہی ہے۔ تاہم وہ اس کی باتوں میں آ گیا مگر ایک وہم سا اُس کے دل میں بیٹھ گیا۔ وہ بیوی کو اپنے گاؤں لے گیا اور چھٹی ختم ہوئی تو وہ بیوی کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ آئندہ کہیں نہیں جانا۔

رن کچھ سے فوجیں واپس آ چکی تھیں۔ بظاہر امن قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے جن جوانوں کی چھٹی باقی تھی انہیں چھٹی بھیج دیا گیا۔ ان میں فضل بھی تھا۔ وہ گاؤں گیا تو بیوی اپنے بچوں سمیت لاپتہ تھی۔ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ بیوی چکوال چلی گئی ہے۔ اس نے فضل سے اجازت نہیں لی تھی۔ فضل چکوال پہنچا اور ماموں کے گھر گیا۔ اسے بچے تو مل گئے، بیوی نہ ملی۔ ماموں نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی، بچوں کو یہاں چھوڑ کر گاؤں چلی گئی ہے۔ اسے گاؤں گئے دس دن ہو گئے تھے۔ فضل غصے سے پاگل ہونے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ گھر سے اس کی اپنی غیر حاضری اور بیوی کی ذہنی آزادی رنگ لا رہی ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا کہ شاید کوئی خاص وجہ ہو گی لیکن وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ بیوی تو گاؤں میں بھی نہیں تھی۔ وہ بچوں کو ساتھ لے کے گاؤں چلا گیا۔ گاؤں والوں نے پوچھا کہ بیوی کہاں ہے تو اسے بہت شرم آئی۔ اس نے جھوٹ بولا کہ کچھ جھگڑا ہو گیا ہے اس لئے اسے وہیں چھوڑ آیا ہوں۔

فضل نے بیوی کا کھوج لگانا شروع کیا۔ ہمارے ہاں کوئی حرکت زمین کے اندر ہو لوگ اس کا بھی کھوج لگا

لیتے ہیں۔ کسی عورت کا آوارہ ہو جانا تو چھپ ہی نہیں سکتا۔ فضل کو پتہ چل گیا کہ ایک بوڑھی عورت جس کی اپنی جوانی غیر مردوں کے ساتھ عیش کرتے گزری ہے، فضل کی بیوی کو ورغلاتی رہی ہے۔ یہ اس کا پیشہ تھا۔ اس نے اس کی بیوی کے تعلقات محکمہ جنگلات کے ایک ہیڈ کلرک سے کرا دیئے تھے۔ اس آدمی کا کوئی سراغ نہ ملا اور نہ اُس بوڑھی کٹنی کا۔ فضل ان دونوں کی سراغ رسانی میں ہلکان ہو رہا تھا کہ اسے اپنی یونٹ کی طرف سے تار ملا کہ فوراً یونٹ میں پہنچو۔ اُس وقت تک فضل حوالدار ہو چکا تھا۔ اس کے اپنے ماں باپ تو زندہ نہیں تھے۔ بچوں کو کس کے پاس چھوڑ کر جاتا۔ اب وہ انہیں ماموں کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ راولپنڈی میں ایک کلرک صوبیدار اُس کا دوست تھا۔ اس نے بچوں کا مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا۔ بیوی کے متعلق اس نے بتایا کہ لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی ہے۔ اس صوبیدار نے اُس کے بچے سنبھال لئے۔ ستمبر 1965ء کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ فضل اپنے بچے اپنے صوبیدار دوست کے گھر چھوڑ کر بوجھل دل سے یونٹ میں چلا گیا۔ دودھ پیتی بچی کو ماں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

اس کی یونٹ چھمب جوڑیاں کے محاذ پر لڑ رہی تھی۔ فضل سترہ دن لڑا۔ پھر فائر بندی ہو گئی۔ وہ بہت پریشان تھا لیکن فوجوں کی واپسی تک اسے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اسے چھٹی پانچ چھ مہینے بعد ملی۔ اس کے بچے ٹھیک تھے۔ اس کے دوست نے بچوں کی خوب دیکھ بھال کی تھی۔ اُس کے دوست صوبیدار نے مل ملا کر اس کی تبدیلی راولپنڈی کرا دی۔ اُسے ایک گمنام خط ملا جس میں لکھا تھا کہ تمہاری بیوی مر گئی ہے اور جو بچی اس کے پاس تھی اسے یتیم خانے کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اسی مضمون کے خط اس کی بیوی کے ماموں اور چچا وغیرہ کو بھی ملے۔ فضل نے یقین کر لیا کہ اس کی بیوی واقعی فوت ہو گئی ہے۔ اصل مسئلہ بچوں کا تھا۔ فضل نے گاؤں کے ایک شریف اور غریب سے گھرانے میں دوسری شادی کر لی۔ یہ لڑکی نہایت مخلص اور نیک ثابت ہوئی۔ فضل کو سب سے چھوٹی بچی کا سراغ نہ ملا۔ وقت گزرنے لگا اور اتنا عرصہ گزر گیا کہ 1970ء کا سال بھی گزر گیا۔ فضل نے پنشن کی درخواست دے دی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ کچھ رقم تو جمع ہے۔ اس کے علاوہ آدمی پنشن اکٹھی لے کر کوئی کاروبار کرے گا۔ اس کی دوسری بیوی ہر لحاظ سے اچھی ثابت ہو رہی تھی۔

فضل کی پنشن منظور ہو گئی لیکن کاغذی کارروائی میں بہت دیر لگ رہی تھی۔ اس دوران اُس نے کوئی ملازمت کر لینا بہتر سمجھا۔ کوئی اور ملازمت تو نہ ملی اُسے ایک ٹیکسی کی ڈرائیوری مل گئی۔ ایک روز وہ اسلام آباد کی طرف سے راولپنڈی آ رہا تھا۔ دو برقعہ پوش عورتوں نے اسے رکنے کے لئے اشارہ کیا۔ دونوں کے نقاب اوپر تھے۔ فضل نے گاڑی روکی۔ اچانک ایک عورت نے نقاب نیچے کر لیا۔ فضل نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھ لی تھی۔ یہ چہرہ اس کی پہلی بیوی کا تھا۔ وہ ٹیکسی سے نکلا تو اس عورت نے اسے کہا۔ ''گاڑی نہیں چاہئے۔ تم جا سکتے ہو''۔ فضل نے آواز پہچان لی۔ یہ زنوجی تھا۔ اس نے جھپٹا مار کر اس عورت کا نقاب اٹھا دیا۔ وہ واقعی اس کی پہلی بیوی تھی۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور ٹیکسی میں پھینکنے لگا۔ اس کی بیوی نے شور مچا دیا۔ ہجوم جمع ہو گیا۔ فضل نے لوگوں سے کہا:

''کوئی آدمی میرے قریب آنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ میری بیوی ہے''۔

فضل اسے گھر لے گیا۔ دونوں بچوں نے اتنے عرصے بعد اپنی ماں کو دیکھا تو اس سے لپٹ گئے۔ فضل نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اسے قتل کر کے لاش کہیں پھینک دے۔ یہ تو گمنام خط لکھنے والے نے بیوی کے لواحقین کو

یقین دلا دیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ مگر فضل نے یہ سوچ کر اسے بخش دیا کہ وہ آخر اس کے بچوں کی ماں ہے۔ اُس نے دوسری بیوی سے پوچھا کہ وہ اجازت دے تو پہلی بیوی کو گھر میں رکھ لے۔ اُس نے اجازت دے دی۔ پہلی بیوی کو فضل نے کہا کہ اس نے اسے بخش دیا ہے۔ اب وہ قسم کھائے کہ وہ گھر میں صحیح معنوں میں وفادار بیوی اور بچوں کی نیک ماں بن کر رہے گی۔ اُس نے وعدہ کیا اور کہا کہ وہ ایک اُستانی کے گھر میں نوکر ہے۔ بچی وہیں ہے۔ وہ بچی کو لے کے ابھی آ جائے گی۔ فضل نے اس پر اعتماد کیا۔ وہ چلی گئی مگر واپس نہ آئی۔ فضل بہت پچھتایا کہ وہ اسے ٹیکسی پر لے جاتا مگر اس نے بھروسہ کیا۔

پندرہ دنوں بعد فضل کو سول جج کی عدالت سے سمن ملا۔ وہ بہت حیران ہوا کہ اس سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے۔ وہ عدالت کی مقرر کی ہوئی تاریخ پر عدالت میں گیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی پہلی بیوی نے اس کے خلاف تنسیخ نکاح کا مقدمہ دائر کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ عرصہ پانچ سال سے خاوند نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ بدقماش آدمی ہے۔ ایک لڑکی کے ساتھ اس کی آشنائی تھی۔ اب اس نے اُس کے ساتھ میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے۔ مجھے نہ خرچ دیتا ہے نہ طلاق۔ مجھے خاوند سے طلاق دلائی جائے اور جتنے سال بچی میرے پاس رہی ہے اس کا خرچ دلایا جائے۔ فضل کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ایک وکیل سے بات کی لیکن بات اس رنگ میں کی کہ وہ اس عورت کو اب بھی بسانے کو تیار ہے۔ اگر وہ راہِ راست پر آ جائے۔ اس نے وکیل کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ وکیل نے اسے بتایا کہ جو عورت بدی کی آخری حد تک پہنچ گئی ہو اسے واپس لانا ناممکن ہوتا ہے۔ اب وہ عدالت میں پیش ہو کر تمہارے خلاف بیان دے گی اور تمہیں یہ الزامات غلط ثابت کرنے ہوں گے۔

فضل یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا کہ اس کی بیوی جو خود بدکار اور ازدواجی زندگی کی مفرور ہے، مجھے بدقماش کہے گی اور بھری عدالت یہ بات سنے گی۔ وہ اگلی پیشی پر نہ گیا۔ وہ عدالت میں اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتا تھا۔ دوسری پیشی کا سمن آیا تو بھی نہ گیا۔ تیسرا سمن وارنٹ گرفتاری کے ساتھ آیا۔ وہ عدالت میں گیا اور اپنا لائسنس والا ریوالور بھی جیب میں ڈال کر لے گیا۔ اس کی بیوی عدالت میں آئی۔ فضل نے موقع دیکھ کر اسے آہستہ سے کہا کہ مجھے اپنا خاوند نہ سمجھو۔ اپنے بچوں کے لئے مجھے ان کا باپ سمجھ کر میرے ساتھ چلی چلو۔ اس عورت نے اسے دھتکار دیا۔ فضل چپ ہو گیا۔ وہ مقدمہ نہیں لڑنا چاہتا تھا اس لئے اس کے ساتھ کوئی وکیل نہیں تھا۔

کیس پیش ہوا۔ اس کی بیوی نے اُس کے خلاف جھوٹا اور توہین آمیز بیان دیا۔ فضل نے آگے جا کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور کہا۔ "اب میرا جوابی بیان سن لیجئے"۔ پیشتر اس کے کہ کوئی اسے پکڑتا، عدالت کا کمرہ مسلسل دھماکوں سے گونجنے لگا۔ فضل نے اپنی پہلی بیوی کے سر میں تین چار گولیاں چلا دیں۔ وہ گری تو فضل نے ریوالور سول جج کی میز پر رکھ کر کہا۔ "میں نے غیرت کا تقاضہ پورا کیا ہے اب آپ قانون کا تقاضا پورا کریں"۔

قانون کا تقاضہ پورا ہو گیا۔ فضل کو سزائے موت ہو گئی۔ اس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے بچے کو یتیم خانے میں بھجوا دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کی دوسری بیوی اسے سوتیلا بچہ سمجھ کر اس کے ساتھ بدسلوکی نہ کرنے لگے۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ جوان عورت ہے، دوسری شادی کر لے گی۔ پھر بچے کا باپ بھی سوتیلا اور ماں بھی سوتیلی ہو گی۔ بچی کے متعلق اسے کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ اس کا بچہ ہمارے ہیڈ وارڈر کے پاس ہے۔

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازما لکھیں

دستِ شفاء

بول بستری کا شافی علاج

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوی ایشن
شعبہ طب و نفسیات

سب سے پہلے میں اپنے معزز قارئین اور مریضوں کی خدمت میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(1) بات شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف، مقام یا کیس کا حوالہ نمبر دیا کریں۔

(2) جو بات کرنی ہو وہ لکھ لیا کریں اور بار بار ڈسٹرب نہ کیا کریں۔

(3) میرا کام مریض کو اچھی دوا لکھ کر دینا ہے اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہو تو جناب عارف صاحب سے رابطہ کریں کیونکہ اگر ایک ہی بات کے لئے یا غیر ضروری باتوں کے لئے مجھے بار بار ڈسٹرب کریں گے تو میں دوسرے مریضوں کی طرف دھیان نہیں دے سکوں گا اور اس طرح ان کا بھی نقصان ہوگا۔

(4) اگر کسی مریض نے پہلے دوائی لی ہوئی ہے اور کوئی ضروری بات ہے تو عارف صاحب سے رابطہ کریں۔ صبح 11 بجے سے دوپہر 2 بجے تک رابطہ کر سکتے ہیں اور اگر نیا کیس ہو تو پھر رات 8 بجے سے 10 بجے میرے نمبر پر کال کر سکتے ہیں۔

(5) دوا کا طریقہ استعمال اور ہدایات تفصیل کے ساتھ لکھ کر بھیجی جاتی ہیں۔ دوا شروع کرنے سے قبل انہیں دھیان سے پڑھیں تاکہ آپ کو بیکار کالیں نہ کرنی پڑیں۔ آپ باشعور اور سمجھدار شخص ہیں ذرا غور کریں کہ آپ کی ایک مس کال یا بلاوجہ کال کتنا نقصان کرتی ہے۔ خود آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ بعض امیر لوگ شغلاً ہی

کالیں کرتے رہتے ہیں۔ اپنا کم اور دوسروں کا زیادہ نقصان کرتے ہیں۔

(6) بعض لوگ ادویات کی جائز قیمت دینے میں بھی یا دیگر تاخیری حربے استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کئی بڑی اور خوش حال شخصیات بھی شامل ہیں۔ ایسی کئی بے بنیاد وجوہات کی وجہ سے ہمارا خاصا سرمایہ پھنس گیا ہے۔ ہم جو پہلے ہی یہ شعبہ بڑی مشکلات سے چلا رہے ہیں، اب مستحق لوگوں کے ساتھ کتنا تعاون کر سکتے ہیں؟ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم مستحق لوگوں کے رعایتی علاج سے ہاتھ کھینچ لیں؟ لیکن ہم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا ہم اس نیک کام میں تعاون کرتے رہیں گے۔

(7) کئی بے ضمیر قسم کے لوگ وقت لے کر بعد میں بہانے تراشتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے نہ صرف ذہنی کوفت ہوتی ہے بلکہ مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔ کئی بار لوگ (خصوصاً بیرون شہر سے آنے والے بہت پریشان کرتے ہیں ہم نے اب مجبوراً ایسے لوگوں کا حل یہ سوچا ہے کہ کم از کم 500 روپے ایڈوانس فیس لے کر پھر ٹائم دیا جائے۔ آپ کی رائے کا ہم انتظار کریں گے۔

اب ہم اس ماہ کے کیس کی طرف آتے ہیں جو کہ بہت ہی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ کیس ایک شادی شدہ نوجوان لڑکی کا ہے جس کی عمر بمشکل تیس چوبیس سال ہے اور یہ راولپنڈی کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک روز مجھے ایک کال آئی جس میں کچھ مسائل کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے وہ بتا دیے اس کے بعد اس کی والدہ نے بات کی اور مجھے پوچھا کہ اگر کوئی بچہ یا بڑا رات کو بستر گیلا کرنے (Bed Wetting) کے مرض میں مبتلا ہو تو کیا وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایسے چند کیس بڑی کامیابی سے کیے گئے ہیں جو کہ پہلے ہی شائع کیے جا چکے ہیں۔ تاہم انہیں اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں نے اس کیس میں جو خاص بات نوٹ کی گئی وہ یہ تھی کہ مریضہ نرم مزاج اور ہر وقت تھکی تھکی رہتی تھی اور پیشاب پر کوئی کنٹرول نہیں۔ سارا سارا دن باتھ روم میں جانا پڑتا جس سے سب گھر والوں کو اور خود اسے بھی بڑی کوفت ہوتی اور کوئی واضح علامات نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں علامات اور مریضہ کے مزاج کو مدنظر رکھ کر ادویات تجویز کی گئیں۔ خدا کے فضل سے ایک ماہ میں ہی بہت اچھی رپورٹ ملی۔ صرف دو ماہ کے علاج سے مریضہ مکمل شفایاب ہو گئی۔

کئی احباب گلہ کرتے ہیں کہ میں ادویات کا فارمولا نہیں لکھتا۔ مگر چونکہ ایسے اکثر کیسوں میں وجہ اور علامات اکثر ایک جیسی ہی ہوتی ہیں لہٰذا میں عوام الناس اور معالجین کی بھلائی و رہنمائی کے لئے ادویات کا فارمولا برائے (Urine Controll) لکھ رہا ہوں جس کا دل چاہے استعمال کرے۔ ان شاء اللہ فائدہ ہوگا اور اگر کہیں فائدہ معلوم نہ ہو تو اس کیس کی وجوہات اور علامات کو دیکھ کر دوبارہ غور کریں۔ ان شاء اللہ مایوسی نہیں ہوگی۔

1. **Kali Phos-12**
2. **Ferrum Phos-12**
3. **Causticum-30**
4. **Agaricus-30**

(صبح شام ایک ایک گولی۔ 15 دن کے بعد ایک ناغہ کر دیں۔)

5. **DS-6** دوپہر
6. **DS-4** رات

نوٹ:۔ آخری دو ادویات ہماری تیار کردہ ہیں، مارکیٹ سے نہ ملیں تو ہم سے منگوا سکتے ہیں۔

(قیمت:-/200 روپے فی ڈاک خرچ بذمہ ادارہ)

ایک تہ دار کہانی

اوور کوٹ

اپنی واسکٹ کی جیب میں رنگ کو پکڑے ہوئے ویلیم کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔
ویلیم یاس بھری نظروں سے ڈولی کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

محمد نذیر ملک

ویلیم کافی دیر سے "فیشن بازار" کے شوکیس کے شیشے سے ناک رگڑ رہا تھا۔ نیلی آنکھوں والی خوبصورت سیلز گرل ڈولی سٹور کے اندر سے اسے برابر دیکھے جا رہی تھی۔ آخر وہ باہر چلی آئی اور اس نے ہیلو کہہ کر ویلیم کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟"

ویلیم نے چونک کر یوں پیچھے دیکھا جیسے کسی نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"دراصل میں یہ اوور کوٹ دیکھ رہا تھا جو مجھے بے حد پسند ہے"۔ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں بولتے ہوئے ہرے رنگ کے ایک اوور کوٹ کی جانب اشارہ کیا۔

سیلز گرل نے اسے کہا کہ وہ سٹور کے اندر آ جائے اور اندر آ کر اوور کوٹوں کے سٹال پر سجے دیگر اوور کوٹ بھی دیکھ لے ممکن ہے کوئی اور اچھا اوور کوٹ اسے پسند آ جائے۔

"نہیں مجھے بس یہی اوور کوٹ پسند ہے۔ میں روزانہ یونیورسٹی آتے جاتے اسے دیکھتا ہوں اور روزانہ ہی اسے پسند کر کے چھوڑ جاتا ہوں کیونکہ میں اسے خرید نہیں سکتا۔ اس کے دام میری قوت خرید سے باہر ہیں"۔ اس نے حسرت بھرے انداز میں سیلز گرل سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "ویسے آپ کے ہاں سے میں اس اوور کوٹ پر زیادہ سے زیادہ کتنا ڈسکاؤنٹ حاصل کر سکتا ہوں؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے سیلز گرل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے لیے تو آپ کو منیجر سے بات کرنا ہو گی ممکن ہے وہ آپ کو کچھ ڈسکاؤنٹ دے سکیں۔" سیلز گرل نے ولیم کو اپنے ساتھ سٹور کے اندر لاتے ہوئے کہا۔

ساتھ ہی اس نے ایک چٹ پر ولیم کے پسندیدہ اوورکوٹ کا ٹیگ نمبر لکھا اور چٹ اسے پکڑاتے ہوئے منیجر کے آفس کی طرف اشارہ کیا کہ وہ وہاں چلا جائے۔ ولیم چٹ پکڑ کر منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا اور اس کے سامنے وہ چٹ رکھ کر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہ وہ یونیورسٹی سٹوڈنٹ ہے اپنا مدعا بیان کیا۔

منیجر نے سرتاپا ولیم کا جائزہ لیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ولیم منیجر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ منیجر نے کمپیوٹر سے اس اوورکوٹ کی قیمت دیکھ کر ولیم کو بتایا کہ یہ اوورکوٹ 60 پونڈ کا ہے۔ آپ چونکہ یونیورسٹی کے طالب علم بھی ہیں لہٰذا میں آپ کو زیادہ سے زیادہ 5% آف دے سکتا ہوں۔ اگر اس سے زیادہ ڈسکاؤنٹ درکار ہو تو 2 ماہ انتظار کر لیں۔ 2 ماہ بعد کرسمس کا تہوار آ رہا ہے۔ کرسمس کے موقع پر ہم سٹور کی تمام اشیاء کی قیمتیں 15 فیصد کم کر دیں گے تو اس وقت آپ کو بھی کوٹ 51 پونڈ کا مل جائے گا۔"

ولیم نے اپنے طور پر بھی دل ہی دل میں 15 فیصد آف کے ساتھ حساب لگایا تو پھر بھی اس اوورکوٹ کے دام اس کی پہنچ سے کافی دور تھے۔

ولیم کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ منیجر نے اسے کہا کہ ایک منٹ ٹھہریں اور پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مسٹر ولیم! آپ کی پسند بہت اچھی اور اونچی ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو داد دیتا ہوں اور ساتھ ہی فیشن نمبر سے اور اپنے کمپیوٹر ورک سے وہی اوورکوٹ پہنے ہوئے ولیم کا فل سائز فوٹوگراف نکال کر ولیم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو"۔ ولیم اس فوٹوگراف میں اپنے آپ کو اپنے پسندیدہ اوورکوٹ میں ملبوس دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس اوورکوٹ میں وہ اپنے آپ کو کوئی الوہی ہستی جیسی شخصیت سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ولیم کے قد کاٹھ پر وہ اوورکوٹ خوب سج رہا تھا۔ ولیم زندگی میں پہلی بار اپنے اوورکوٹ والے سراپے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسے اس کی کوٹ حاصل کرنے کی آتش شوق کو جیسے ہوا مل گئی ہو۔ ولیم نے فوٹو دیکھنے کے بعد منیجر کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو۔" منیجر نے یہ کہہ کر فوٹوگراف واپس کر دیا۔ "ہم اپنے کسٹمرز کی پسند کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی پسند ہماری پسند ہوتی ہے۔ میں آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ بہت جلد میں یہ اوورکوٹ آپ کو حقیقت میں پہنے ہوئے دیکھوں۔" منیجر نے ولیم سے پرجوش مصافحہ کیا۔ ولیم نے فوٹو جیب میں ڈالا اور غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ منیجر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ڈونا کی نظریں دوبارہ ولیم پر پڑیں تو وہ اس کے قریب آ کر اس سے پوچھنے لگی کہ اس نے کیا فیصلہ کیا؟

"کوئی بات نہیں بنی"۔ ولیم کے منہ سے ایک آہ سی نکلی۔

ادھر سیلز گرل کا کھلا ہوا چہرہ بھی بجھ سا گیا۔ البتہ ولیم نے منیجر کا بنایا ہوا اس کا فوٹوگراف جیب سے نکال کر ڈونا کو دکھایا۔

"واہ کیا بات ہے... ونڈرفل... آپ تو سچ مچ کے پرنس لگتے ہو"۔ اس نے ستائش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ولیم حسرت و یاس کی تصویر بنا سٹور سے باہر آ گیا۔ ناچار وہ بچت کے طریقے سوچنے لگا کہ کس طرح سے بچت کر کے وہ مطلوبہ رقم جمع کر کے اپنا پسندیدہ اوورکوٹ خرید سکتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے تہیہ کیا کہ وہ آہستہ چلے گا تاکہ اس کے جوتے جلدی نہ گھس جائیں

اور وہ جوتوں کو پالش نہیں کرائے گا۔ وہ ایک سال تک گھر سے کلب نہیں جائے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ پڑھائی اسٹڈی دن کے اجالے میں ختم کر لیا کرے۔ اگر پھر بھی رات کے لئے کچھ ہوم ورک بچ جاتے تو رات پڑتے ہی وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے انکل البرٹ کے گھر چلا جائے گا اور وہاں جا کر ان کی بیٹی الزبتھ سے مل کر سٹڈی کر لیا کرے گا۔ الزبتھ محنتی لڑکی تھی اور اس کی کلاس فیلو بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رات دیر تک سٹڈی کرتی رہتی ہے۔

ولیم یونیورسٹی جانے کے لئے معمول سے آدھا گھنٹہ پہلے نکل پڑتا راستے میں جو حصہ پیدل سفر کا ہوتا وہاں وہ نہایت آہستہ اور دھیمی رفتار سے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا۔ اس نے چمڑے کے جوتوں کے تلووں میں لوہے کے ستارے لگوائے اور ایڑیوں پر جس جانب سے جوتے گھسنے کا احتمال تھا وہاں اس نے لوہے کے چاند نما ٹکڑے لگوائے تاکہ اگر گھسیں بھی تو وہ چاند ستارے گھسیں جوتوں کے تلوے نہ گھسیں۔ دن کے وقت یونیورسٹی کی کینٹین سے کافی کے ساتھ کیک پیس لینا بھی اس نے ترک کر دیا۔ وہ اپنی کلاس میٹ سوزن جس کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی اس کی کافی کا بل ادا کرنے سے بھی کترانے لگا۔ ادھر سوزن بھی آہستہ آہستہ ولیم سے کھنچتی چلی گئی اور اس نے جیک سے دوستی لگا لی۔

یونیورسٹی سے واپسی پر ولیم کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ اپنے من پسند اوور کوٹ کو ایک نظر ضرور دیکھتا۔ ادھر ڈونی بھی ولیم کی منتظر رہتی ولیم کی چھٹی کے وقت اس کی نظریں بھی بار بار شوکیس کی جانب اٹھتی رہتیں۔ جب تک کہ ولیم وہاں سے گزر نہ جاتا وہ اس کی راہ تکتی رہتی۔ اسی اثناء میں کرسمس نزدیک آ گیا۔ ولیم نے جان بوجھ کر ان دنوں فیشن سٹور کے راستے سے گزرنا چھوڑ دیا کیونکہ کرسمس کے موقع پر شاید ڈسکاؤنٹ کے باوجود اس کے

پاس اتنی رقم جمع نہیں ہوئی تھی کہ وہ اوور کوٹ خرید سکتا۔ ادھر کرسمس سے مشتاق لوگوں نے دل کھول کر خریداری کی، فیشن ٹاور کی سیل بہت اوپر گئی۔

کرسمس گزرنے کے بعد ولیم نے ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی۔ تنخواہ اور اپنی کی ہوئی بچت سے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اب اپنا پسندیدہ اوور کوٹ خریدنے کے قابل ہو چکا ہے۔ اگلی صبح وہ یونیورسٹی جاتے ہوئے بہت خوش تھا۔ اس نے پروگرام بنایا کہ وہ واپسی پر فیشن ٹاور جا کر اوور کوٹ خریدے گا۔ آج اس کی جیب میں پیسے تھے اور اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ جیب میں پیسے ہوں تو اپنی ذات بھی بھلی بھلی معلوم ہوتی ہے اور خود پر غصہ بھی کم آتا ہے۔ پھر فیشن ٹاور کے شوکیس کے سامنے کھڑا ہونا بھی معیوب نہیں لگتا۔ اس نے مزید یہ بھی سوچا۔ آج وہ ذونی سے خوب باتیں کرے گا۔ اسے قریبی کافی شاپ میں چل کر کافی پینے کی دعوت بھی دے گا۔ وہ جب ذونی کے ساتھ اپنا پسندیدہ کوٹ پہنے "سویٹ کافی ہاؤس" میں داخل ہوگا تو کافی ہاؤس میں بیٹھے لوگ اس جوڑے کو رشک بھری نظروں سے دیکھیں گے اور اس کی قسمت پر رشک کریں گے اور اسے کوئی رئیس زادہ ہی خیال کریں گے۔

وہ ذونی سے آج کھل کر دل کی بات کہہ دے گا۔ اسے وہ رنگ بھی گفٹ کر دے گا جو اس نے سوزان کے لیے خریدی تھی۔

آج اس کا گلابی چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ یونیورسٹی کا آخری پیریڈ ختم کر کے وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ باہر نکلا۔ آج وہ چل نہیں بلکہ دوڑ رہا تھا۔ آج اسے اپنے جوتوں کے گھسنے کی بھی پروا نہیں تھی بلکہ اس نے نئے جوتے خریدنے کا بھی سوچ رکھا تھا۔

آج اس نے فیشن ٹاور کے شوکیس کی جانب نگاہ بھی نہیں اٹھائی سیدھا اندر ہال رکا۔ وہ چاند ستارے لگے بٹنوں کے ساتھ اونچی آواز میں ٹک ٹک کرتا ہوا سیدھا اسٹور کے اندر جا گھسا۔ ذونی نے اسے دیکھتے ہی ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"او تم کہاں کھو گئے تھے ولیم؟" اس نے شکوہ بھرے انداز میں پوچھا۔ "کرسمس کے موقع پر مجھے تمہارا شدت سے انتظار رہا۔ کیونکہ اس بار ہمارے فیشن ٹاور نے قیمتوں پر 20% آف دے رکھی تھی اور اس سیزن کی ہماری ریکارڈ سیل رہی۔" یہ کہتے ہوئے ذونی کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔

"چلیں جو بھی ہو، میں اب اپنی پسند کے اوور کوٹ کی موجودہ قیمت دینے کو تیار ہوں۔ لائیے میرا اوور کوٹ۔ آج میں اپنا اوور کوٹ پہن کر اسٹور سے نکلوں گا۔ اور اپنے دیرینہ خواب کو حقیقت کا جامہ پہناؤں گا۔"

"لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" ولیم نے پوچھا۔

"ولیم! آپ کا کوٹ سیل میں بک گیا۔" ذونی نے نگاہیں جھکاتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

"کیا؟" ولیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، وہ کوٹ اب اس اسٹور میں نہیں رہا۔" ذونی نے مختصر لہجے میں بتایا۔ "آپ کرسمس کے دنوں آئے نہیں تو کسٹمرز کی ڈیمانڈ پر منیجر نے وہ کوٹ بیچ دینے کو کہہ دیا۔ میں نے کافی کوشش کی چند روز تک تو میں نے آپ کا کوٹ آپ کے لیے بچائے رکھا اور گاہکوں کو دوسرے کوٹوں کی جانب راغب کرتی رہی مگر چوتھے روز منیجر صاحب کے حکم پر مجھے وہ کوٹ دینا پڑا۔ مجھے افسوس ہے ولیم! کیا تم مجھے معاف کر سکو گے؟" ذونی نے روہانسی ہو کر کہا۔

اپنی واسکٹ کی جیب میں رنگ کو پکڑے ہوئے ولیم کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ ولیم یاس بھری نظروں سے ذونی کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

❋❋❋

طب وصحت

☆ڈاکٹر فیاض احمد ہرل

(ماہر امراض ذہن ونفسیات)

خبردار! عالمی ادارہ صحت کے مطابق اگلے دس برس میں پوری دنیا میں "ڈپریشن" دل کے امراض کے بعد دوسرے نمبر آ جائے گا۔ افسوس، ہمارے معاشرے میں اسے ابھی تک آسیب، سایہ اور جادو سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

میں اپنے کلینک سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک صاحب تھکے تھکے قدموں سے داخل ہوئے اور ڈھیر سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ لگ بھگ پچپن ساٹھ برس کی عمر، دوہرا بدن، چہرے کے سب زاویے نیچے کی جانب ڈھلکے ہوئے، آنکھیں جن میں کبھی ذہانت کی چمک ہو گی، ان میں اب ایک دھند آمیز حسرت جھلک رہی تھی۔ چہرے مہرے اور لباس کی تراش خراش سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ لگ رہے تھے۔

میں نے ان کی حالت دیکھ کر ان کے لئے پانی منگوایا۔ پانی پی کر انہوں نے ایک آہ نما ٹھنڈی سانس بھری اور میری طرف دیکھ کر ملتجیانہ انداز میں کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا، آپ مہربانی فرما کر مجھے زہر کا ٹیکہ لگا دیں"۔

اوپر بیان کردہ مریض جیسی صورت حال ہمارے سامنے آئے تو ہم عموی طور پر اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اگر آپ اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو آپ کو بیشتر لوگ بھاگتے دوڑتے، متحرک اور زندگی کے جوش و جذبے سے بھرپور دکھائی دیں گے۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ اکثر لوگوں میں زندگی کی لگن ہے اور وہ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو وہ صحت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اپنی کل جمع پونجی بھی خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ جسمانی اور روحانی معالجین سے زندگی اور صحت کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ ہر انسان لمبی عمر جینا چاہتا ہے اور ہر وہ چیز جو اسے موت کی یاددہانی کرائے اس سے دور بھاگتا ہے۔ ہم اپنے قریبی عزیز کی میت کے پاس بھی زیادہ وقت گزارنے سے گھبراتے ہیں۔ قبرستان کا

منظر ہمیں وحشت زدہ کر دیتا ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے جیسے ہم سب کو زندگی سے بہت پیار ہے۔

اس دوران آپ کو کوئی ایسا شخص ملتا ہے جس کے لئے زندگی کے کوئی معنی نہیں رہے اور وہ مکمل بیزار اور مایوس ہے۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ کسی انسان میں زندگی کی خواہش ختم ہو جاتی ہے اور وہ مکمل مایوسی کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔

فلسفیانہ طور پر کسی شخص کی ایسی ذہنی کیفیت کے بہت سے نام رکھے جا سکتے ہیں، جیسے قنوطیت، مردم بیزاری، یاسیت وغیرہ۔ اس حالت میں مثبت چیزوں کے بھی منفی پہلو زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اور زندگی کا تاریک پہلو ہر شے پر حاوی ہو جاتا ہے۔

البتہ اگر طبی اصطلاحات میں بات کی جائے تو کسی شخص کی ایسی ذہنی کیفیت کو ہم ڈپریشن کا نام دے سکتے ہیں۔ (Depressive Disorder) لاطینی زبان کے ایک لفظ Deprimere سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں "کسی شے کو دبانا" (To Press Down)۔ ڈپریشن کی اصطلاح چودھویں صدی عیسوی سے مستعمل ہے۔ جس کے معنی ہمت اور جوش و جذبے کے زوال کی کیفیت ہے۔ (To bring down in spirits_ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے انگریزی ادب میں بھی اس اصطلاح کا استعمال ملتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ اصطلاح معاشیات اور فزیالوجی کے علوم میں بھی استعمال ہونے لگی۔

موجودہ میڈیکل سائنس میں اس سے مراد ایک ایسی ذہنی کیفیت یا بیماری ہے جس میں انسان زندگی میں دلچسپی اور ذہنی و جسمانی توانائی کھو بیٹھتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے معاملات، میل جول وغیرہ میں دل نہیں لگتا۔ مستقبل کے حوالے سے ناامیدی و مایوسی کا غلبہ رہتا ہے۔ احساس کمتری اور احساس ندامت شدت سے حاوی ہو جاتے ہیں۔ نیند اور بھوک میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے اور موت اور خودکشی کے خیالات آ سکتے ہیں۔

اردو کی ایک معروف افسانہ نگار خاتون سے بات ہو رہی تھی جو خود بھی ڈپریشن کے مرض میں مبتلا رہ چکی تھیں۔ انہوں نے اس مرض کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی۔ بولیں۔ "ڈاکٹر صاحب! وہ لوگ جو ڈپریشن کو ایک معمولی اور بے ضرری کیفیت سمجھتے ہیں اصل میں ڈپریشن کے عام احساس (Depressive Feeling) اور ڈپریشن کی بیماری (Depressive Disorder) میں فرق نہیں سمجھتے۔ یہ جو کبھی کبھار ہم لوگ کہتے ہیں کہ آج ہمیں بڑا ڈپریشن ہو رہا ہے اور کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے اسے Depressive Feeling کہنا چاہئے۔ ایسا ہر شخص کے ساتھ مہینے میں ایک دو دن ہو سکتا ہے اور خود بخود ہی بہتر بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ڈپریشن کا مرض ایک بہت تکلیف دہ اور خطرناک کیفیت ہے۔ اس میں بسا اوقات ایسا لگتا ہے جیسے ذہن پر گہری خوفناک دھند یا بادل چھائے ہوں اور ہر طرف تاریکی اور مایوسی کا راج ہو"۔

ڈپریشن کا تاریخی تناظر

ڈپریشن کو عام طور پر لوگ موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمانے کی بیماری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ گزرے ہوئے زمانے میں یہ بیماری وجود نہیں رکھتی تھی۔ اگر ہم قدیم طبی کتابوں کا جائزہ لیں تو ڈپریشن سے ملتی جلتی علامات کی بیماری کا تذکرہ ہمیں گزشتہ تین چار ہزار سالوں کی طبی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

آپ نے شاید ہمارے پرانے کلچر میں ایک بیماری "مالیخولیا" کا نام سنا ہوگا۔ یہ لفظ قدیم زبانوں کی ایک اصطلاح "Melancholia" سے ماخوذ ہے جو نب

انگریزی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ اس کا لفظی مطلب ہے Black Bile یا سیاہ مادہ۔ معروف یونانی مفکر اور معالج حکیم بقراط نے اپنی معروف کتاب "Aphorism" میں یہ تصور دیا تھا کہ انسانی مزاج کا تعلق جسم میں موجود چار قسم کے مادوں کے تناسب سے ہے۔ اگر جسم میں سیاہ مادے (Black Bile) کی مقدار حد سے تجاوز کر جائے تو اس سے پژمردگی، یاسیت اور ناامیدی کی ایک کیفیت پیدا ہوگی جسے اس نے مالیخولیا کا نام دیا۔

اس طرح عہدنامہ قدیم (Old Testament) میں سول نامی بادشاہ (King Saul) کے قصے میں بھی ہمیں ڈپریشن سے ملتی جلتی کیفیت کا سراغ ملتا ہے۔ معروف یونانی شاعر ہومر (Homer) نے اپنی شہرہ آفاق تخلیق "Iliad" میں بھی ڈپریشن اور خودکشی کی کیفیات کا تذکرہ کیا ہے۔

بقراط کے برعکس معروف رومی مفکر سیسرو (Cicero) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مالیخولیا کا جسمانی وجوہات کی بہ نسبت ذہنی وجوہات سے ہونا زیادہ قرین قیاس ہے مثلاً خوف اور شدید غم و غصے کے نتیجے میں۔ اسی وجہ سے یونانی اور رومی "معالجین" ڈپریشن کے علاج کے لئے ورزش، جمناسٹک، موسیقی، مخصوص خوراک، بھرپور نیند، غسل کے مخصوص طریقے اور جسمانی مساج (Body Massaga) وغیرہ تجویز کرتے تھے۔ کچھ حلقوں میں اس بیماری کے لئے افیم کے پودے کا رس اور گدھی کا دودھ بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

اگر ہم یونانی اور رومی دور سے پہلے کے حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب کے مراکز مثلاً مصر، بابل و نینوا اور چین میں بھی ذہنی مرض کو شیطانی اثر، آسیبی سایہ یا دیوتاؤں کی ناراضگی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اسی لئے ان خطوں میں مریضوں کو باندھ کر رکھا جاتا تھا اور شیطانی اثرات کو بھگانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے تھے جن میں مریض کو جلانا، کھوپڑی میں سوراخ کرنا، شدید جسمانی تشدد اور فقر و فاقہ وغیرہ شامل تھے۔

اسلامی تہذیب کے دور عروج میں ابن سینا اور رازی نے ڈپریشن (مالیخولیا) کا ادراک اور اس کا علاج ایک دماغی بیماری کے طور پر ہی کیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک ڈپریشن کی تعبیرات برقیاتی اور عضویاتی (Electrical and Phyusiological) بنیادوں پر کی جانے لگی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ جب مغرب میں نفسیات پر سائنسی تحقیق کا آغاز ہوا تو ڈپریشن کے اسباب سمجھنے کے لئے بہت سی نفسیاتی تھیوریاں پیش کی گئیں۔

وجودی نفسیات کے مکتبہ فکر کے معروف نفسیات دان "وکٹر فرینکل" نے ڈپریشن کو زندگی کی بے مقصدیت اور لایعنیت سے منسلک قرار دیا۔ فرینکل نے لوگوتھراپی (Logotherapy) کے نام سے ایک طریقہ علاج وضع کیا جو زندگی میں مقصدیت کے تعین پر زور دیتا ہے۔ امریکی وجودی نفسیات دان "رولو مے" (Rollo May) نے تصور دیا کہ ڈپریشن کا مرض بنیادی طور پر ایک خوش آئند مستقبل کی تراش خراش میں ناکام رہنے پر لاحق ہوتا ہے۔

آج جبکہ ڈپریشن کو ایک کیمیائی اور حیاتیاتی (Blochemical) بیماری سمجھا جانے لگا ہے۔ دنیا کے بہت سے خطوں میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ ابھی تک اس بیماری کو جادو، سایہ، آسیب اور جن و شیاطین کا اثر ہی سمجھا جاتا ہے۔ بیشتر مریضوں کا علاج معالجہ روحانی عاملین، پیروں اور عطائی ڈاکٹروں کے سپرد ہے اور ذہنی مریض تکلیف دہ بیماری، تشدد آمیز طریقہ علاج اور معاشرے کا حقارت آمیز رویہ تینوں طرح سے اپنی

جان پر عذاب جھیلتے ہیں۔

مفروضے اور مغالطے

ڈپریشن کے بارے میں ہمارے معاشرے میں بہت سے بے بنیاد مفروضے اور مغالطے مروج ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو درج ذیل باتیں اکثر سننے کو ملتی ہیں:

(i) دینی مزاج کے حامل لوگوں کو ڈپریشن نہیں ہو سکتا۔
(ii) ڈپریشن صرف کمزور قوت ارادی کے حامل افراد کو ہوتا ہے۔
(iii) بچوں کو ڈپریشن نہیں ہوتا۔
(iv) ڈپریشن عام طور پر کسی بڑے صدمے یا حادثے کے بعد ہی ہوتا ہے۔
(v) ڈپریشن کا شکار ہونا یا نہ ہونا انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔
(vi) اگر کوئی شخص گفتگو کے دوران بار بار رو پڑے تو وہ ڈپریشن میں مبتلا ہے۔
(vii) ماہرین نفسیات ڈپریشن کا علاج نشہ آور ادویات سے کرتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ مفروضوں کے حوالے سے ڈپریشن کے بارے میں سائنسی حقائق اور ریسرچ کے نتائج سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(i) ڈپریشن دینی و مذہبی حوالے سے باعمل لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح انہیں دل کی بیماری یا کینسر اور ٹی بی کا مرض ہو سکتا ہے۔
(ii) مضبوط قوت ارادی کے حامل افراد بھی ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ البتہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اس مرض سے نجات حاصل کرنے میں دوسرے لوگوں سے کم وقت لگے۔
(iii) بچوں میں بھی ڈپریشن کا مرض دیکھا گیا ہے البتہ ان کی علامات بالغ افراد سے کسی حد تک مختلف ہوتی ہیں مثلاً بیجا ضد، غصے کا اظہار، پیٹ درد، سر درد وغیرہ۔
(iv) ڈپریشن دماغ میں بعض کیمیائی مادوں کے تناسب میں تبدیلی کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض خاندانوں میں وراثتی طور پر بھی آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتا ہے۔ اسی لئے بہت سے لوگوں میں بغیر کسی بڑے صدمے یا حادثے کے بھی ڈپریشن کا مرض ہو سکتا ہے۔
(v) کسی بھی دوسری جسمانی بیماری کی طرح ڈپریشن میں مبتلا ہونا یا نہ ہونا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اس میں مریض سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بغیر کسی مدد کے خود بخود اس پر قابو پالے محض نا سمجھی ہے۔
(vi) کسی شخص کو بار بار رونا آنا ڈپریشن کے علاوہ بھی کئی اسباب سے ہو سکتا ہے۔ ڈپریشن کا مرض کسی ایک علامت کی بنیاد پر تشخیص نہیں کیا جاتا بلکہ یہ کچھ مخصوص علامتوں کے مجموعے کا نام ہے۔
(vii) ڈپریشن کا علاج جن ادویات سے کیا جاتا ہے وہ (Antidepressents) کہلاتی ہیں۔ یہ ادویات نشہ آور نہیں ہوتیں، جسم کو ان کی عادت نہیں پڑتی اور متعین کورس پورا کرنے کے بعد باآسانی بند کی جا سکتی ہیں۔

ڈپریشن کی عمومی علامات

ہمیں کیسے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم ڈپریشن میں مبتلا ہیں؟ آپ نوٹ کیجئے کہ اگر درج ذیل علامات میں سے کم از کم چار علامات گزشتہ دو ہفتوں یا اس سے زیادہ مدت سے محسوس کی جا رہی ہوں تو اس کا سبب ڈپریشن ہو سکتا ہے۔

(i) مزاج یا طبیعت میں اداسی اور افسردگی بڑھ جانا۔

(ii) روزمرہ کے معمولات کام اور پسند کے مشاغل میں دلچسپی کم ہو جانا۔
(iii) ذہنی وجسمانی طاقت اور ہمت میں کمی محسوس کرنا۔
(iv) روزمرہ کے معمولات اور کام میں توجہ مرکوز کرنے میں دقت ہونا۔
(v) اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کمتر سمجھنا۔
(vi) خود کو ناکام اور بیکار سمجھنا اور ماضی میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر شدید احساس گناہ میں مبتلا ہونا۔
(vii) آنے والے وقت سے مایوس ہونا/ ناامیدی کا شکار ہونا۔
(viii) خودکشی کے خیالات آنا۔
(ix) بھوک میں نمایاں کمی یا زیادتی ہو جانا۔
(x) نیند میں نمایاں کمی یا زیادتی ہو جانا۔
(xi) جنسی خواہش میں کمی واقع ہو جانا۔

ڈپریشن کے اسباب

ڈپریشن کے پیدا ہونے میں بہت سے عوامل و محرکات کا عمل دخل اور تعامل (Interaction) ہو سکتا ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

1- جن خاندانوں میں کسی فرد میں ڈپریشن کا مرض تشخیص ہو تو موروثی اثرات کی وجہ سے اس کی آئندہ نسلوں میں ڈپریشن ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

2- سائنسی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ڈپریشن کے مرض میں دماغ میں کچھ کیمیائی مادوں مثلاً سیروٹونن (Serotonin)، ڈوپامین (Dopamine) اور نور ایپی نیفرین (Nor-Epinephrine) کی مقدار میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان تینوں مادوں کا انسانی مزاج کے کنٹرول میں اہم کردار دیکھا گیا ہے۔ اگرچہ ان کیمیائی مادوں کے عدم توازن کو ڈپریشن کی بنیادی وجہ نہیں سمجھا جاتا لیکن دیکھا گیا ہے کہ جب ڈپریشن کی ادویات سے یہ عدم توازن ٹھیک ہو جائے تو ڈپریشن کی علامات میں نمایاں بہتری ہو جاتی ہے۔

3- کچھ سائنسی شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ ہارمونز پیدا کرنے والے کچھ غدود مثلاً پچوٹری (Pituitary)، تھائی رائیڈ (Thyroid) اور ایڈرینل (Adrenal) بھی ڈپریشن پیدا کرنے کے عمل میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔

4- بچپن کے حالات و ماحول، جسمانی ونفسیاتی تشدد اور والدین کی شفقت سے محرومی کا بھی بعد کی زندگی میں ڈپریشن پیدا ہونے سے تعلق ہو سکتا ہے۔

> **انمول باتیں**
>
> ○ توقعات کا کشکول ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔
>
> ○ عزت، احساس، شفقت اور پیار ایسے ادھار ہیں جو آپ کو ضرور واپس ملیں گے۔ (نسیم سکینہ صدف)

ڈپریشن کا علاج

ڈپریشن کے علاوج کے لئے عموی طور پر تین طریقوں سے مدد لی جاتی ہے:

(1) دواؤں کے ذریعے علاج
(2) مشین کے ذریعے
(3) ذہنی، نفسیاتی طریقوں سے علاج

(1) دواؤں کے ذریعے علاج

1- ڈپریشن کے علاج کے لئے دوا کا متعین کورس کروایا جاتا ہے، جو عام طور پر 8 سے 8 ماہ پر محیط ہوتا ہے۔ یہ ادویات اینٹی ڈپریسنٹ (Antidepressents) کہلاتی ہیں اور عموی طور پر دماغ میں پائے جانے والے کیمیائی مادوں سیرٹونن، نوراپی نفرین یا ڈوپامین کی میسر مقدار میں اضافہ کرتی ہیں جس سے ڈپریشن کی علامات میں نمایاں بہتری واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ادویات اپنے عمل کو شروع کرنے میں ایک سے دو ہفتے کا وقت لیتی ہیں۔ اگر یہ ادویات بے قاعدگی سے لی جائیں اور بار بار وقفے آتے رہیں تو ان کی افادیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈپریشن کی ادویات کبھی کبھار حسب ضرورت استعمال کے لئے نہیں ہوتیں اور نہیں اس طرح استعمال کرنے سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔

ہر اینٹی ڈپریسنٹ دوا کے کچھ نہ کچھ ذیلی اثرات (Side Effects) ہوتے ہیں جو عام طور پر ایک سے دو ہفتے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی ذیلی اثرات محسوس کئے جائیں تو معالج سے مشورہ مفید ہو سکتا ہے۔

(2) مشین کے ذریعے علاج

شدید اور خطرناک نوعیت کے ڈپریشن میں یہ طریقہ علاج بہت افادیت رکھتا ہے (خاص طور پر جب مریض خودکشی کے خیالات رکھتا ہو یا شدید ڈپریشن کی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو)۔

اس طریقہ علاج کے بارے میں معاشرے میں بہت سے غلط مفروضے مشہور ہیں۔ اس حوالے سے چند باتیں نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔

یہ طریقہ علاج عام طور پر بجلی کے علاج کے طور پر مشہور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس میں بجلی کی بہت کم وولٹیج استعمال کی جاتی ہے جو مریض کے لئے خطرناک اثرات سے پاک ہوتی ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ طریقہ علاج لاعلاج مریضوں کے لئے آخری امید کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بات سائنسی طور پر درست نہیں ہے کیونکہ ڈپریشن اور پوسٹ نٹل سائیکوسز (Postnatal Psychosis) وغیرہ میں اسے فوری اثرات پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

سائنسی ریسرچ کے مطابق اس طریقہ علاج کے ضرر رساں اثرات (Side Effects) ڈپریشن کی دواؤں کے اثرات سے بھی کم پائے گئے ہیں۔ اسی لئے اس طریقہ علاج کو بہت محفوظ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ علاج بہت تیزی سے اپنا اثر شروع کرتا ہے اور دواؤں کی نسبت بہت کم وقت میں مریض کی کیفیت میں بہتری شروع ہو جاتی ہے۔ علاج کے بعد چند گھنٹوں یا دنوں تک سر درد یا یادداشت میں خرابی کی شکایات ہو سکتی ہیں۔ یہ کیفیات عارضی ہوتی ہیں اور کچھ عرصے میں خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔

(3) ذہنی ونفسیاتی طریقوں سے علاج

(i) کونسلنگ (Counseiling): اس نفسیاتی طریقہ علاج کے مطابق مریض کی گفتگو ہمدردی اور توجہ سے سنی جاتی ہے اور کوئی حتمی رائے یا فیصلہ دینے سے گریز کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی اور مناسب رہنمائی کی جاتی ہے۔

(ii) کوگنیٹو بیہیویر تھراپی (Congitive

(Behaviour Therapy): اس نفسیاتی طریقہ علاج کی بنیاد اس تجرباتی مشاہدے پر ہے کہ ہم جس انداز سے ماحول کا ادراک کرتے ہیں اور اس کے ردعمل میں جو رویہ اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے مزاج پر براہ راست اثرانداز ہوتا ہے۔ ڈپریشن کے مریضوں کو اکثر اوقات سوچ بچار کے بہت سے ایسے طریقوں کی بھی عادت پڑ جاتی ہے جو حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے اور منفی اندازِ فکر پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی طریقہ علاج میں مریض کو منفی اندازِ فکر تبدیل کرنے میں مدد دی جاتی ہے اور سوچ کے مثبت انداز سکھائے جاتے ہیں۔

(ii) تیز روشنی سے علاج: تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ڈپریشن کی کچھ اقسام میں تیز روشنی کے ذریعے علاج کو بھی مفید پایا گیا ہے۔

ڈپریشن کے علاج کے دوران مفید ہدایات

☆.....ڈپریشن انسان کی زندگی کی روٹین (Routine) کو خراب کردیتا ہے۔

☆.....علاج کے دوران دوبارہ آغاز کرنے کے لئے پہلے ہلکی پھلکی روٹین اپنائیں جسے آپ باآسانی کر سکیں۔

☆.....ڈپریشن میں انسان سمجھتا ہے کہ وہ کوئی ٹارگٹ حاصل نہیں کرسکتا۔

☆.....علاج کے دوران شروع میں آپ کو چھوٹے چھوٹے ٹارگٹ (Small Goals) اپنے سامنے رکھنے چاہئیں جو آپ باآسانی پورے کرسکیں۔

☆.....بہتری کے ساتھ بڑے ٹارگٹس کی طرف توجہ دی جاسکتی ہے۔

☆.....باقاعدہ ورزش یا تیز قدم سیر سے انسانی جسم میں ایسے کیمیائی مادوں (Endorphine) کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے جو مزاج کو خوشگوار بناتے ہیں۔

☆.....تیس سے چالیس منٹ تیز قدم سیر (Brisk Walk) ہفتے میں کم از کم پانچ دن یہ اثرات پیدا کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

سائنسی ریسرچ کے مطابق مندرجہ ذیل غذا مزاج کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

☆.....اومیگا 3 چکنائی کی حامل غذائیں (سالمن، نیوٹ، مچھلی وغیرہ)

☆.....فولک ایسڈ کی حامل غذائیں (پالک، ساگ)

☆.....دودھ اور دودھ سے تیار کردہ غذائیں۔

☆.....روزانہ سونے جاگنے کے مقررہ اوقات بنائیں۔

☆.....سونے کے کمرے میں سے کمپیوٹر، ٹی وی وغیرہ ہٹادیں۔

☆.....دن کے وقت زیادہ سونے سے گریز کریں۔

☆.....اپنی ذات، بیرونی دنیا یا مستقبل کے بارے میں منفی سوچوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرنا ڈپریشن میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔

☆.....منفی سوچوں کو ذہنی طور پر چیلنج کریں اور انہیں مثبت سوچوں سے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔

☆.....ڈپریشن کے دوران کوئی نیا کام سیکھنے کی کوشش کرنے سے دماغ میں ایسی کیمیائی تبدیلیاں آتی ہیں جو فرحت اور انبساط کی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔

(یہ مضمون ڈاکٹر فیاض ہرل کی زیر تحریر کتاب ''امراض ذہن و نفسیات'' سے لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مزید تحریریں پڑھنے کے لئے آپ ان کے فیس بک پیج "gulzam-e-khamosh" پر وزٹ کر سکتے ہیں)۔

عجیب و غریب اور خوفناک رسومات

قدیم زمانے میں لوگ مردہ انسان یا جانور کو انتہائی کم درجہ حرارت پر یعنی برف میں دبا کر کافی عرصے تک رکھ دیتے تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ہو سکتا ہے مستقبل میں کوئی ایسی دوائی مل جائے جس کا استعمال کر کے اپنے پیاروں کو دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔

☆ انتخاب: ڈاکٹر

بھارت کا آدم خور قبیلہ

مہذب دنیا کے لئے تو آدم خوری کا تصور ہی قابل نفرت اور خوفزدہ کر دینے والا ہے مگر دنیا میں ابھی بھی کچھ قبائل ایسے ہیں جو اس قبیح کام میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ ایک ایسا ہی قبیلہ شمالی بھارت میں بھی رہتا ہے جسے "اگوری" کہتے ہیں۔ آئرلینڈ کے صحافی اور فوٹو گرافر وارانج مستن نے اس قبیل کا مشاہدہ کیا تو خوف اور حیرت کے جذبات سے مغلوب ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماضی میں تو زندہ انسانوں کو بھی کھاتے رہے ہیں مگر اب یہ مُردوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کا گوشت کھانے کا طریقہ بھی اس قدر غلیظ اور قابل نفرت ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ لوگ دریائے گنگا کے کنارے آباد ہیں اور چونکہ اس دریا میں جلے، ادھ جلے اور بغیر جلے مُردوں کی ہزاروں لاشیں روزانہ بہائی جاتی ہیں تو یہ دریا میں سے مردہ جسم نکال کر ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ مردوں کا گوشت کھانے کے بعد یہ لوگ ان کی ہڈیوں سے اوزار بنا لیتے ہیں اور کھوپڑیوں کو پانی پینے کے لئے پیالوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مستن کہتے ہیں کہ انہوں نے اس قبیلے کے ساتھ چند دن گزارے اور یہ دیکھ کر کانپ اٹھے کہ یہ لوگ خراب ہوتی لاشوں کو بھی کھا لیتے ہیں اور ان لاشوں کی وجہ سے شدید غلیظ ہو جانے والے گنگا کے پانی کو کھوپڑیوں میں بھر کر پیتے ہیں۔ مستن کے علاوہ بھی متعدد مغربی صحافی اس قبیلے کے متعلق درجنوں مضامین شائع کر چکے ہیں۔

موت پر جشن، پیدائش پر سوگ

بچے کی پیدائش پر خوشی منانا اور کسی کی موت پر سوگ منانا انسان کی فطرت میں شامل ہے لیکن بھارت کے ایک خانہ بدوش قبیلے میں یہ نظام حیرت انگیز حد تک

مختلف ہے۔ ریاست راجستھان میں "ستیا" نامی خانہ بدوش رہتے ہیں جو ویران جگہوں اور سڑکوں کے کنارے خالی جگہ پر اپنی جھگیاں لگا کر رہتے ہیں ان کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر میں سوگ کا سماں ہوتا ہے اور خواتین ماتم کرتی ہیں۔ سارا قبیلہ سوگ میں شامل ہوتا ہے دوسری جانب کسی کی موت ہو جائے تو قبیلے میں جشن کا سماں ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ قبیلے میں موت ان کے لئے غیر معمولی خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ مردہ شخص کی لاش کو رنگ برنگی آرائشی اشیاء سے سجایا جاتا ہے اور سب اکٹھے ہو کر بینڈ باجے کے ساتھ لاش کو شمشان گھاٹ لے کر جاتے ہیں۔ اس موقع پر سب لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں اور مٹھائی بھی بانٹی جاتی ہے۔ جب لاش کو آگ کی نذر کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی پارٹی کو بھی شروع ہو جاتا ہے اور بینڈ کی دھنیں بھی تیز ہو جاتی ہیں کچھ لوگ گوشت بھونتے ہیں جبکہ باقی رقص میں مصروف رہتے ہیں۔ جب تک پارٹی ختم ہوتی ہے مردے کی ہڈیوں کی بھی راکھ بن چکی ہوتی ہے جسے سمیٹ کر یہ گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں اور کسی اور کے مرنے کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔

وہ اپنے مُردوں کو کھاتے ہیں

افریقہ کے جنگلات میں ایک ایسے قبیلے کا علم ہوا ہے جو اپنے مردہ افراد کو دفن کرنے کی بجائے کھا جاتا ہے۔ ہالینڈ کے ایک ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ حال ہی میں اس افریقی قبیلے کے درمیان چند روز بسر کر کے آیا ہے۔ قبیلے کے لوگ باہر سے آنے والے کسی شخص یا تبلیغ کے لئے آنے والے افراد کو نہیں کھاتے۔ ان کی یہ آدم خوری صرف ان کے اپنے قبیلے تک ہی محدود ہے۔ ڈاکٹر ڈکرز کا کہنا ہے کہ وہ نائیجیریا کے جنگلات میں قدیم قبائلیوں پر ریسرچ کر رہا تھا کہ اسے اس قبیلے کے بارے میں علم ہوا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ گدھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور قبیلے کے سردار گدھ کے پر اپنی ٹوپیوں پر سجاتے ہیں۔ ڈکرز کا کہنا ہے کہ وہ قبیلے میں موجود تھا کہ ایک بوڑھی عورت مر گئی۔ قبائلیوں نے اس کی لاش کو خصوصی روغنیات سے غسل دیا پھر اسے آگ پر بھونا گیا۔ اس کے بعد وہ اسے اس طرح کھا گئے جس طرح کے گدھ کھاتے ہیں۔ اس موقع پر کسی خاص قسم کی تقریب کا انعقاد نہیں کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک عام سا واقعہ ہے اور ان کے نزدیک مُردے کو کھانا بالکل ایسا ہی جیسے گدھ مردار کا گوشت کھاتی ہے۔ اس قبیلے کے نوے افراد ہیں اور وہ سال میں اچھی خاصی لاشیں کھا جاتے ہیں۔ ان قبائلیوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پیارے اور عزیز رشتہ داروں کو گدھوں کا نوالہ نہیں بنا سکتے اس لئے وہ خود ان کو کھا جاتے ہیں تاکہ جانوروں کی دسترس سے بچ سکیں۔

جاپان میں مُردوں کے لئے ہوٹل

آپ نے بہت سے منفرد ہوٹلوں کے بارے میں سنا ہوگا مگر جاپان میں کھلنے والے ایک نیا ہوٹل تو سب سے نرالا ہے جو مردہ افراد کے لئے کھولا گیا ہے۔ جاپانی شہر یوکوہاما کے مضافات میں کھلنے والے اس ہوٹل میں صرف وہ ہی افراد قیام کر سکتے ہیں جن کی روحیں اس جہان فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ ان منفرد مہمانوں کو ریفریجریٹر تابوتوں میں رکھا جاتا ہے اور یہاں ان کے قیام کا معاوضہ 157 امریکی ڈالرز ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک مردہ گھر ہے جہاں تدفین کی منتظر لاشوں کو رکھا جاتا ہے مگر اسے ایک معتزز نام دے دیا گیا ہے۔ مگر اس میں انفرادیت یہ ہے کہ ہر لاش کے لئے ایک کمرہ نما ریفریجریٹر مختص کیا جاتا ہے جس کے باہر کھڑکیوں کو خوبصورت پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔

جہنم کی شادی

چین کے شہر بیجنگ کے قریب زیانگ گاؤں کے ایک معروف خاندان نے جب اپنی دس سالہ بچی کو دفن کیا تو ان کے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ کوئی شخص قبر کھود کر لاش نکال کرلے جائے گا۔ لڑکی کی تدفین کے تین روز بعد اس کے خاندان کے کسی فرد کی نظر قبر پڑی تو وہ کھدی ہوئی تھی۔ شنگھائی سے نکلنے والے اخبار کے مطابق شانکسی علاقے میں لاشیں قیمتی اشیاء خیال کی جاتی ہیں اور اس علاقہ کی توہم پرستانہ رسم ورواج کے مطابق ایسے آدمی جو کنوارے ہی انتقال کر جائیں انہیں مردہ کنوارہ لڑکیوں کی لاش کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ اس شادی کو جہنم کی شادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی شادیوں کے لئے لاشوں کا کاروبار کیا جاتا ہے اور اکثر لاشیں بہت زیادہ قیمت پر بک جاتی ہیں۔

موت کا جشن

"توراجالینڈ" انڈونیشیا کا ایک جزیرہ ہے جہاں موت کا جشن منایا جاتا ہے۔ توراجالینڈ انڈونیشیا کے جنوب میں واقع جزیرہ نما سولاویسی میں ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز پہاڑوں کے درمیان ایک جنت نظیر بستی ہے، انگریز اس عجیب جزیرے کو سلیبس کہتے تھے۔ اس بستی میں آج بھی قدیم تہذیبیں پوری طرح زندہ ہیں۔ موت سے متعلق رسوم ورواج یہاں کی قدیم قبریں دو عجائبات عالم ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے سیاح توراجالینڈ آتے ہیں۔ روحوں پر ان لوگوں کا اندھا اعتقاد ہے اور ان لوگوں کا ماننا ہے کہ مرنے والوں کی روحیں ان کے آس پاس ہی رہتی ہیں۔

مرنے والے کے خاندان کے افراد اپنی سب سے قیمتی اشیاء جو مویشی کی صورت میں ان کے پاس ہوتی ہے۔ قربان گاہ پر لے جاتے ہیں اور مردے کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ یہ جشن کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن برپا رہتا ہے اور لوگ دور دراز سے آ کر اس جشن میں شرکت کرتے ہیں۔

مرنے والا جتنا اونچی نسل کا ہوگا جشن اتنا بڑا ہوگا اگر کوئی غریب کسان مر جاتا ہے تو اس کے لئے ایک بھینس اور چھ یا آٹھ سوروں کی قربانی کافی سمجھی جاتی ہے جبکہ اگر کوئی اعلیٰ نسل کے معززین میں سے مر جائے تو اس کے لئے 24 بھینسوں اور دو سو خنزیروں کی قربانی لازمی ہے۔ آپ کو یقین نہیں ہوگا کہ اس قسم کے جشن کے بغیر کوئی بھی مردہ دفن نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی غریب ہے اور جانور نہیں خرید سکتا تو وہ اپنے مردے کو دفن نہیں کر سکتا۔ پائی پائی جمع کرنے میں برسوں لگ جائیں تب بھی کوئی فکر نہیں جب تک جانور خریدنے کے پیسے نہ ہوں تب تک مردہ گھر کے ایک حصہ میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

ان مرے ہوئے لوگوں کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لئے لکڑی کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں جنہیں "تاؤتاؤ" کہا جاتا ہے۔ اگر آپ توراجالینڈ دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو

روشن باتیں

☆ لفظوں کے دانت نہیں ہوتے لیکن یہ کاٹ لیتے ہیں اور پھر ان کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔

☆ یقین کی پختگی اور اخلاق کا حُسن جس آدمی میں ہو وہ ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

☆ کسی کو اس کی ذات اور لباس کی وجہ سے حقیر نہ سمجھو کیونکہ تم دونوں کو دینے والا ایک ہی رب ہے۔

☆ کسی کو پانے کے لئے بہت ساری خوبیاں بھی کم پڑ جاتی ہیں اور کھونے کے لئے ایک خامی ہی کافی ہوتی ہے۔ (ممتاز۔ سرگودھا)

آپ کو جکارتہ سے جزیرے کے صدر مقام اور جونگ پڈانگ تک فضائی سفر کرنے کی سہولت ہوگی اس سے آگے کا فاصلہ آپ بذریعہ کار طے کر سکتے ہیں۔

عجیب وغریب آخری رسومات

موت کا مزہ ہر ذی روح کو چکھنا ہے لیکن مرنے کے بعد انسان کی آخری رسومات کس طرح ادا کی جائے اس کا تصور مختلف مذاہب میں مختلف ہے اور لوگ اسے اپنی مذہبی، ثقافتی اور روایتی انداز سے ادا کرتے ہیں اور بہت سے انداز سے تو عام طور پر لوگ واقف ہی ہیں لیکن کچھ طریقے ایسے دلچسپ اور ظالمانہ ہیں کہ جنہیں جان کر آپ نہ صرف حیران بلکہ کچھ پریشان بھی ہو جائیں گے۔

مردہ کو ممیز میں تبدیل کرنا: آج سے ہزاروں سال قبل قدیم مصر میں امراء اور بادشاہوں کی لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اس طریقے میں دل اور دماغ سمیت لاش کے مختلف حصوں کو الگ کر دیا جاتا تھا جس کے بعد خالی جسم کو کیمیکل لگے لکڑی کے برادے سے بھر دیا جاتا تھا اور پھر پورے جسم کو سوتی کپڑے سے لپیٹ کر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح مرنے والے کی روح اگلے سفر تک محفوظ رہتی ہے۔ دنیا کی قدیم ترین ممی 6 ہزار سال پرانی ہے۔

کریا نوکس: قدیم زمانے میں لوگ مردہ انسان یا جانور کو انتہائی کم درجہ حرارت پر یعنی برف میں دبا کر کافی عرصے تک رکھ دیتے تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ہو سکتا ہے مستقبل میں کوئی ایسی دوائی مل جائے جس کا استعمال کر کے اپنے پیاروں کو دوبارہ زندہ کیا جاسکے۔

خلیوں کو پلاسٹک میٹریل سے تبدیل کرنا: زمانہ قدیم میں دنیا کے ان علاقوں میں جہاں سائنس کی ترقی اپنے عروج پر تھی وہاں مردہ انسان کے جسم سے خلیوں کے مرکزہ میں موجود سیال مادے اور چکنائیوں کو نکال کر اس کی جگہ پر پلاسٹک اور سلیکون کے مصنوعی اعضا لگا دیئے جاتے تھے جس سے لاش ایک طویل عرصے تک محفوظ رہتی اور اس میں کسی قسم کی بدبو بھی نہیں آتی تھی۔

بحری جہاز پر آخری رسومات: دسویں صدی میں یورپی ساحلوں پر راج کرنے والے بحری قزاقوں کے سرداروں کی لاشوں کو ایک بحری جہاز پر رکھ کر اس کے ساتھ سونا، کھانا اور کبھی کبھار غلاموں کو بٹھا کر سمندر کے بیچ پہنچا کر آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ اس طرح مرنے والے کی روح پرسکون رہتی ہے۔

درختوں پر رکھ چھوڑنا: آسٹریلیا، برطانیہ، کولمبیا اور سربیا میں بھی کچھ قبائل لاش کو درخت کی جڑوں اور شاخوں سے باندھ کر چھوڑ دیتے تھے۔

خاموشی کا مینار: زمانہ قدیم میں آتش پرست لاش کو اونچے پہاڑ پر بنے خاموشی کے مینار (ٹاور آف سائیلنس) پر لا کر چھوڑ دیتے اور جب کچھ عرصے بعد اس کی ہڈیاں رہ جاتیں تو انہیں جمع کر کے چونے میں ڈال کر گلا دیتے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس طرح مرنے والے نے جس جس چیز کو چھو کر گندہ کیا ہوتا ہے وہ اس عمل سے پاک ہو جاتی ہے۔

مُردے کے ساتھ انگلیاں کاٹ کر رکھنا: مغربی پاپوا گنی کے دانی قبیلے لوگ مرنے والے کے ساتھ اپنے دکھ کے اظہار کے لئے ایک عجیب رسم ادا کرتے ہیں اور اس رسم میں مرنے والے کی رشتہ دار خاتون اپنی انگلیاں کاٹ کر مردے کے ساتھ دفن کر دیتی ہیں جس سے وہ اپنے دکھ اور غم کا اظہار کرتی ہیں۔

سپرٹ آفرنگ: ایشیا کے کچھ قبائل مردے کو آبادی

سے دور کھیتوں میں دفنا دیتے ہیں اس کے لئے وہ ایک بڑے پتھر کو بیچ میں رکھ کر اوپر جانور کا چارا رکھ دیتے ہیں۔ ویتنام کے لوگ لاش کے ساتھ کچھ رقم بھی رکھ دیتے ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ مرنے والا اپنی ضرورت کے مطابق آئندہ زندگی کے لئے جو چاہے خرید لے۔

ایکوا مشین: امریکہ میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں لاش کو ایک سٹیل کی مشین میں رکھ کر اسے ایک خاص درجہ حرارت پر چلایا جاتا ہے جس سے جسم مائع میں تبدیل ہو جاتا ہے جبکہ ہڈیاں محفوظ رہتی ہیں تاہم اسے ہاتھوں سے راکھ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس راکھ کو متعلقہ رشتے دار کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے پانی میں بہا دیتا ہے۔

خلا میں: بیسویں صدی میں شروع ہونے والے اس طریقہ میں مرنے والے کی خواہش کے مطابق اس کے جسم کے جلائے ہوئے اجزا کو خلائی کیپسول میں رکھ کر راکٹ کی مدد سے فضا میں فائر کر دیا جاتا ہے، اس طریقے سے اب تک 150 افراد کی آخری رسومات ادا کی گئی ہیں۔

مُردہ پرندوں کے آگے: ہزاروں سال کے رائج اس رسم میں تبت کے رہنے والے بدھ بھکشو اپنے مردے کی لاش کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پرندوں کے سامنے ڈال دیتے ہیں جبکہ اب بھی 80 فیصد بدھ بھکشو یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرمی: اس طریقہ میں مرنے والے جانور کی کھال کو کیمیکل لگے بھوسے سے بھر کر اس کو دوبارہ زندگی والی شکل دی جاتی ہے لیکن اب کچھ لوگ بھی مرنے کے بعد اپنی ٹیکسی ڈرمی کرنے کی وصیت بھی کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں۔

●●●

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

فضائی قزاقی

موساد کی نظر میں، امن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ
یاسر عرفات ہی تھا اور اس کا قتل اس ایجنسی کی اولین ترجیح تھی۔

قسط 14 ☆ 0300-4154083 میاں محمد ابراہیم طاہر
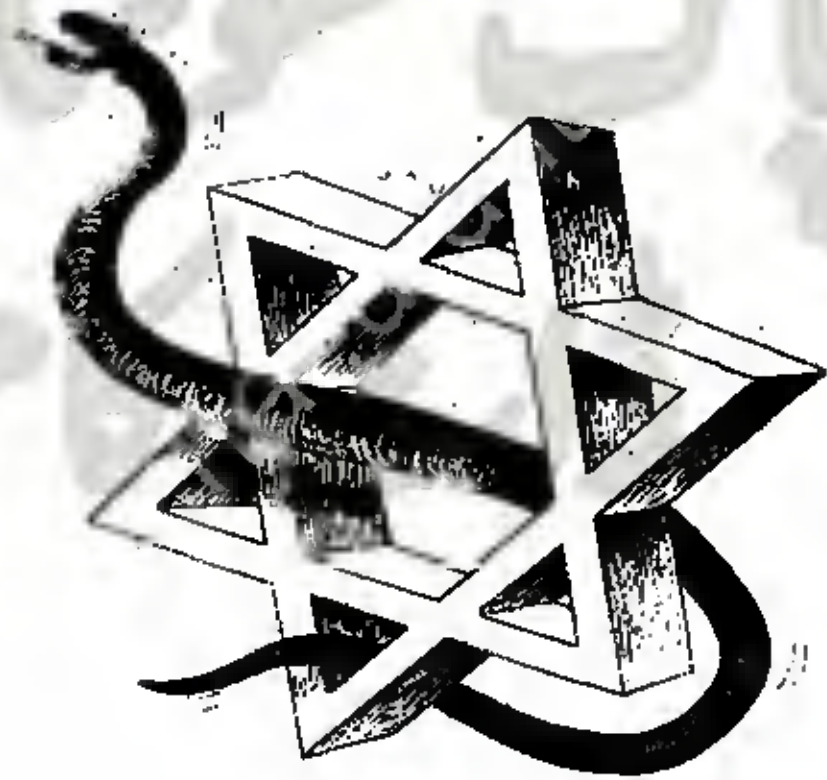
فروری 1986ء کی ایک صاف شفاف صبح کو جبکہ آسمان بالکل صاف اور کوئی بادل نہ تھے، دو اسرائیلی جنگی طیاروں نے لیبیا میں رجسٹرڈ مسافر بردار لیئر جیٹ (Learjet) جہاز کو، جو لیبیا کے دارالحکومت تریپولی سے شام کے دارالخلافہ دمشق کی طرف، بین الاقوامی فضائی حدود میں اڑ رہا تھا اور تیس ہزار فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا، گھیر لیا۔ یہ سویلین جہاز اس وقت میڈیٹیرین سمندر کے اوپر تھا اور چند منٹوں میں شام کی فضائی حدود میں داخل ہونے والا تھا۔ جہاز میں سوار زیادہ تر فلسطینی اور دوسرے انتہا پسند گروپوں کے وہ نمائندے اور رہنما شامل تھے جنہیں معمر قذافی نے ایک کانفرنس کے سلسلے میں اپنے دارالحکومت میں اکٹھا کیا تھا کہ لیبیا کے رہنما کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو، اسرائیل کو دنیا کے نقشے سے نیست و نابود کرنا، کے سلسلے میں نئی نئی راہیں تلاش کی جاسکیں اور نئی منصوبہ بندی کی جا سکے۔

اسرائیلی جنگی طیاروں نے مسافر بردار جہاز کے دونوں طرف پوزیشن لے لی، جس سے جہاز کے اندر بیٹھے 14 مسافروں میں، جو چند لمحے قبل ہنسی مذاق میں مصروف قہقہے لگا رہے تھے، خوف و ہراس پھیل گیا۔ ان کے خوفزدہ ہونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ صرف چار ماہ قبل یکم اکتوبر 1985ء کو، منگل کے دن، اسرائیل کے F-15 جہازوں نے تیونس کے جنوب مشرق میں واقع فلسطینی تحریک آزادی (PLO) کا ہیڈ کوارٹر بمباری کر کے تباہ کر دیا تھا، حالانکہ یہ ہیڈ کوارٹر اسرائیل سے تین ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسرائیل فضائیہ کے طیاروں نے یہ طویل فاصلہ بغیر رکے پرواز کرتے اور فضا ہی میں ائر ٹینکر کے ذریعے ایندھن بھرتے ہوئے طے کیا تھا۔ یہ موساد کی جاسوسی کی مہارت کا واضح ثبوت تھا جس نے پوری عرب دنیا کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔

فلسطینی تحریک آزادی کے مرکز پر یہ حملہ ان تین ادھیڑ عمر یہودی سیاحوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے کیا گیا تھا جنہیں قبرص (Cypriot) کی بندرگاہ لارناکا (Larnaca) کے قریب، جبکہ وہ اپنی کشتی میں غسل آفتابی میں مصروف تھے، فلسطینی دہشت گردوں نے قتل کر دیا تھا۔ یہ قتل بھی "یوم کپور" کے دن کیا گیا تھا جس سے یہودیوں کو عید کپور (گناہوں سے بخشش کا دن) کے روز اچانک مصر کی طرف سے ان پر مسلط کردہ جنگ یاد دلا دی تھی۔

اگرچہ اسرائیلیوں کو دہشت گردی کا سامنا کرتے ہوئے چار دہائیاں گزر چکی تھیں لیکن ان تین سیاحوں کے قتل نے یہودیوں میں خوف و ہراس اور دہشت کی نئی لہر پیدا کر دی۔ ان سیاحوں کو کچھ دیر ان کی کشتی پر ہی یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا اور انہیں اجازت دی گئی تھی کہ اپنی خواہش یا وصیت تحریر کر دیں۔ سب سے پہلے ماری جانے والی ایک خاتون تھی، جس کے پیٹ میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس کے دو مرد ساتھیوں سے کہا گیا کہ اس کی لاش کشتی سے اٹھا کر سمندر میں پھینکیں پھر انہیں بھی ان کے سر کے پچھلے حصے میں گولیاں مار کر ختم کر دیا گیا۔

پی ایل او (PLO) اور اسرائیل کے درمیان پروپیگنڈے کی جو نفسیاتی جنگ چل رہی تھی اس میں اوّل الذکر نے کہا تینوں مقتولین موساد کے جاسوس تھے اور ایک خاص مشن پر وہاں آئے ہوئے تھے۔ پی ایل او (PLO) نے اپنی کہانی اتنے زوردار اور مؤثر طریقے سے دنیا کے سامنے پیش کی کہ یورپ کے اکثر اخبارات نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ مقتولہ عورت کو اس ایجنٹ کے طور پر شناخت کر لیا گیا جو 1973ء میں "للی ہیمر" (Lillehammer) سے تعلقات میں ملوث رہی تھی۔ حالانکہ وہ عورت اب تک زندہ تھی اور عرصے سے

موساد کی سرگرمیوں سے الگ ہو چکی تھی۔

اس وقت سے ہی عرب اخبارات بار بار انتباہ کر رہے تھے کہ ان سیاحوں کے قتل پر اسرائیل اپنا ردعمل ضرور ظاہر کرے گا اور بدلہ لے گا۔ موساد کے نفسیاتی جنگ کے شعبے نے بھی ایسی بہت سی کہانیاں پریس میں پھیلا دی تھیں جن سے لاکھوں عربوں میں خوف و ہراس پھیلانا تھا۔

لیئر جیٹ کے مسافر، جو چند گھنٹے قبل لیبیا کی کانفرنس میں اسرائیل کے خاتمے کے لئے بحث و مباحثہ کر رہے تھے، اب ستے ہوئے چہروں والے اپنے دشمن پائلٹوں کو اپنے اوپر قہرمانہ نظریں جمائے دیکھ رہے تھے۔ فائٹر جیٹ کے ایک پائلٹ نے اپنے پر پھڑ پھڑائے جس کا مطلب پوری دنیا کے پائلٹ سمجھتے ہیں کہ میرے پیچھے آؤ۔ دوسرے پائلٹ نے اپنا دستانہ پہنے ہوئے ہاتھ سے سامنے اور نیچے گلیلی (Galilee) کی طرف اشارہ کیا۔ مسافر بردار جہاز میں جو عورتیں سوار تھیں انہوں نے رونا شروع کر دیا اور مرد اپنی زندگی کی آخری دعائیں پڑھنے لگے اور باقی اپنے آپ کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے محسوس کرنے لگے۔ ان کو احساس تھا کہ ایسا ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ کفار میں اتنی طاقت اور جرأت تھی کہ انہیں فضا سے اچک لیں۔

ایک جیٹ فائٹر کے پائلٹ نے اپنی توپ سے گولیوں کا ایک برسٹ فضا میں مارا جو مسافر طیارے کے پائلٹ کے انتباہ کے لئے تھا کہ وہ مدد کے لئے شام کی ائرفورس سے ریڈیو پر رابطے کی کوشش نہ کرے جو کہ چند منٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ گولیاں برستی دیکھ کر مسافروں کا خوف اور بڑھ گیا۔ کیا وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں جو کچھ ہی عرصہ قبل عرب کے ایک ہیرو کا مقدر بنا تھا۔

تیونس پر ہوائی حملہ سے ایک ماہ قبل، اسرائیلی بحریہ کی ایک گشتی کشتی نے جس پر موساد کے ایجنٹ سوار تھے، ایک چھوٹے بحری جہاز کو، جس کا نام اپر چونٹی تھا اور جو باقاعدگی سے بیروت اور لارناکا کے درمیان سفر کیا کرتا تھا، روکا اور جہاز سے فیصل ابوشراہ، جو ایک دہشت گرد تھا اور جس کے ہاتھوں پر یہودیوں کا خون تھا، کو قابو کر کے اور باندھ کر بحریہ کی کشتی میں پھینک کر لے گئے۔ اسے اسرائیل میں انتہائی وحشیانہ تفتیش کا نشانہ بنایا گیا، پھر مختصر سماعت کے بعد اسے لمبی مدت کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسرائیل کی انتقام لینے کی فوری اور دلیرانہ کارروائیاں دنیائے عرب کے لئے معمہ بنی ہوئی تھیں۔

ایسے واقعات و حادثات غیر معمولی نہ تھے۔ موساد نے اپنی چھوٹی لیکن انتہائی تجربہ کار نیوی سے مل کر بہت سی کارروائیاں کی تھیں۔ بحری جہازوں کو روک کر مبینہ اور مشتبہ دہشت گردوں کو پکڑا تھا۔ اسرائیل کا لمبا میڈی ٹیرین ساحل نہ صرف بیداری اور ہوشیاری کا تقاضا کرتا تھا۔ اسی طرح بحیرہ قلزم بھی مسلسل نگرانی کا محتاج تھا۔ یمن میں تعینات موساد کے ایجنٹ کی مخبری پر ایک آپریشن کیا گیا تھا۔ پی ایل او نے پلان بنایا تھا کہ دھماکہ خیز مواد سے بھری ایک مچھیروں کی کشتی کو بحیرہ قلزم سے گزار کر اسرائیلی تفریحی مقام ایلات کے ساحل کے ساتھ اڑا دیا جائے جہاں بہت سے ہوٹل ایک قطار میں واقع تھے۔ اسرائیل کی ایک گن بوٹ نے اس کشتی کو راستے میں روک کر اس میں سوار دو خودکش حملہ آوروں کو قابو کر لیا، قبل اس کے کہ وہ دھماکہ کر سکتے۔

جب لیئر جیٹ شمالی اسرائیل کی طرف بڑھ رہا تھا تو مسافروں کے ذہن میں اپنے ایک ہیرو، ابوالعباس کے ایکشن کا ردعمل بھی تھا جس نے چند ماہ پہلے ہی، 2 اکتوبر 1985ء، کو اٹلی کے تفریحی بحری جہاز اچیلی لورو (Achille Lauro) کو اغوا کر لیا تھا۔ کسی تفریحی بحری جہاز پر قزاقی کی یہ واحد مثال تھی جس نے دنیا کو ورطۂ

حیرت میں ڈال دیا تھا۔ العباس نے ایک معذور یہودی، جو وہیل چیئر میں تھا اور امریکن شہری تھا اور جس کا نام لیون کلنگ ہاؤفر (Leon Klinghoffer) تھا، کروز شپ سے دھکا دے کر سمندر میں ڈبو کر ہلاک کر دیا تھا۔

اس واقعے نے ایک سفارتی ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ اسرائیل یہودی کی اور امریکن اپنے شہری کی موت پر سراپا احتجاج تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مصر، اٹلی، شام، قبرص، تیونس اور بے ریاست پی ایل او، جن کے شہری جہاز پر سوار تھے، سراپا احتجاج تھے۔ کئی روز تک میڈی ٹیرین سمندر میں یہ ڈرامہ چلتا رہا۔ ہائی جیکروں کو بے پناہ پبلسٹی ملتی رہی۔ اسرائیل کی معیشت کا انحصار بڑی حد تک سیاحت اور اس کے ذریعے آنے والے غیر ملکی زر مبادلہ پر تھا جو یکدم یہودی سیاح کی موت کے بعد سیاحوں کی آمد بند ہونے سے رک گیا۔ اسرائیلی حکومت کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور وہ اس بارے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ قتل کی یہ واردات دراصل تکنیکی طور پر اٹلی کی سرزمین پر ہوئی تھی کیونکہ کروز شپ آشیلو لورو جنیوا میں رجسٹرڈ تھا۔ اٹلی کی پوزیشن بڑی نازک تھی اور وہ اس حادثے کا کوئی پُرامن حل دیکھنا چاہتا تھا۔ امریکہ اپنے مقتول شہری کے لئے انصاف مانگتا تھا۔ آخر کار ہائی جیکروں نے کئی روز تک دنیا بھر کے اخبارات کی شہ سرخیاں بنے رہنے کے بعد، اپنے آپ کو مصری حکام کے حوالے کر دیا جنہوں نے انہیں ملک چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اس پر اسرائیل بہت تلملایا۔

لیئر جیٹ کے ایک سے زائد مسافروں کا خیال تھا کہ اسرائیل انتقام لینے کے لئے انہیں جیل میں ٹھونس دے گا۔ اسرائیلی فائٹر جیٹ ابھی تک مسافر جہاز کے پروں سے پر ملائے اڑ رہے تھے تاوقتیکہ مسافر طیارہ شمالی گلیلی کی ملٹری ائرفیلڈ پر اتر گیا۔ ائرفیلڈ پر ملٹری انٹیلی جنس "امان" (Aman) کے تفتیش کاروں کی ٹیم منتظر کھڑی تھی، جنہیں موساد کے ایجنٹوں نے بتایا تھا کہ جہاز کے اوپر دنیا کے دو مانے ہوئے وحشت گرد ابوعدال اور مشہور و معروف وحشت گرد احمد جبریل مسافروں میں موجود ہیں۔ ان کی بجائے تفتیش کنندگان کو ایسے خوفزدہ اور سہمے ہوئے عربوں سے سوال و جواب کرنا پڑے، جن میں سے کسی کا نام بھی کمپیوٹر میں موجود وحشت گردوں کی فہرست میں موجود نہ تھا۔ لہٰذا لیئر جیٹ کو اپنے مسافروں سمیت جانے کی اجازت دے دی گئی۔

بعد میں اسرائیل وضاحتیں پیش کرتا رہا کہ جہاز کو روکنے کا اس کا واحد مقصد وحشت گردوں کو قابو کرنا تھا لیکن موساد کے اندر یہ خیال پایا جاتا تھا کہ عربوں کے اندر خوف و ہراس پیدا کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں جانا چاہئے۔ امان کے تفتیش کنندگان اس بات پر مطمئن تھے، جہاز کے مسافر اسرائیل کے ایک طاقتور ملک ہونے کے تصور کو عربوں میں پھیلانے کا باعث بنیں گے۔

تاہم امان کے سربراہ ایہود باراک (Ehud Barak) کو یقین تھا کہ یہ آپریشن موساد کی ادھوری اور غیر مصدقہ اطلاع کا نتیجہ تھا اور یہ بات اس نے موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی (Nahum Admoni) پر واضح کر دی تھی۔

کسی بھی شخص کو اپنی غلطی پر ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ موساد کے سربراہ نے ایک نئے آپریشن کی شروعات کا آغاز کر دیا جس سے نہ صرف عرب ریڈیو پر موساد کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اس کا خاتمہ ہونا تھا، کہ موساد نے ادھوری مخبری پر ایک سویلین جہاز کو زمین پر اترنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کے درمیان جو ایک دوسرے کے پر کاٹنے کی کشمکش پیدا ہو رہی تھی اس کے خاتمے کے لئے بھی

ضروری ہو گیا تھا کہ اگلے آپریشن کے بعد وہ اس قسم کی بے وقوفی سے اپنا مذاق نہ بنا سکیں۔

سو ایسے آپریشن کا آغاز کر دیا گیا جس نے بہت سی دیگر چیزوں کے علاوہ ایک آئرش (Irish) حاملہ ہوٹل ملازمہ کی زندگی تباہ کر دی بلکہ اس کے عرب عاشق کو بھی عدالت برطانیہ کی طرف سے بہت لمبی قید کی سزا سنائی گئی، جس سے جرمن چانسلر ہیلمٹ کوہل (Helmut Kohl) کو پریشانی اٹھانا پڑی اور فرانسیسی وزیراعظم جیکس شیراک (Jacquos Chirac) کو شرمندہ ہونا پڑا۔ ایک دفعہ پھر رابرٹ میکسویل کے سازشی ذہن کا انکشاف ہوا، شام کو سفارتی تعلقات سے محروم ہو کر بے دخل اور عرب ریڈیو اسٹیشنوں کو جو موساد کی ناکامی کے شادیانے بجاتے تھے، اپنا لب و لہجہ تبدیل کرنا پڑا۔

جیسا کہ ہر آپریشن کے دوران ہوتا ہے، اس دوران کئی مواقع پر بہت زیادہ گھبراہٹ اور پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑا اور بہت زیادہ صبر و تحمل سے بھی کام لینا پڑا۔ اس میں مایوسی، امید، اشتعال، دھوکہ دہی اور بے وفائی کے بھی کئی لمحات، انسانی فطرت کے مطابق، آتے رہے لیکن تاہم ایڈمونی جیسے شخص کے لئے یہ پلان یا منصوبہ زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا تھا۔ پلاننگ اور منصوبہ بندی کے دوران وہ خود بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا رہتا تھا کہ کیا یہ کامیاب ہوگا؟ کیا دوسرے لوگ یقین کرلیں گے کہ ایسی طرح ہوا تھا؟ اور آخری بات کہ حقیقی سچائی ہمیشہ کے لئے پوشیدہ رہ سکے گی؟

اس آپریشن کے لئے موساد نے دو آدمیوں پر نئی مہارت اور تکنیک آزمانے کی کوشش کی تھی۔ ایک تو ایسا ایجنٹ تھا جو برطانیہ میں جعلی نام توف لیوی (Tov Levy) کے نام سے خدمات انجام دے چکا تھا۔ دوسرا ایک فلسطینی مخبر تھا جس کا کوڈ نام ابو تھا۔ ابو (Abu) کو اردن اور اسرائیل کی سرحد پر واقع ایک گاؤں سے بھرتی کیا گیا تھا، جس کے بارے میں موساد کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے فلسطینیوں کے اس فنڈ میں خورد برد کی تھی جس کا وہ گاؤں میں منتظم بنایا گیا تھا۔ ابو کو خوفزدہ کر کے کہ اس کے جرم کا بھانڈہ گاؤں کے نمبردار کے سامنے پھوڑ دیا جائے گا جس کے نتیجے میں ابو کو موت کی سزا کا سامنا ہو سکتا تھا، موساد نے اسے آمادہ کیا کہ وہ لندن بھاگ جائے، جو اس نے مان لیا۔ ایک تاجر کے طور پر اس کے جعلی کاغذات تیار کیے گئے۔ ایک امیر اور دولتمند کاروباری شخص کی حیثیت بڑے جواری کے طور پر اخراجات کے لئے رقم دی گئی اور اسے لندن میں توف لیوی (Tov Levy) کے پاس بھیج دیا گیا۔

لندن میں ایک سابقہ انٹیلی جنس ایجنٹ اوزی مہنیمی (Uzi Mahnaimy) نے ابو کی آزمائش کی اور اسے ہر لحاظ سے کامیاب پایا۔ اسرائیلی خفیہ سروس کے اس سابقہ ایجنٹ نے ابو کو بتایا کہ ایجنٹ کیا ہوتا ہے۔ ”تم اس کے ساتھ گھنٹوں بلکہ دنوں تک اٹھو بیٹھو، اسے ہر وہ چیز بتاؤ اور سکھاؤ بس کی اسے ضرورت ہو۔ اس کے ساتھ گھل مل جاؤ، اس کے خاندان کی تصویریں دیکھو، اس کے بچوں کے نام اور عمریں یاد کرلو لیکن ایجنٹ ایک انسان نہیں ہوتا، لہٰذا کبھی بھی اسے گوشت پوست کا انسان نہ سمجھو۔ ایجنٹ ایک ہتھیار ہوتا ہے جیسے کلاشنکوف، جس کا کام ختم کرنا یا ختم ہونا ہوتا ہے۔ اگر اسے کسی درخت کے ساتھ پھانسی پر جھولنے کے لئے بھیج دیا جائے تو وہ اس کے خلاف سوچ تک نہیں۔ ایجنٹ ایک خفیہ ہتھیار ہوتا ہے، انسان نہیں“۔

ابو نے اپنا کردار انتہائی مہارت سے ادا کیا اور وہ جلد ہی مے فیئر (Mayfair) کے علاقے کے جوا خانوں کی میزوں کا ایک معروف شخصیت بن گیا۔ اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اس کی زیادہ پینے کی عادت اور جنسی رغبت سے اغماض برتا گیا۔ فلسطینیوں کے حلقوں

میں گھومتے پھرتے وہ اسلحہ ڈیلروں اور ان کے امیر فلسطینی حمایتیوں کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ اس کی اطلاع پر موساد کے ہاتھوں 15 پی ایل او ارکان چند ہفتوں کے دوران مارے گئے۔

ابو کی چند ملاقاتیں توف لیوی کے ساتھ پارک لین میں واقع ہلٹن ہوٹل کی بار اور ریسٹورنٹ میں ہوتی تھیں۔ وہاں ایک لڑکی، این میری مرفی کام کرتی تھی، جس کا تعلق ڈبلن، آئرلینڈ سے تھا۔

بہت سے دوسرے آئرش شہریوں کی طرح بہت سا پیسہ کمانے کی ہوس این کو لندن لے آئی تھی جو نوکری وہ حاصل کر سکی وہ صرف ہوٹل کی روم سروس کی تھی۔ تنخواہ کم، اوقات کار طویل تھے۔ اسے جو فالتو وقت ملتا تھا وہ شیفرڈ ڈسٹرکٹ کے علاقے کی باروں میں، جہاں آئرش مہاجرین کی اکثریت تھی، گزارتی تھی۔ وہاں وہ ایک آدھ گلاس آئرش شراب کے بدلے میں گانے بھی گا لیتی تھی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں تنہا، اپنے اگلے طویل دن کی ڈیوٹی کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی ڈیوٹی کے دوران اسے کمروں کے بستروں کی چادریں بدلنا، ٹائلٹ صاف کرنا اور چمکانا اور کمرے کی ہر چیز کو ہلٹن ہوٹل کے معیار کے مطابق صاف کرنا ہوتا تھا۔ اس کام میں اسے ترقی کا کوئی موقع نظر نہیں آتا تھا۔

1985ء کی کرسمس کے کچھ ہی روز پہلے این میری کے اس خیال کے آتے ہی آنسو بہنے لگے کہ لندن جیسے شہر میں اسے کرسمس کا تہوار تنہا منانا پڑے گا۔ یہ شہر ڈبلن (Dublin) جیسے گہما گہمی والے شہر سے بالکل ہی مختلف تھا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات گہری رنگت والے ایک عربی نوجوان سے ہوگئی جو اس کی نظر میں خوبصورت تھا۔ وہ ریشمی سوٹ اور چمکدار ٹائی پہنے ہوئے تھا جس سے اس کی امارت جھلکتی تھی۔ جب اس نے مسکرا کر این کی طرف دیکھا تو اس نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ نوجوان کا نام تھا نذار ہنداوی (Nezar Hindawi) اور وہ دور کے رشتے سے ابو کا کزن تھا۔ ہنداوی کی عمر 35 سال تھی لیکن اس نے اپنی عمر 3 سال کم کر کے این کو 32 سال بتائی جو این کی اپنی عمر تھی۔ وہ سادہ لوح این کے سامنے ہمیشہ جھوٹ بولا کرتا تھا۔

ان کی ملاقات ایک بار میں جو بی بی سی تھیٹر (BBC Theartre) کے قریب شیفرڈز بش گرین کے علاقے میں واقع تھی، ہوئی تھی۔ وہ اس بار میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران تھی ہنداوی اس بلڈنگ کے سرخ سفید چہروں والے اس کے علاقے آئرلینڈ کے مختلف علاقائی لہجوں میں بات کرنے والے ہم وطنوں میں گھل مل رہا تھا۔ وہ کئی شرابیوں کو جانتا تھا، ان کے بیہودہ ہلسی مذاق میں شامل ہوتا تھا اور ان کے درمیان نمایاں نظر آتا تھا۔

کئی ہفتے سے ہنداوی اس بار میں آ رہا تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح آئرش ری پبلک آرمی (IRA) سے رابطہ قائم کر سکے (جو آئرلینڈ کی دہشت گرد تنظیم تھی)۔ ابو نے اسے ایسا کرنے کے لئے کہا تھا۔ حالانکہ اس کے کزن نے اسے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ ہنداوی نے چند بار وہاں آنے والے اپنے جاننے والوں سے آئرلینڈ کی سیاسی صورت حال بارے بات چیت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ شراب پینے والوں نے گلاس چڑھانے کے علاوہ کوئی بات نہیں کی اور نہ کسی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ابو کے ذہن میں جو بھی سکیم تھی ہنداوی اس سے بالکل ہی بے خبر تھا۔ این میری (Ann Mario) کی آمد نے اسے کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ہنداوی کے ہنس مکھ اور خوشگوار رویے سے متاثر ہو کر وہ جلد ہی اس کی مڈل ایسٹ میں گزری ہوئی زندگی کی کہانیاں سن کر اس کے ساتھ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئی۔ ایک ایسی عورت جس نے زندگی میں لندن سے آگے تک

سفر ہی نہ کیا ہو، اُسے ہنداوی کی کہانیاں "ہزار داستان" کی کہانیاں لگ رہی تھی۔ اس رات ہنداوی اسے رات کو اس کے گھر تک چھوڑنے اپنی گاڑی میں لے گیا، اس کے دونوں گالوں کے بوسے لئے اور این یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اس نے ان لمحات میں اپنے جسم میں جو سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس کی کیا وہ کسی سے پیار ہونے کی پہلی علامت ہے۔ اگلے روز وہ این کو دوپہر کے کھانے کے لئے ایک شامی ریسٹورنٹ میں لے گیا اور این کو پہلی مرتبہ عربوں کے اشتہا انگیز لذیذ کھانوں سے متعارف کرایا اور ساتھ ساتھ لبنانی شراب سے بھی۔ کھانے کے بعد ہنداوی جب این کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا تو این نے معمولی مزاحمت بھی نہیں کی۔ اس شام انہوں نے پہلی مرتبہ پیار کیا۔ اس لمحے تک این میری کنواری تھی کیونکہ اس کی پرورش اور نگہداشت آئرلینڈ کے کیتھولک مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جہاں شادی سے پہلے جنسی تعلقات اور مانع حمل طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

فروری 1986ء میں این میری کو محسوس ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔ اس نے ہنداوی کو بتایا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ معاملات سنبھال لے گا۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں این نے کہا کہ وہ ابورشن (Abortion) پر کبھی راضی نہ ہوگی۔ (کیونکہ کیتھولک مذہب میں یہ ممنوع اور گناہ تھا) ہنداوی نے اسے کہا کہ یہ خیال تو کبھی اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں (کہ ابورشن کرایا جائے) حقیقت یہ تھی کہ اندر سے ہنداوی بھی خوفزدہ اور پریشان تھا۔ اس کے لئے یہ سوچنا بھی مشکل تھا کہ وہ کسی ایسی عورت سے بیاہ رچائے، جو اس کے مرتبے اور سماجی رتبے سے کمتر ہو۔ اس کو اب یہ بھی خوف تھا کہ وہ حکام کے پاس جا کر اس کے خلاف شکایت لگا دے گی۔ اس صورت میں برطانوی حکام پتہ نہیں کس

طرح کا رویہ اختیار کریں گے؟ وہ سوچنے لگا کہ شاید ایسی صورت میں اس کے برطانیہ میں ٹھہرنے کا اجازت منسوخ کر کے اور بطور سزا ملک سے نکال دیا جائے اور ناپسندیدہ شخص قرار دے دیا جائے۔ اب ہنداوی کے پاس مدد حاصل کرنے اور صلاح مشورے کا ایک ہی وسیلہ تھا اس کا دور کے رشتے کا کزن...... ایو۔

ایو اپنے مسئلے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ وہ موساد سے گزر اوقات کے لئے ملنے والی بڑی رقم جوئے میں ہار چکا تھا۔ اس نے ہنداوی کو صاف جواب دے دیا کہ وہ اسے کوئی رقم ادھار نہیں دے سکتا۔ ہنداوی نے فیصلہ کیا کہ وہ این میری کو اس بات پر آمادہ کرے گا کہ وہ ڈبلن واپس چلی جائے۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ بچے کو کسی کو گود لینے کے لئے پیش کر دے جس کی وہاں کے قانون میں اجازت تھی اور این نے ہی اسے بتایا تھا کہ یہ وہاں ایک عام روایت تھی۔

اگلے روز ایو کی توف لیوی سے رات کے کھانے پر ملاقات ہوئی۔ موساد کے ایجنٹ نے ایو کو بتایا کہ وہ کوئی ایسی سازش تیار کرنا چاہتا ہے کہ برطانوی حکومت شامی سفارتخانے کو بند کر کے اس کے عملے کو دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزامات لگا کر ملک بدر کر دے۔ لیوی نے کہا کہ اسے کوئی ایسا کانٹا چاہئے جس سے یہ سازش پایۂ تکمیل تک پہنچائی جا سکے۔ کیا ایو اسے کوئی ایسی بات یا کسی ایسے شخص کے بارے میں بتا سکتا ہے جو اس بارے میں مددگار ثابت ہو سکے؟ ایو نے اپنے کزن کا ذکر کر دیا جس کی گرل فرینڈ حاملہ ہے اور دونوں لندن میں رہتے ہیں اور لڑکی آئرلینڈ کی رہنے والی ہے۔

سازش کا تانا بانا، اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی میں آنے والے ان جھٹکوں کے بعد تیار ہونے لگا، جن کا انکشاف واشنگٹن سے، یرغمالیوں کے بدلے ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی سے ہوا تھا۔ اسرائیل کے دہشت گروں سے سختی سے نمٹنے کے موقف کو اس انکشاف سے سخت جھٹکا لگا تھا۔ موساد کے اندر اس بات پر سخت اشتعال پایا جاتا تھا کہ ریگن انتظامیہ نے ایران گیٹ کے سلسلے میں اسرائیل کے خفیہ کردار کا انکشاف کر دیا تھا۔

اس انکشاف نے اسرائیل کے لئے ان قدرے دوست ملکوں کی حمایت و مدد سے بھی محتاط کر دیا، جو پی ایل او کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور یاسر عرفات کے جارحانہ رویے سے نالاں ہو چکے تھے، مثلاً مصر اور اردن دراصل پی ایل او رہنما خود اپنے انتہا پسند ساتھیوں کا سیاسی یرغمالی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ خود تو مارکسی نہیں تھا لیکن ایسے لوگوں کے گھیرے میں آ چکا تھا جو اس کے منہ سے ایسے جذباتی نعرے اگلوا رہے تھے۔ ”صیہونیت کا مکمل خاتمہ، سیاسی طور پر، ثقافتی طور پر اور فوجی حیثیت سے“۔

لیکن یاسر عرفات کی چیخ و پکار کا پی ایل او سے الگ ہو جانے والے دھڑوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کے خیال میں یاسر عرفات پر دباؤ ڈال کر ذلت آمیز طریقے سے، اقوام متحدہ کی زیر نگرانی، بیروت سے انخلاء پر، اسرائیل کی چوکنا نظروں کے سامنے مجبور کیا گیا تھا۔ تقریباً 15 ہزار فلسطینی لڑاکا جوان کشتیوں میں بیٹھ کر تیونس (Tunis) کی طرف چلے گئے تھے، باقی رہنے والوں نے یاسر عرفات کو چھوڑ کر شام کی مدد اور تعاون سے دمشق کے اردگرد اپنے ٹھکانے بنا لئے تھے۔ وہ اب یاسر عرفات کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے پہلے سے زیادہ ویری بن گئے تھے۔

اس کے باوجود موساد کی نظر میں، امن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یاسر عرفات ہی تھا اور اس کا قتل اس ایجنسی کی اولین ترجیح تھی۔ موساد کے نشانے بازی کے سب اہداف یاسر عرفات کے تھے۔ جب تک یہ مرتا نہیں تھا، شام میں مقیم فلسطینی گروپ اپنی وحشیانہ کارروائیاں جاری رکھیں گے۔

پھر دو ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے وقتی طور پر موساد کی توجہ عرفات سے ہٹا دی اور ایک ایسی سازش تیار کرلی گئی جس میں بنیادی کردار ابو کا تھا۔

شام میں مقیم اور اس کی پناہ میں فلسطینی گروپ، اس کے لئے مسئلہ بنتے جا رہے تھے کیونکہ وہ شام پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہتے تھے کہ اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کرے۔ حکومتی سطح پر دہشت گردی کے ایک بڑے سرپرست کی ہونے کی حیثیت سے، شام ہر ایکشن کی مالی مدد کرنے کو تو ہمہ وقت تیار تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دنیا میں اس کی پہلے سے ہی داغدار تصویر پر مزید دھبے لگے۔ فلسطینی گروپوں کی طرف سے شامی انٹیلی جنس ایجنسی کے سامنے پیش کئے جانے والے ایکشن پلان بہت زیادہ خطرناک تھے، لہٰذا ان پر عمل درآمد کی اجازت دینا شامی حکومت کے لئے ممکن نہ تھا۔

ایک منصوبہ اسرائیل کو سپلائی ہونے والے پانی میں زہر ملانے کا تھا۔ دوسرا منصوبہ کسی عرب خودکش بمبار کو، آرتھوڈوکس، کٹر مذہبی یہودی کے بھیس میں یروشلم بھیجنے کا تھا تاکہ وہ وہاں دیوار گریہ کے سامنے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا لے، ہر صورت میں اسرائیل کی طرف سے خوفناک ردعمل یقینی تھا۔

پھر ایک اور خوفناک منصوبہ سامنے آیا جسے شامی انٹیلی جنس ایجنسی نے نہ صرف قابل عمل قرار دیا بلکہ اس سے اسرائیل کی فوجی لحاظ سے بڑائی پر بھی شدید ضرب لگ سکتی تھی۔ پہلے قدم کے طور پر ایک بحری جہاز کی خریداری تھی۔ میڈی ٹیرین سمندر کی بندرگاہوں کی کئی ہفتوں کی تلاش کے بعد، پانامہ (Panama) میں رجسٹر شدہ اتاوارئس (Atavarius) نامی جہاز خرید لیا گیا اور اسے الجیرز (Algeirs) کی بندرگاہ پر لایا گیا۔

جہاز کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد شام ائرفورس کے ایک ٹرانسپورٹ طیارے میں فلسطینی کمانڈوز کا ایک دستہ دمشق سے یہاں پہنچ گیا۔ اپنے ساتھ وہ کچھ ہتھیار بھی لے کر آئے تھے، جن مشین گنیں، اینٹی ٹینک (ٹینک شکن) اسلحہ، چند صندوق کلاشنکوف بندوقیں، جو دہشت گردوں کا پسندیدہ ہتھیار تھے۔ اسی رات، اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کمانڈوز نے تمام اسلحہ بحری جہاز پر منتقل کر دیا۔

صبح ہوتے جہاز اتاویرس چل پڑا۔ کیپٹن نے پورٹ اتھارٹیز کو بتایا کہ وہ جہاز کے انجن کے اوور ہال کے لئے یونان جا رہا ہے۔ کمانڈوز جہاز کے نچلے حصے میں تھے لیکن ان کی آمد چھپی نہ رہ سکی۔ موساد کا ایک مخبر ہاربر ماسٹر (Harabor Master) کے دفتر میں ملازم تھا۔ جسے شک گزرا اور اس نے مقامی ایجنٹ کو اطلاع کر دی، جو شہر میں تعینات تھا۔ ایجنٹ نے پیغام تل ابیب بھیج دیا۔

اس اطلاع پر فوراً خطرے کی "علامت میلو" نافذ کر دی گئی اور میڈی ٹیرین سمندر میں موساد کے پورے نیٹ ورک کو چوکنا کر دیا گیا۔ ایلات (Elat) کے ساحل کو دھماکے سے اڑانے کی یاد ابھی تازہ تھی، لہٰذا یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یہ بھی اسی قسم کی کوشش ہوگی، شاید اب نشانہ حیفہ (Haifa) کی بندرگاہ ہوگی۔ میڈی ٹیرین سمندر کی یہ سب سے معروف ترین بندرگاہ تھی جو دہشت گردی کا ہدف بن سکتی تھی۔ اسرائیلی بحریہ کی دو گن بوٹ بندرگاہ کے باہر تعینات کر دی گئیں تاکہ وہ اتاویرس کی بندرگاہ میں داخلے کی کوشش کا سدباب کر سکیں۔ حیفہ اسرائیل کی دنیا سے تجارتی رابطے کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔

اتاویرس کی منزل مقصود وہ ساحلی تفریح گاہ تھی جو تل ابیب کے شمال میں تھی۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جو بالی ووڈ کی فلموں سے حاصل کیا ہوا لگتا تھا۔ اتاویرس نے کمانڈوز کو ربڑ کی کشتیوں میں سمندر میں اتارنا تھا جنہیں وہ ساحل کی طرف لے جائیں گے۔ پھر وہ لڑتے بھڑتے

تل ابیب کی طرف راستہ بنائیں گے اور وفاقی افواج کے ہیڈ کوارٹر "کیریا" (Kirya) پر حملہ آور ہوں گے جو ایک قلعہ نما عمارت ہے، جس کا بلند مینار آسمان کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، جو کمانڈوز کی رہنمائی کا کام دے گا۔ منصوبے کی کامیابی کا انحصار اچانک حملے اور بے پناہ جرأتمندی پر تھا، جس کا مظاہرہ اسرائیلی خود بھی کرتے رہتے تھے۔

حملے کے لئے اسرائیل کے یوم آزادی کا دن منتخب کیا گیا تھا۔ جبکہ لوگ خوشیاں منا اور موج میلہ کر رہے ہوں گے اور شام کی انٹیلی جنس ایجنسی کے مطابق، وفاقی ہیڈ کوارٹرز کیریا کی حفاظت کے لئے عام دنوں کی نسبت، بہت تھوڑے گارڈ ہوں گے۔ ان کمانڈوز کو اپنے زندہ بچ نکلنے کی تو امید نہ تھی۔ ان کا انتخاب بھی اسی لئے کیا گیا تھا کہ ان کی ذہنیت بھی بیروت (Beirut) کے خودکش حملہ آوروں جیسی ہی تھی۔

بحری سفر کے دوران کمانڈوز اس بحری سفر کے مزے اڑا سکتے تھے۔ ان کا جہاز تیونس سے ہوتا ہوا سسلی (Cicily) کے جزیرے پر پہنچا تھا۔ جہاز پر سوار والوں کسی نے بھی ان مچھیروں کی کشتی کی طرف توجہ نہیں دی جو وہاں کے پانیوں میں چکر لگا رہی تھی جب جہاز اس کے پاس سے گزرا۔ یہ کشتی جدید ترین برقی آلات سے مسلح اور جہاز سے ریڈیو (وائرلیس) کے ذریعے ہونے والی گفتگو سننے اور ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جہاز سے عربی زبان میں ایک مختصر پیغام میں کہا گیا کہ وہ اپنے مقررہ نظام الاوقات کے مطابق سفر کر رہے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کی کشتی میں موساد کے ایجنٹ، عملے کے طور پر سوار تھے۔ جن میں سے ایک نے یہی خبر تل ابیب کو ریڈیو پر پہنچا دی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں موساد کی ایک دوسری کشتی نے اتاویریس پر نظر رکھی جب وہ کریٹے (Crete) اور جزائر قبرص کے قریب سے گزرا۔

ایک تیز رفتار تفریحی کشتی نے اتاویریس کا راستہ کاٹا۔ اس پر بھی جدید ترین الیکٹرانک آلات، سننے کی صلاحیت والے آلے اور وہیل ہاؤس (Wheel House) کے ساتھ ایک طاقتور کیمرہ لگا ہوا تھا۔ کشتی کے عرشے پر دو نوجوان اور خوبصورت عورتیں، اپنے مختصر ترین لباس میں، غسل آفتابی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں عورتیں قبرص میں موساد کے مخبر جو اس تفریحی کشتی (یاٹ) کا مالک بھی تھا، کی قریبی رشتہ دار تھیں، جنہیں وہ جہاز والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بطور چارا استعمال کر رہا تھا۔ جیسے ہی تفریحی کشتی جہاز کے قریب سے گزری کئی کمانڈوز لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے اتاویریس کے عرشے کی ریلنگ (Railing) پر آ گئے اور لڑکیوں پر آوازے کسنے اور ان پر اپنی مسکراہٹیں نچھاور کرنے لگے۔ موساد کے مخبر نے وہیل ہاؤس میں لگا کر کیمرہ آن کر دیا تاکہ اشارہ بازی کرتے ہوئے مردوں کی تصویریں اتار سکے۔ اس کا سراغ رسانی کا اپنا کام مکمل ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی کشتی ساحل کی طرف بھگا لے گیا۔ اس نے قبرص میں اپنے گھر جا کر فلم ڈیولپ کی اور تصویریں تار کے ذریعے تل ابیب (Tel Aviv) بھیج دیں۔ موساد کے کمپیوٹر نے تین چہروں کو عرب کے مشہور دہشت گردوں کی حیثیت سے شناخت کر لیا۔ لہٰذا خطرے کے نشان پیلے (ییلو) کو ریڈ (سرخ) میں بدل دیا گیا۔

اسرائیلی وزیراعظم شمعون پیریز (Shimon Peres) نے حکم دیا کہ اتاویریس پر حملہ کر دیا جائے۔ جہاز پر بمباری کرنے کا ایک پلان بنایا گیا لیکن رد کر دیا گیا۔ اچانک ہوائی حملے کی صورت میں مصر یہ خیال کر سکتا تھا کہ اس پر اچانک حملہ کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات، کئی چھوٹے بڑے حادثات کے باوجود قائم رہے تھے لیکن اس وقت قاہرہ

میں اسرائیلی عزائم بارے بہت زیادہ شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ اس لئے پیریز نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ جہاز اتاویریس پر حملہ ائرفورس کی بجائے بحریہ سے کرایا جائے۔

چھ اسرائیلی بحریہ کی گن بوٹس میں ایندھن بھرا گیا اور راکٹ لادے گئے۔ ان کشتیوں پر آئی ڈی ایف سپیشل فورسز کے یونٹ اور موساد کے ایجنٹ سوار تھے جنہوں نے زندہ پکڑے جانے والے کمانڈوز سے پوچھ گچھ اور تفتیش کرنی تھی۔ گن بوٹس صبح سویرے حیفہ کی بندرگاہ کی طرف چل پڑیں جہاں سے وہ مغرب کی سمت میڈی ٹیرین سمندر میں نکل گئیں۔ وہ کھلے سمندر میں ایسی فارمیشن میں تیز رفتاری سے جا رہی تھیں کہ اگر جہاز اتاویریس میں راڈار سسٹم موجود ہو تو ان کا سراغ نہ لگا سکے۔ اسرائیلیوں نے جہاز پر حملے کے لئے صبح سویرے، اپنی پشت پر طلوع آفتاب کا وقت مقرر کر لیا۔

صبح تقریباً 6:30 بجے اتاویریس کو دیکھ لیا گیا۔ گن بوٹس نے دو طرف سے جہاز کے عرشے اور پیندے پر راکٹ برسانے شروع کر دیئے۔ عرشے سے کمانڈوز نے بھی جوابی فائرنگ کی لیکن ان کا بھاری اسلحہ تو نیچے کریٹوں میں بند پڑا تھا اور چھوٹے ہتھیاروں سے بھاری اسرائیلی فائرنگ کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ چند ہی منٹوں میں اتاویریس شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور اس کے عملے اور کمانڈوز نے جہاز سے نکلنا شروع کر دیا۔ چند ایک جو سمندر میں کودے، گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

کل ملا کر 20 عملے کے افراد اور کمانڈوز مارے گئے۔ ان سب کی لاشیں اکٹھی کر لی گئیں۔ آٹھ کو زندہ پکڑ کر قیدی بنا لیا گیا۔ واپس اسرائیل کی طرف دوڑ لگانے سے قبل گن بوٹس نے اتاویریس پر راکٹ مار کر ڈبو دیا۔ اس کے اگلے حصے میں پہلے ہی دھماکہ خیز بارودی مواد لگا ہوا تھا۔

مرنے والوں کی لاشیں کسی مذہبی رسوم (نماز جنازہ) کے بغیر نیگیو صحرا (Negev Desert) میں دبا دی گئیں۔ قیدیوں کے خلاف خفیہ مقدمہ چلایا گیا اور انہیں لمبی قید کی سزا سنا دی گئی۔ تفتیش اور پوچھ گچھ کے دوران انہوں نے پوری طرح شام کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بجائے اس کے کہ اسرائیل اپنے ہمسائے پر حملہ کرتا، موساد کے مشورے سے اس تمام واقعے کو خفیہ ہی رکھا گیا۔ موساد کے نفسیاتی جنگی شعبے کا خیال تھا کہ اچانک جہاز کی گمشدہ اور کمانڈوز کی طرح سے پیغام رسانی کا انقطاع شام میں موجود پی ایل او کے حلقوں اور گروپوں میں یقینی طور پر خوف، تشویش، سوچ بچار اور گھبراہٹ کا باعث بنے گی۔ موساد نے اپنے وزیراعظم پیریز کو بھی خبردار کیا کہ ایک بات یقینی تھی کہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا، دہشت گرد دوبارہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل کر اپنے سرپرستوں کی نظر میں خفت مٹانے کی کوشش کریں گے۔

اس دوران فلسطینیوں اور یاسر عرفات کے درمیان چپقلش جاری رہی اور اس کے خلاف اس کے ماضی کے قریبی ساتھی، ابوندال (Abu Nidal) کی طرف سے شروع کی گئی سخت مخالفت کی تحسین کی جاتی رہی۔ ابو ندال کو دہشت گردی کا سب سے بڑا منصوبہ ساز اور خفیہ ہاتھ مانا جاتا تھا لیکن وہ یاسر عرفات کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے اس سے الگ ہو گیا تھا۔

عرفات آہستہ آہستہ اس خیال کی طرف آ رہا تھا کہ ایک ایسی تحریک جو صرف دہشت گردی پر مبنی ہو، آخرکار ناکامی سے دوچار ہو گی۔ اب ایک سیاسی پروگرام اور سفارتی لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اب وہ اپنے ان خیالات کو عوامی اجتماعات اور سیاسی بیانات میں بھی پیش کرنے لگا تھا اور امریکہ کی طرف سے اس کے نئے خیالات کو پذیرائی اور حوصلہ افزائی ملنے لگی تھی۔ اسرائیل

میں یاسر عرفات کے الفاظ کو محض دکھاوا اور مصنوعی تبدیلی سمجھا جارہا تھا۔ ابو ندال کی نظر یہ کچھ نہیں، صرف اپنے اس موقف سے انحراف، جس کے لئے وہ جدوجہد کرتا رہا تھا۔ نگی اور کھلی دہشت گردی۔

ندال کئی ماہ تک خاموشی سے سوچ بچار کرتا رہا۔ جب اس نے سنا کہ اتاوبریس مشن ناکام ہوگیا ہے اور کس پُر اسرار طریقے سے جہاز دنیا کے نقشے سے غائب ہوگیا ہے، تو اس نے فیصلہ کیا کہ اسرائیل کو یاد دلا دیا جائے کہ وہ ابھی بدستور موجود ہے۔ شامی انٹیلی جنس میں اپنے سرپرستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ابو ندال نے چوٹ لگائی اور انتہائی خوفناک چوٹ لگائی۔ روم، روم اور ویانا کے ہوائی اڈوں پر کرسمس کے موقع پر، دسمبر 1985ء میں، اس کے بندوق برداروں نے مسافروں پر اندھادھند فائر کھول دیا۔ دونوں ہوائی اڈوں پر، اسرائیلی ہوائی کمپنی ایل آل (El al) کے چیک ان (Check-in) کاؤنٹر پر چند سیکنڈ میں 19 مسافر ہلاک کردیئے گئے جن میں 5 امریکی بھی شامل تھے۔ یہ دہشت گرد کس طرح اٹلی کی پولیس کی نگاہوں سے بچ کر اپنے ہدف تک پہنچے؟ ایل آل کے اپنے سکیورٹی گارڈ کہاں تھے؟

جبکہ ان اہم سوالوں کے جواب تلاش کئے جارہے تھے، موساد کے وفاقی پالیسی ساز کچھ دیگر امکانات پر غور کررہے تھے۔ اگرچہ برطانیہ نے ان حملوں کی مذمت میں دوسروں کا ساتھ دیا تھا لیکن اس کے اب بھی شام کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات بحال تھے، حالانکہ موساد نے شام کے خلاف، سرکاری سرپرستی میں دہشت گردی کی کارروائیوں کے بے شمار ثبوت برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی ایم آئی 5 (MI5) کو پیش کئے تھے۔ برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کا دہشت گردی کے خلاف پارلیمنٹ میں زوردار مذمتی بیان (اسرائیل کے نزدیک) کافی نہیں تھا۔ ضرورت کسی مزید سخت اقدام کی تھی۔ تاہم ایم آئی 5 موساد کو باور کراتی رہی تھی کہ ماضی میں ضرورت کے وقت اور اپنے مفاد کی خاطر اسرائیلی حکومت خود اپنے شدید ترین دشمنوں کے ساتھ سودابازی اور لین دین کرتی رہی ہے۔ روم اور ویانا ائرپورٹ پر حملے سے صرف ایک مہینہ پہلے اسرائیل نے لبنان میں قید اپنے تین فوجیوں کی رہائی کے بدلے میں ہزاروں فلسطینیوں کو، جن میں بہت سے سزایافتہ مجرم بھی تھے۔ اسرائیلی جیلوں سے رہا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن اب موساد اس بات پر تل گئی تھی کہ برطانیہ کو ایسا سبق سکھایا جائے اور ایسی چوٹ لگائی جائے کہ وہ لندن میں شام کا سفارتی مشن بند کرنے پر مجبور ہوجائے کیونکہ موساد کی نظر میں یورپ کے اندر اسرائیل کے خلاف سازشوں اور دہشت گردانہ منصوبہ بندی کا سب سے بڑا مرکز شامی سفارتخانہ ہی تھا۔ موساد کی تیار کردہ اس سازش کا مرکزی کردار ابو تھا جو نظار ہنداوی کا کزن تھا۔ اس رات توف لیوی کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد ابو اپنے کزن ہنداوی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تاکہ گزشتہ روز کے اپنے سخت رویے اور این میری بارے خیالات پر معذرت کرے۔ یقیناً وہ ہنداوی کی مدد کرسکتا تھا لیکن پہلے اسے چند سوالوں کے جواب چاہئیں تھے۔ کیا وہ بچہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی؟ کیا وہ اب بھی شادی پر اصرار کررہی تھی؟ کیا ہنداوی کو واقعی لڑکی سے محبت تھی؟ وہ دونوں دو مختلف تہذیبوں کے نمائندے تھے اور ایسی شادیاں شاذونادر ہی کامیاب ہوتی تھیں۔

ہنداوی نے جواب دیا کہ اگر اسے این میری سے پیار تھا بھی تو اب نہیں ہے۔ اب وہ جھگڑالو اور ہروقت رونے دھونے کی عادی بن گئی ہے اور ہروقت یہی پوچھتی رہتی ہے کہ اب کیا ہوگا؟ وہ ہوٹل کی چادریں بدلنے اور ٹائلٹ صاف کرنے والی سے شادی نہیں کر

سکتا۔

ابو نے اپنے کزن کو 10 ہزار ڈالر دیے اور مشورہ دیا کہ این میری سے نجات حاصل کرے اور لندن میں مجرد زندگی گزارے۔ یہ کافی بڑی رقم تھی اور یہ رقم موساد نے مہیا کی تھی۔ اس رقم کے بدلے میں ہنداوی نے بھی کچھ خدمت انجام دینی تھی اور دونوں کا مشترکہ مطمع نظر اسرائیلی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔

12 اپریل 1986ء کو ہنداوی این میری سے ملنے اس کے گھر لندن کے کلبرن (Kilburn) علاقے میں گیا۔ وہ رقم بھی لے گیا تھا جو ابو نے اسے دی تھی۔ وہ پھول اور شمپین کی بوتل بھی لے کر گیا۔ اس نے این میری کو بتایا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے اور بے بی کو رکھنا چاہتا ہے۔ اس خبر سے لڑکی کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔ اچانک اسے اپنی دنیا روشن نظر آنے لگی۔

ہنداوی نے اسے بتایا کہ راستے کی ایک آخری رکاوٹ صاف کرنی ہے۔ این اس سے شادی کرنے کے لئے اس کے والدین کی رضامندی حاصل کرے۔ یہ عربوں کی ایسی روایت تھی جس کی خلاف ورزی کی کوئی عرب نوجوان جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جہاز کے ذریعے اسرائیل میں واقع اس کے عربی گاؤں میں جائے جہاں اس کے والدین رہائش پذیر ہیں۔ اس نے ان کی بود و باش کا ایسا نقشہ کھینچا کہ مسیح کی آمد کے بعد سے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ایک ایسی لڑکی جس کی پرورش ننوں (Nuns) کی نگرانی میں ہوئی ہو اور جو چرچ کی عبادت کو لازمی جانتی ہو، اس کے لئے زندگی کا یہ تصور اس بات کا ثبوت تھا کہ اپنے عاشق، ایک سچے مذہبی انسان سے شادی کرنے جارہی ہے۔ اس نے این میری کو بتایا کہ ہوسکتا ہے اس کے خاندان کے لوگ عیسائی نہ ہوں لیکن ان کا تعلق اسی دھرتی سے ہے جو اس کے لارڈ (مسیح) کی ہے۔ اس سے این کو وہ لوگ خدا ترس معلوم ہونے والے لگے۔ تاہم این میری ہچکچا رہی تھی۔ وہ بلاوجہ اپنی نوکری نہیں چھوڑ سکتی تھی اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور سفرخرچ کے لئے رقم کہاں سے حاصل کرے گی؟ اور ایسی اہم ملاقات کے لئے اسے نئے کپڑوں کی بھی ضرورت تھی۔ ہنداوی نے اس کے خیالات پڑھ لئے اور اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے آگے رکھ دی کہ یہ نئے کپڑوں کے لئے کافی بڑی رقم ہے۔

دوسری جیب سے ہنداوی نے اسرائیلی ائرلائن ایل آل کا 17 اپریل کی فلائٹ کا ٹکٹ نکال کر اس کی گود میں پھینک دیا جس میں اب صرف 5 دن باقی تھے۔ یہ ٹکٹ اس نے اسی شام کو خریدا تھا۔

این میری ہنسنے لگی۔ ”کیا تمہیں یقین تھا کہ میں جاؤں گی؟“

”مجھے اتنا ہی یقین تھا جتنا مجھے تم سے اپنے پیار کا یقین ہے“۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ جیسے ہی وہ واپس آئے گی، دونوں شادی کرلیں گے۔ اگلے چند دن این میری کے ہواؤں میں اڑتے ہوئے گزر گئے۔ اس نے نوکری چھوڑ دی۔ آئرش ایمبیسی جاکر اپنا نیا پاسپورٹ بنوایا۔ اس نے اپنے لئے حاملہ عورتوں کے پہننے والے کپڑے خریدے۔ ہر رات وہ ہنداوی سے پیار بھری باتیں کرتی رہتی۔ ہر صبح پرتکلف ناشتے پر وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ وہ آئرلینڈ میں رہائش اختیار کریں گے۔ سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹیا میں ان کے ہاں اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام شان (Sean) ہوگا، لڑکی ہونے کی صورت میں سینیڈ (Sinead)۔

اری بن مناشے، جس نے بعدازیں دعویٰ کیا کہ اسے اس سازش بارے ساری تفصیل معلوم تھی، کا اصرار تھا کہ ”ہنداوی کو ڈر تھا بہت زیادہ دستی سامان کی وجہ این میری کو روک لیا جائے گا، اس لئے اس نے اپنے دوست

کے ذریعے یہ انتظام کیا تھا کہ بیگ اس وقت این میری کے حوالے کیا جائے جب وہ ایل آل کے ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہو"۔

این میری کی فاش غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے عاشق سے یہ سوال نہیں کیا کہ تحفہ کس نوعیت کا ہے کیونکہ وہ سر سے پاؤں تک ہنداوی کے عشق میں سرشار تھی اور اس پر مکمل بھروسہ کرتی تھی۔ وہ سازش کی تیزی سے تکمیل کا ایک مکمل کردار بن چکی تھی۔

ٹیکسی میں ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے ہنداوی اس کے ہونے والے بچے کے شفیق باپ کا روپ دھارے ہوئے تھا اور مشورے دے رہا تھا کہ کبھی فلائٹ کے دوران وہ سانس لینے کی مشق کرتی رہے، جوس وافر مقدار میں پیئے اور درمیانی راستے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تاکہ اُسے چکر آنے اور جھٹکے لگنے کی شکایت شروع ہو چکی تھی، اس سے بچی رہے۔ این میری نے ہنستے ہوئے بولنے سے خاموش کرایا تھا۔ "خدا پر بھروسہ رکھو۔ کیا تم سمجھتے ہو میں چاند کی طرف اڑان بھرنے جا رہی ہوں؟"

وہ کچھ دیر ڈیپارچر لاؤنج کے گیٹ پر کھڑی رہی، وہ اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ تل ابیب پہنچ کر اسے فون کرے گی اور بتائے گی کہ وہ اس کے والدین سے اسی طرح پیار کرتی ہے جیسے اپنے والدین سے۔ ہنداوی نے اس کا آخری بار بوسہ لیا اور اسے دھکیل کر مسافروں کی اس قطار میں کھڑا کر دیا جو امیگریشن کاؤنٹر کے آگے بن چکی تھی۔

ہنداوی اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ این میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ پھر وہ ابو کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے، لندن واپسی کے لئے سیرین عرب ائرلائن (Syrain Arab Air Lines) کی بس میں سوار ہو گیا۔ اس دوران این میری آرام سے پاسپورٹ کنٹرول اور برطانوی سکیورٹی چیکنگ ایریا سے گزر کر اسرائیلی ائرلائن ایل آل کے لئے مخصوص ہائی سکیورٹی ایریا میں پہنچ گئی۔ شن بیت (Shin Bet) کے تربیت یافتہ سکیورٹی اہلکاروں نے محتاط انداز سے اس سے سوال جواب کئے اور اس کا دستی سامان چیک کیا۔ اطمینان کے بعد اسے جہاز کی سیٹ کا نمبر الاٹ کر دیا گیا اور آخری ڈیپارچر لاؤنج سے گزار کر جہاز میں سوار ہونے والے دیگر 355 مسافروں میں اسے بھی بٹھا دیا گیا۔

اری بن مناشے (Ari Ben-Menashe) کے بیان کے مطابق وہاں پر بلیو اوور آل (وردی) میں ایک صفائی کرنے والے آدمی نے این میری کو ہنداوی کے والدین کے لئے تحفے والا بیگ دیا۔ یہ آدمی جس پُراسرار طریقے سے سامنے آیا تھا اسی طریقے سے غائب ہو گیا۔ بن مناشے نے بعد ازاں لکھا۔ "چند سیکنڈ کے اندر ہی این میری کو دوبارہ چیکنگ کے لئے کہا گیا۔ ایل آل سکیورٹی والوں نے بیگ کے نچلے حصے میں جعلی طور پر بنائے گئے خانوں سے پلاسٹک کا دھماکہ خیز مادہ برآمد کر لیا"۔

سیمٹیکس (Semtex) نامی دھماکہ خیز مادے کی مقدار تین پونڈ سے زائد تھی۔ این میری نے روتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی کہانی تفتیشی سپیشل برانچ کے اہلکاروں اور ایم آئی 5 کے افسروں کو سنائی۔ یہ ایک ایسی عورت کی ایسی داستان تھی جس نے نہ صرف محبت میں دھوکا کھایا بلکہ اس کے عاشق نے اسے مزید مصیبت میں پھنسا دیا۔ تفتیشی افسروں نے اب اپنی توجہ ہنداوی کے شام سے رابطے معلوم کرنے پر لگا دی کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی بے گناہ ہے، اس کی سادہ لوحی کی وجہ سے شکار بنایا گیا تھا۔

جیسے ہی سیرین عرب ائرلائن کی بس لندن شہر میں

داخل ہوئی۔ ہنداوی نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ بس کا رخ شامی سفارتخانے کی طرف موڑ دے۔ جب ڈرائیور نے اس پر احتجاج کیا تو ہنداوی نے اسے بتایا کہ اس کے پاس ایسا کرنے کی اتھارٹی ہے۔ ایمبیسی پہنچ کر اس نے قونصلیٹ کے افسروں سے کہا کہ اسے سیاسی پناہ دیں کیونکہ برٹش پولیس نے اسے گرفتار کرنے والی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے اسرائیلی ائرلائن ایل آل کو دھماکہ خیز مادے سے اڑانے کی کوشش کی ہے۔ حیران و پریشان ایمبیسی افسروں نے ہنداوی کو سفارت خانے کے دو سکیورٹی اہلکاروں کے حوالے کر دیا۔ اس سے سوال و جواب کے بعد انہوں نے اسے کہا کہ سفارتخانے کے اندر ہی سٹاف کے ایک اپارٹمنٹ میں ٹھہرا رہے۔ ان کو یقیناً شک ہو گیا تھا کہ یہ شام کو کسی سازش میں ملوث کرنے کی منصوبہ بندی ہو سکتی تھی۔ یہ شبہات اور بھی گہرے ہو گئے جب ہنداوی کچھ ہی دیر بعد سفارتخانے کے اپارٹمنٹ سے چلا گیا۔

ہنداوی اپنے کزن ابو کی تلاش میں نکلا تھا۔ جب وہ نہ ملا تو اس نے نوٹنگ ہل (Notting Hill) ایریا کے لندن وزیٹر ہوٹل (London Visitor's Hotel) میں کمرہ بک کر لیا۔ جہاں کچھ ہی دیر بعد اسے گرفتار کر لیا گیا۔

بی بی سی نے خبر نشر کی کہ کس طرح پولیس نے اس سازش کو ناکام بنایا۔ تفصیلات غیر معمولی طور پر درست اور صحیح تھیں۔ زک میڈ سیمٹکس این میری کے لئے بنائے گئے بیگ کے جعلی خانوں میں چھپایا گیا تھا اور اسے 39 ہزار فٹ بلندی پر پھٹنا تھا۔

بن میناشے کے مطابق یہ سازش موساد کی توقع کے مطابق تکمیل کو پہنچی۔ مارگریٹ تھیچر (برطانوی وزیراعظم) نے شامی سفارتخانہ بند کرا دیا۔ ہنداوی کو 45 سال کی قید کی سزا ہوئی۔ این میری اپنے گھر آئرلینڈ چلی گئی، جہاں اس نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ ابو واپس اسرائیل چلا گیا۔ اس کا اس سازش میں کردار ختم ہو گیا تھا۔

ہنداوی کے مقدمے کے اختتام پر رابرٹ میکسویل نے اپنے اخبار مرر میں سرخی جمائی۔

''حرامی کو وہ پھل مل گیا جس کا وہ مستحق تھا''۔

اس کے اخبار کا ایڈیٹوریل چنگھاڑ رہا تھا ''موت کا سفیر''۔ جس روز ان کی ملک بدری کا حکم سننے شامی سفیر ہینسٹ جیمز کی عدالت میں پہنچا تو اخبار کی چیخ چنگھاڑتی ہیڈ لائن تھی۔ ''دفع ہو جاؤ تم شامی سورو!'' بن میناشے کے مطابق موساد نے ایسی شاندار سازش تیار کی تھی کہ شام سفارتی تنہائی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

لیکن ان جذباتی اظہار کامیابی و خوشی کے کچھ اہم سوال بھی تھے جن کا جواب دیا جانا ضروری تھا۔ کیا این میری مرفی کو واقعی زندہ بم دیا گیا تھا یہ محض دھوکہ دہی سے تیار کردہ ایک سکیم تھی؟ ہیلو اوور آل میں جس آدمی نے این میری کو ڈیپارچر لاؤنج میں بیگ پہنچایا تھا، جو فرضی طور پر ہنداوی کا دوست تھا، کیا وہ کوئی سکیورٹی ایجنسی کا افسر تھا؟ سکیورٹی ایجنسی ایم آئی 5 کو اس سازش کا پہلے سے کتنا پتہ تھا؟ اور کیا یہ بات موساد اور برطانوی سرد مہر کے ناقابل فہم نہ تھی کہ سیمٹکس بم جہاز تک لے جاتے ہوئے زمین پر بھی پھٹ سکتا تھا؟ ایسے دھماکے کی صورت میں تو اس مصروف ترین ائرپورٹ پر جبکہ وہاں ہزاروں لوگ موجود تھے، ایک قیامت بپا ہو سکتی تھی۔ کیا حقیقت یہ نہیں کہ موساد نے سیمٹکس سے ملتا جلتا ایک مصنوعی مادہ استعمال کر کے شام کے سفارتی مشن کا خاتمہ کرا دیا جس سے نہ تو ایل آل کو کوئی خطرہ تھا اور نہ ہی ہیتھرو (Heathrow) ائرپورٹ کو۔ کیونکہ استعمال کیا گیا مادہ بالکل بے ضرر تھا۔ ان سب سوالوں کا وزیراعظم اسرائیل شمعون پیریز کے پاس صرف اتنا جواب تھا۔ ''جو کچھ بھی ہوا اس کا ان لوگوں کو پتہ تھا، جن کو پتہ ہونا

چاہئے تھا اور جن کو کچھ پتہ نہیں انہیں پتہ نہیں ہونا چاہئے"۔

برطانیہ کی وائٹ مور کے علاقے میں واقع ہائی سکیورٹی جیل میں قید ہنداوی اب تک اس پر سراپا احتجاج ہے کہ اسے موساد کی سازش کا شکار بنایا گیا ہے۔ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں اور وہ اب پہلے جیسا دبلا پتلا بھی نہیں رہا، کا خیال ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ جیل میں ہی ہوگا۔ وہ این میری کو نام کی بجائے "وہ عورت" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ سال 1988ء میں ڈبلن میں رہائش پذیر تھی اور دونوں کی بیٹی کی پرورش و نگہداشت کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی اپنی ماں کی شکر گزار ہے اور کبھی ہنداوی کا نام بھی نہیں لیتی۔

اس کہانی کا ایک ضمیمہ بھی ہے۔ ہنداوی کو جیل میں ڈالے جانے کے دو ہفتے بعد وہ سزا کہ وہ اکیسویں صدی کا سورج بھی جیل میں ہی دیکھے گا۔ "واشنگٹن ٹائمز" کے انتہائی قابل احترام ایڈیٹر آرنوڈ ڈی بورخریف نے اپنا ٹیپ (ریکارڈ) پیرس میں فرانس کے وزیراعظم جیکس شیراک کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ڈی بورخریف یورپین کیمونٹی فارن منسٹرز کانفرنس کی رپورٹنگ کے لئے یورپ آیا ہوا تھا۔ کانفرنس لندن میں ہو رہی تھی اور شیراک سے انٹرویو کا مقصد فرانس کا نقطہ نظر معلوم کرنا تھا۔ انٹرویو خوشگوار ماحول میں آگے بڑھ رہا تھا کہ شیراک نے واضح کیا کہ ایسے ظاہر کیا جا رہا ہے جیسے فرانس اور جرمنی نے برطانوی حکومت کی وفاداری کا عہد کیا ہوا ہو، اس کا منفی اثر کامن مارکیٹ کی پالیسیوں پر پڑ رہا ہے۔ ڈی بورخریف نے فرانس کے ایک اور حلقے میں تعلقات کا سوال اٹھا دیا۔ ایڈیٹر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شیراک کے شام کے ساتھ مذاکرات، پیرس میں بم دھماکوں کے خاتمے کے سلسلے میں کس سٹیج پر پہنچے ہیں اور حزب اللہ کی طرف سے لبنان میں یرغمال بنائے گئے آٹھ غیر ملکیوں کی رہائی کے لئے فرانس کی کوششیں کہاں تک پہنچی ہیں؟ وزیراعظم نے جواب دینے میں توقف کیا اور اپنی میز پر پڑے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے کہا کہ "جرمن چانسلر ہیلمٹ کوہل اور وزیر خارجہ ہانس ڈائٹرخ گینشر (Hlans Dletrich Genscher) دونوں نے اسے بتایا ہے کہ ہنداوی کیس میں شامی حکومت ملوث نہ تھی۔ ہنداوی کی طرف سے ایل آل جہاز کو بم کو اڑانے کی سازش اسرائیلی سیکرٹ سروس، موساد کے زرخیز دماغ کی اختراع تھی"۔

اس خبر کے نشر ہوتے ہی سفارتی حلقوں میں بھونچال آ گیا جس نے تقریباً شیراک کے سیاسی کردار کو خاتمے کے خطرے تک پہنچا دیا۔ اس نے چاروں طرف سے اپنے آپ کو حملہ آوروں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک طرف اس کا اپنا صدر فرانکوئز مترانڈ (Franchois Mitterand) اس کی گوشمالی کر رہا تھا تو دوسری طرف ہیلمٹ کوہل کی تند و تیز اور غصیلی ٹیلیفون کالیں اسے حواس باختہ کئے ہوئے تھیں، جو شیراک سے اپنے بیان کی تردید کا مطالبہ کر رہا تھا۔ شیراک نے وہی کیا جو اکثر سیاستدان کرتے ہیں یعنی "اس کا بیان سیاق و سباق سے الگ کر کے نشر اور شائع کیا گیا ہے"۔ لندن میں سکاٹ لینڈ یارڈ نے کہا کہ تمام معاملہ کا جائزہ عدالتی طریق کار کے مطابق لیا جا چکا ہے۔ لہٰذا مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ پیرس میں 1997ء میں جبکہ جیکس شیراک خود فرانس کا صدر بن چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے انٹرویو کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں، جو "واشنگٹن ٹائمز" میں شائع ہوا تھا۔

جلد ہی ایک اور سازش سامنے آ گئی جس نے موساد کے دامن کو مزید داغدار کر دیا اور اس کی شہرت کو گہنا دیا۔